BAUL(N) - 221

بی.اے.اُردو

سمسٹر چہارم

BACHELOR OF ARTS (URDU)

FOURTH SEMESTER

MINOR

انشائیہ اور طنز و مزاح

INSHAIYA AUR TANZ O MIZAH

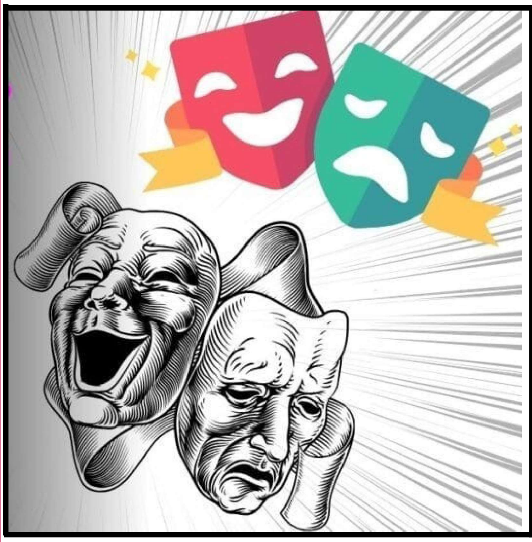

اُتراکھنڈ اوپن یونی ورسٹی، ہلدوانی (نینی تال)

SCHOOL OF HUMANITIES

UTTARAKHAND OPEN UNIVERSITY

HALDWANI (NAINITAL) - 263139

بی.اے.اُردو

BACHELOR OF ARTS (URDU)

سالِ دوم

SECOND YEAR

سمسٹر چہارم

FOURTH SEMESTER

بی.اے. یو.ایل.(این.) – ۲۲۱ – انشائیہ اور طنز و مزاح

BAUL(N) - 221, INSHAIYA AUR TANZ O MIZAH

MINOR VOC

اُترا کھنڈ اوپن یونی ورسٹی، ہلدوانی (نینی تال)

SCHOOL OF HUMANITIES

UTTARAKHAND OPEN UNIVERSITY

HALDWANI (NAINITAL) - 263139

سرپرستِ اعلیٰ:
پروفیسراو. پی. ایس. نیگی، وائس چانسلر، اُترا کھنڈ اوپن یونی ورسٹی، ہلدوانی۔
کمیٹی بورڈ آف اِسٹڈیز:
پروفیسر رینو پرکاش، ڈائریکٹر اسکول آف ہیومنٹیز، اُترا کھنڈ اوپن یونی ورسٹی (UOU)، ہلدوانی۔
پروفیسر توقیر احمد خاں، ریٹائرڈ پروفیسر شعبۂ اردو، دہلی یونی ورسٹی، دہلی۔
پروفیسر سید محمد ارشد رضوی، گورنمنٹ رضا پی. جی. کالج، رام پور، اُتر پردیش۔
ڈاکٹر شہپر شریف، اسسٹنٹ پروفیسر شعبۂ اردو، اُترا کھنڈ اوپن یونی ورسٹی، ہلدوانی۔
محمد افضل حسین، اسسٹنٹ پروفیسر و کورس کوآرڈِنیٹر شعبۂ اُردو، اُترا کھنڈ اوپن یونی ورسٹی، ہلدوانی۔
رجسٹرار:
شری کھیم راج بھٹ، اُترا کھنڈ اوپن یونی ورسٹی، ہلدوانی۔
کورس کوآرڈِنیٹر و ایڈیٹر:
محمد افضل حسین (اُستاد بریلوی)، اسسٹنٹ پروفیسر شعبۂ اردو، اُترا کھنڈ اوپن یونی ورسٹی، ہلدوانی۔

© جملہ حقوق بحقِ ناشر محفوظ ہیں
اس کتاب کا کوئی بھی حصّہ کسی بھی شکل میں یونی ورسٹی کی تحریری اجازت کے بغیر شائع نہ کیا جائے۔ یہ کتاب ''اُترا کھنڈ اوپن یونی ورسٹی، ہلدوانی'' کے بی. اے. اُردو سالِ دوم، سمسٹر چہارم، انشائیہ اور طنز و مزاح کے نصاب کا جزو ہے۔ مزید معلومات کے لئے یونی ورسٹی حکام یا صدرِ شعبۂ اُردو سے یونیورسٹی کے حسبِ ذیل پتے یا ای-میل پر رابطہ قائم کیا جا سکتا ہے۔
ای-میل: ahusain@uou.ac.in (محمد افضل حسین)، sshareef@uou.ac.in (ڈاکٹر شہپر شریف)

DEPARTMENT OF URDU

UTTARAKHAND OPEN UNIVERSITY

UNIVERSITY ROAD, BEHIND TRANSPORT NAGAR (TEENPANI BYPASS)

HALDWANI - 263139 (NAINITAL) Phone : 05946 - 261122

BAUL(N) – 221 - INSHAIYA AUR TANZ O MIZAH

Board of Studies

Prof. Om Prakash Singh Negi
Vice Chancellor,
Uttarkhand Open University, Haldwani

Prof. Renu Prakash
Director, School of Humanities,
Uttarkhand Open University, Haldwani

Prof. Tauqeer Ahmad Khan
Rtd. Professor, Department of Urdu
University of Delhi, New Delhi

Prof. Syed Mohammad Arshad Rizvi
Department of Urdu,
Govt. Raza Post Graduate College, Rampur

Mohammad Afzal Husain
Head, Department of Urdu
Uttarkhand Open University, Haldwani

Dr. Shahpar Shareef
Assistant Professor, Department of Urdu
Uttarkhand Open University, Haldwani

Registrar

Shri Khemraj Bhatt
Uttarkhand Open University,
Teen Pani By-pass Road, Haldwani - 263139

Programme Coordinator

Mohammad Afzal Husain
Head, Department of Urdu
Uttarkhand Open University, Haldwani

Cover Page Design and Format Editing

Dr. Shahpar Shareef
Assistant Professor, Department of Urdu
Uttarkhand Open University, Haldwani

Unit Writers	Unit No.	Unit Writers	Unit No.
Prof. Khalid Mahmood	**UNIT – 01**	**Dr. Shahpar Shareef**	**UNIT - 07**
Mohammad Afzal Husain	**UNIT - 02**	**Dr. Masarrat Jahan**	**UNIT - 08**
Dr. Aminah Tahseen	**UNIT - 03**	**Dr. Shahpar Shareef**	**UNIT - 09**
Dr. Anwar Pasha	**UNIT - 04**	**Ghulam Jilani**	**UNIT – 10**
Shane Ali	**UNIT – 05**	**Dr. Mohammad Tahir**	**UNIT - 11**
Mohammad Salim	**UNIT – 06**	**Dr. Shareef Ahmad Quraishi**	**UNIT - 12**

Editors

Mohammad Afzal Husain, Head, Department of Urdu, Uttarkhand Open University, Haldwani
Dr. Shahpar Shareef, Assistant Professor, Department of Urdu, Uttarkhand Open University, Haldwani
Ghulam Jilani, Assistant Professor, Department of Urdu, Uttarkhand Open University, Haldwani
Mohammad Salim, Assistant Professor, Department of Urdu, Uttarkhand Open University, Haldwani
Shane Ali, Assistant Professor, Department of Urdu, Uttarkhand Open University, Haldwani

پیش لفظ

اُتراکھنڈ اوپن یونی ورسٹی کا قیام اُتراکھنڈ قانون ساز اسمبلی کے ایک ایکٹ کے تحت ۳۱؍اکتوبر ۲۰۰۵ء کو عمل میں آیا جس کا مقصد فاصلاتی نظامِ تعلیم کے ذریعے آبادی کے بڑے حصے کے ایسے اَفراد کی تعلیمی ضرورتوں کی تکمیل ہے جو کسی مصروفیت یا مجبوری کے سبب کالجوں یا یونی وَرسٹیوں تک نہیں پہنچ پاتے ہیں۔ یونی ورسٹی کے تعلیمی پروگرام ''بیچلر آف آرٹ'' کے تحت ''بی.اے. اردو'' کو شامل کیا گیا ہے۔ یہ کتاب بی.اے. اردو سالِ دوم، سمسٹر چہارم، انشائیہ اور طنز و مزاح کے نصاب کا جز و ہے۔ یہ کتاب ۱۲؍اکائیوں پر مشتمل ہے جو الگ الگ موضوعات پر مختلف اسباق کی شکل میں ہیں۔

عزیز طلبا و طالبات!

فاصلاتی نظامِ تعلیم کی کتابوں کو {خود تدریسی مواد {SLM}(Self Learning Material) کہا جاتا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کو یہ مواد خود ہی پڑھنا ہے۔ روایتی درس گاہوں کے برخلاف اِسے پڑھانے کے لئے آپ کے سامنے استاد موجود نہیں ہوگا۔ اِس صورتِ حال کے تحت اسباق کو اِس طرح تیار کیا گیا ہے کہ آپ کو کلاس میں اپنی اور استاد کی موجودگی کا احساس ہو سکے۔ اِسی لئے ہر اکائی کا آغاز ''اغراض و مقاصد'' سے کیا گیا ہے تا کہ آپ کو اِس بات کا اندازہ ہو سکے کہ اکائی کو پڑھنے کا مقصد کیا ہے؟ اُس کے بعد ''تمہید'' دی گئی ہے جس میں سبق کو مختصر انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ اکائی کے درمیان ''اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے'' کے تحت کچھ سوالات بھی دِیے گئے ہیں تا کہ آپ نے جو کچھ پڑھا ہے، اُسے کس حد تک ذہن نشین کیا ہے؟ اِس بات کا بھی اندازہ لگایا جا سکے۔ کتاب کے آخر میں اُن سوالات کے جوابات بھی دِیے گئے ہیں لیکن آپ کو چاہیے کہ پہلے خود اُن سوالات کو حل کریں پھر آخر میں دِیے گئے جوابات سے اپنے جوابات ملالیں تا کہ آپ کو اپنی صلاحیت کا اندازہ بھی ہو اور آپ کی ذہنی ورزش بھی ہو جائے۔ امتحان میں آپ سے جس طرح کے سوالات پوچھے جائیں گے اُس کے نمونے بھی دِیے گئے ہیں۔ ساتھ ہی ہر اکائی کے آخر میں مشکل الفاظ کی ''فرہنگ'' اور ''حوالہ جاتی کتب'' کی فہرست بھی دی گئی ہے تا کہ آپ اُن کتابوں کے مطالعے سے اپنی معلومات میں مزید اضافہ کر سکیں۔

ہم آپ کی کام یابی کے لئے دعائیں اور نیک خواہشات پیش کرتے ہیں۔

ایڈیٹر

بی.اے.اُردو

(B.A.URDU)

سالِ دوم

SECOND YEAR

سمسٹر چہارم

FOURTH SEMESTER

بی.اے.یو.ایل.(این.) - ۲۲۱ - انشائیہ اور طنز و مزاح

BAUL(N) - 221, INSHAIYA AUR TANZ O MIZAH

اکائی نمبر	مضمون	مضمون نگار	
بلاک نمبر 01:			**5**
اِکائی 1	انشائیہ کی تعریف، آغاز و اِرتقا	پروفیسر خالد محمود	6
اِکائی 2	انشائیہ کی بنیادی خصوصیات	محمد افضل حُسین	14
اِکائی 3	سچ اور جھوٹ کا رزم نامہ : محمد حسین آزاد	ڈاکٹر آمنہ تحسین	20
اِکائی 4	دیہات کی زندگی : عبدالحلیم شرر	ڈاکٹر انور پاشا	30
اِکائی 5	مچھر : خواجہ حسن نظامی	شانِ علی	40
اِکائی 6	چڑیا چڑے کی کہانی : ابوالکلام آزاد	محمد سالم	52
بلاک نمبر 02:			**67**
اِکائی 7	طنز و مزاح اور اس کی اقسام	ڈاکٹر شہپر شریف	68
اِکائی 8	اُردو نثر میں طنز و مزاح کی روایت	ڈاکٹر مسرّت جہاں	92
اِکائی 9	طنز و مزاح کی سماجی اہمیت	ڈاکٹر شہپر شریف	103
اِکائی 10	اکبرالہ آبادی کی طنزیہ و مزاحیہ شاعری	غلام جیلانی	135
اِکائی 11	شیخ پیرو : رشید احمد صدیقی	ڈاکٹر محمد طاہر	150
اِکائی 12	یادش بخیریا : مشتاق احمد یوسفی	ڈاکٹر شریف احمد قریشی	161

✵

بلاک نمبر 01

اکائی	01	انشائیہ کی تعریف، آغاز و اِرتقا	پروفیسر خالد محمود
اکائی	02	انشائیہ کی بنیادی خصوصیات	محمد افضل حُسین
اکائی	03	سچ اور جھوٹ کا رزم نامہ : محمد حسین آزاد	ڈاکٹر آمنہ تحسین
اکائی	04	دیہات کی زندگی : عبدالحلیم شرر	ڈاکٹر انور پاشا
اکائی	05	مچھر : خواجہ حسن نظامی	شانِ علی
اکائی	06	چڑیا چڑے کی کہانی : ابوالکلام آزاد	محمد سالم

اکائی 01 انشائیہ کی تعریف، آغاز و اِرتقا

ساخت

01.01 : اغراض ومقاصد
01.02 : تمہید
01.03 : انشائیہ کی تعریف
01.04 : انشائیہ کا آغاز وارتقا
01.05 : انشائیہ کا موضوع
01.06 : انشائیہ کا اسلوب یا طرزِ بیان
01.07 : انشائیہ اوردوسری نثری اصناف
01.08 : خلاصہ
01.09 : فرہنگ
01.10 : نمونہ امتحانی سوالات
01.11 : حوالہ جاتی کتب
01.12 : اپنے مطالعے کی جانچ کے جوابات

01.01 اغراض ومقاصد

اس اکائی میں آپ انشائیہ کے بارے میں مفصّل معلومات حاصل کریں گے۔اس کے تحت انشائیے کی تعریف،تاریخ،موضوع اوراُسلوب کا تعارف کراتے ہوئے اس کی دیگر خصوصیات مثلاً شگفتگی،لطافت،مسرت،رفعت،بصیرت،طنز،مزاح،عدم تکمیلیت،ظاہری بے ربطی،دل چسپی اورغیر روایتی طریقِ کار پر روشنی ڈالی جائے گی اوراردو میں انشائیہ نگاری پر اظہار رائے کرتے ہوئے اردو کے نمائندہ انشائیہ نگاروں کا ذکر بھی کیا جائے گا۔اس اکائی کے مطالعے سے آپ انشائیہ کی بنیادی خصوصیات سے نہ صرف واقف ہو جائیں گے بلکہ عمومی مطالعے میں انشائیہ کو پہچاننے میں آپ کوکوئی دشواری نہ ہوگی اوراس لطیف صنفِ ادب کے تئیں آپ کی دل چسپی میں اضافہ ہوگا۔

01.02 تمہید

انشائیہ اردوادب کی ایک لطیف،دل چسپ اورمقبول نثری صنف ہے۔اردوادب میں اس صنف یعنی انشائیے کی روایت بہت زیادہ قدیم نہیں ہے۔اس کا شماراردو کے جدید اصناف میں ہوتا ہے۔عہدِ سرسید میں تنقید،سوانح،تاریخ،ناول اورجدید نظم کے ساتھ ہی انشائیے کا آغاز ہوا۔سرسیداوران کے رُفقاء محسن الملک،وقارالملک،الطاف حسین حالؔی اورمحمد حسین آزادؔ کے مضامین (نیرنگِ خیال) میں اس صنف کے

ابتدائی نقوش دیکھے جا سکتے ہیں۔نظمِ جدید کی طرح اس صنف کی تشکیل و تکمیل میں انگریزی ادب کا بڑا ہاتھ ہے۔انگریزی میں اس صنف کو Essay کہا جاتا ہے،بعض ناقدین اسے Light Essay بھی کہتے ہیں۔

01.03 انشائیہ کی تعریف

انشائیہ اردو ایک آزاد صنف ہے یہ ایک ایسا بیانیہ ہے جس کا کوئی خاص موضوع یا خاص اُسلوب متعین نہیں ہے اس لئے اس کی تعریف اس طرح نہیں کی جا سکتی جس طرح ناول،افسانہ،ڈراما یا دیگر اصناف ادب کی تعریف کی جاتی ہے۔یہ صنف مقالہ،خاکہ،روداد، رپورتاژ،کالم،روزنامچہ جیسی نثری تحریروں سے بھی مختلف ہے۔اس کی تعریف میں مختلف ادیبوں اور نقادوں نے الگ الگ قسم کی باتیں کہیں ہیں۔بعض کے خیال میں یہ فلسفیانہ خیال آرائی ہے تو بعض کے نزدیک انشا پردازی کا طلسم۔کچھ لوگ اسے محض ذاتی تاثر پر محمول کرتے ہیں۔ اس کی تشکیل میں فکر انگیز خیال آفرینی،لطافت،شگفتگی اور تخلیقی اندازِ بیان کی کارفرمائی زیادہ ہوتی ہے۔اسے خیال کی رَو اور ذہنی ترنگ سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے۔انشائیہ اپنے آپ میں ایک نامکمّل اور دل چسپ تحریر ہے اور وہ اپنی انہیں منفرد و مخصوص خصوصیات سے پہچانا جاتا ہے۔یہی خصوصیات اس کی مقبولیت کا باعث ہیں۔

01.04 انشائیہ کا آغاز و ارتقا

اردو میں جدید نظم کی طرح انشائیے کی ابتدا بھی سرسید کے عہد میں انگریزی کے زیر اثر ہوئی۔یہ بھی ایک دل چسپ اتفاق ہے کہ نظمِ جدید اور انشائیے کی ابتدا کا زمانہ اور ان دونوں اصناف کا آغاز کرنے والے اہلِ قلم کم و بیش ایک ہی ہیں۔جس طرح جدید نظم کی ابتدا کا سہرا محمد حسین آزاؔد اور الطاف حسین حاؔلی کے سر ہے،اسی طرح انشائیے کے اوّلین نقوش بھی ان ہی مصنّفین کی تحریروں میں ملتے ہیں۔''نیرنگِ خیال''میں شامل محمد حسین آزاؔد کی تمثیلی مضامین اس کی عمدہ مثال ہے۔(تمثیل کو انگریزی میں Allegory کہا جاتا ہے۔)

محمد حسین آزاؔد کے بعد سادہ اُسلوب میں انشائیے لکھے گئے۔وقت کے ساتھ ساتھ اس صنف پر نکھار آتا گیا اور اس کی مقبولیت میں اضافہ ہوتا گیا۔سرسید احمد،الطاف حسین حاؔلی،مولوی ذکاء اللہ،مہدی افادی،مرزا فرحت اللہ بیگ،عبدالحلیم شرؔر،نیاز فتح پوری،سجاد حیدر یلدرم،خواجہ حسن نظامی،پطرس بخاری،ابوالکلام آزاؔد،رشید احمد صدیقی،فکر تونسوی،کنھیّا لال کپور،مشتاق احمد یوسفی،احمد جمال پاشا،نظیر احمد صدیقی اور وزیر آغا وغیرہ کا شمار اردو کے اہم انشائیہ نگاروں میں ہوتا ہے۔نیاز فتح پوری نے اپنے رسالے''نگار''اور وزیر آغا نے''اَوراق'' کے ذریعے انشائیے کے فروغ میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:۔

﴿۱﴾ انشائیہ کسے کہتے ہیں؟

﴿۲﴾ اُردو میں انشائیے کی ابتدا کب ہوئی؟

01.05 انشائیہ کا موضوع

انشائیہ کسی خاص موضوع کا پابند نہیں ہے۔دنیا کی ہر شئے اور زندگی کے ہر پہلو پر انشائیہ لکھا جا سکتا ہے۔اس کی انفرادیت یہ ہے کہ کسی سنجیدہ مقالے کی طرح اس کے دلائل میں منطقی ربط اور تسلسل نہیں ہوتا۔اس میں ایسی باتیں بھی کہہ دی جاتی ہیں جن کا اس موضوع سے بظاہر تعلق نہیں ہوتا جسے بنیاد بنا کر لکھا گیا ہے،اسی لئے بعض ادیبوں نے اس دل چسپ صنفِ ادب کو ایک ایسے کبوتر کی مانند قرار دیا ہے جسے

اپنی چھتری کی پہچان نہ ہو۔ انشائیہ نگار موضوع کے صرف انہیں پہلوؤں پر روشنی ڈالتا ہے۔ جن سے قاری کی مسرّت وبصیرت کے دَر کھل جائیں۔ یہ روشنی بھی واضح اور صاف نہیں ہوتی۔ اس میں دھوپ چھاؤں کی کیفیت ہوتی ہے۔ انشائیہ نگار کسی بھی چھوٹی سی بات کو موضوع بنا کر باتوں باتوں میں پتے کی بات کہہ جاتا ہے اور قاری کو لطف وانبساط غور وخوض پر بھی مائل کرتا ہے۔ وہ اگر چہ کوئی نتیجہ اخذ نہیں کرتا اور مشورہ بھی نہیں دیتا لیکن اس کی کوشش یہ ضرور ہوتی ہے کہ قاری اسے پڑھ کر دیر تک سوچتا اور محظوظ ہوتا رہے۔ یہی ایک اچھے انشائیہ کی پہچان ہے۔

01.06 انشائیہ کا اسلوب یا طرزِ بیان

انشائیہ شگفتہ موڈ کی پیداوار ہے اس لئے اس کے اُسلوبِ بیان میں فطری طور پر شگفتگی اور لطافت پائی جاتی ہے۔ اس میں فلسفیانہ موشگافیاں، منطقی استدلال، پند ونصائح، سنجیدہ مباحث یا خشک تعلیم وتبلیغ کے لئے کوئی جگہ نہیں ہوتی۔ انشائیہ جس طرح کسی ایک موضوع کا پابند نہیں اسی طرح کسی ایک اُسلوب کا بھی پابند نہیں ہوتا۔ اس کا ڈھانچہ ڈھیلا ڈھالا اور لچک دار ہوتا ہے۔ جسے انشائیہ نگار اپنے مزاج، موڈ اور موضوع کے مناسبت سے اختیار کرتا ہے۔ یا یوں کہا جا سکتا ہے کہ اُسلوب خود اپنے آپ کو انشائیہ نگار کے مزاج وموضوع کے موڈ میں ڈھال لیتا ہے۔ انشائیے کے اُسلوب یا اندازِ بیان میں بے ساختگی ہوتی ہے۔ انشائیہ میں بات میں بات پیدا کرنے اور موضوع کے مختلف پہلوؤں کو نئے نئے زاویوں سے دیکھنے کی کوشش تازگی کے احساس کو زائل نہیں ہونے دیتی۔ اس عمل کے نتائج قاری کے لئے نہایت دل چسپ اور پُر لطف ہوتے ہیں۔ انشائیہ اپنی انہیں اُسلوبی خصوصیات کی وجہ سے انوکھے پن کا اِحساس دلاتا ہے۔ اُسلوب کی چند مثالیں ملاحظہ کیجیے۔ اس کا لطف بھی لیجیے اور اس کے طرزِ تحریر کی خصوصیات، امتیازات اور فرق کو محسوس کیجیے۔

﴿۱﴾ **محمد حسین آزاد** :

''ایک شخص سوکھا، سہما، دُبلاپے کے مارے فقط ہوا کی حالت ہو رہا تھا۔ انبوہ میں نہایت چالاکی اور پھرتی سے پھر رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک آئینہ تھا، جس میں دیکھنے سے شکل نہایت بری معلوم ہونے لگتی تھی۔ وہ ایک ڈھیلی ڈھالی پوشاک پہنے تھا جس کا دامن دامن قیامت سے بندھا ہوا تھا۔ اس پر دیوزادوں اور جنّات کی تصویریں زَردوزی سے کڑھی ہوئی تھیں۔ جب وہ ہوا سے لہراتی تھیں تو ہزاروں عجیب وغریب صورتیں اس پر نظر آتی تھیں۔ اس کی آنکھ وحشیانہ تھی مگر نگاہ میں افسردگی تھی اور نام اس کا وہم تھا۔''

(''انسان کسی حال میں خوش نہیں رہتا'')

﴿۲﴾ **پطرس بخاری** :

''پیدل......! تم پیدل چلنے کی معنی نہیں جانتے۔ پیدل کے معنی ہیں سینۂ زمین پر اس طرح حرکت کرنا کہ دونوں پاؤں میں سے ایک پاؤں ضرور زمین پر رہے، یعنی تمام عمر میرے حرکت کرنے کا یہی طریقہ رہا ہے کہ ایک پاؤں زمین پر رکھتا ہوں دوسرا اُٹھاتا ہوں، ایک آگے ایک پیچھے۔ خدا کی قسم اس طرح کی زندگی سے دماغ سوچنے کے قابل نہیں رہتا حواس بے کار ہو جاتے ہیں، تخیل مرجاتا ہے۔''

(''مرحوم کی یاد میں'')

﴿۳﴾ ابوالکلام آزاد :

''اب گیارہ بج رہے تھے میں کھانے کے لئے چلا گیا۔تھوڑی دیر کے بعد واپس آیا تو کمرے میں قدم رکھتے ہی ٹھٹھک کے رہ گیا۔کیا دیکھتا ہوں کہ سارا کمرہ پھر حریفوں کے قبضے میں ہے اور اس اطمینان وفراغت سے اپنے کاموں میں جیسے کوئی حادثہ پیش آیا ہی نہیں۔سب سے بڑھ کر یہ کہ جس ہتھیار کی ہیبت پر اس درجہ بھروسہ کیا گیا تھا وہی حریفوں کی کا مجوئیوں کا ایک نیا آلہ ثابت ہوا۔بانس کا سرا جو گھونسلے سے بالکل لگا ہوا تھا۔گھونسلے میں جانے کے لئے اب دہلیز کا کام دینے لگا۔تنکے چن چن کر لاتے ہیں اور اس نوتعمیر دہلیز پر بیٹھ کر بہ اطمینان تمام گھونسلے میں بچھاتے جاتے ہیں۔ساتھ ہی چوں چوں بھی کرتے جاتے ہیں۔اپنی وہی فتح مندیوں کا یہ حسرت ناک انجام دیکھ کر بے ساختہ ہمت نے جواب دے دیا۔''

(''چڑیا چڑے کی کہانی'')

﴿۴﴾ خواجہ حسن نظامی :

''یہ بھنبھناتا ہوا ننھا سا پرندہ آپ کو بہت ستاتا ہے۔رات کی نیند حرام کردی ہے۔ ہندو، مسلمان، عیسائی، یہودی سب بالاتفاق اس سے ناراض ہیں۔ ہر روز اس کے مقابلے کے لئے مہمیں تیار ہوتی ہیں، جنگ کے نقشے بنائے جاتے ہیں۔مگر مچھروں کے جنرل کے سامنے کسی کی نہیں چلتی۔شکست پر شکست ہوئی چلی جاتی ہے اور مچھروں کا لشکر بڑھا چلا آتا ہے۔''

(''مچھر'')

﴿۵﴾ احمد جمال پاشا :

''میزبان اس حواس باختہ انسان کو کہتے ہیں جو عموماً اپنے سے بڑے یا اہم آدمی کو کسی خاص موقع پر شرف میزبانی بخشنے کے بہانے گھر بھر کو مختلف مصیبتوں میں مبتلا کرانے کا وسیع تجربہ رکھتا ہو۔اس کے ساتھ گھر والوں کی وہی حالت ہوتی ہے جو گیہوں کے ساتھ گھُن کی ہوا کرتی ہے۔گھر بھر میزبانی کی چکی میں پس کر اچھا خاصا گھُن چکر بن جاتا ہے۔''

(''میزبان بے زبان'')

﴿۶﴾ مشتاق احمد یوسفی :

''تو کوئی نہ ہو تیماردار؟ جی نہیں! بھلا کوئی تیماردار نہ ہو تو بیمار پڑنے سے فائدہ کیا؟ اور اگر مرجائے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو؟ توبہ کیجیے! مرنے کا یہ اکھل کھرُا دقیانوسی انداز مجھے کبھی نہ آیا۔ہوسکتا ہے غالب کے طرفدار یہ کہیں کہ مغرب کو محض جینے کا قرینہ آتا ہے، مرنے کا سلیقہ نہیں آتا اور سچ پوچھیے تو مرنے کا سلیقہ کچھ مشرق ہی کا حصہ ہے۔اسی بنا پر غالب کی نفاست پسند طبیعت نے ۱۲۷۷ہجری میں وبائے عام میں مرنا اپنے

لائق نہ سمجھا کہ اس کی اس میں کسرِ شان تھی حالاں کہ اپنی پیشین گوئی کو صحیح ثابت کرنے کی غرض سے وہ اسی سال مرنے کی آرزومند تھے۔''

(''پڑیے گر بیمار...'')

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:۔

﴿۳﴾ انشائیے کا موضوع کیا ہے؟

﴿۴﴾ انشائیے کی انفرادیت کیا ہے؟

﴿۵﴾ انشائیے کا اُسلوب کیسا ہوتا ہے؟

﴿۶﴾ انشائیے کے اُسلوب کی تین خصوصیات بیان کیجیے۔

01.07 انشائیہ اور دوسری نثری اصناف

انشائیہ، ایک منفرد صنفِ ادب ہے۔اس صنف کو افسانہ سرائی، قصہ گوئی اور ڈرامائیت سے کوئی سروکار نہیں۔تحقیق و تنقید سے بھی اس کا کوئی تعلّق نہیں۔ناول، افسانہ اور ڈرامے میں غیر موجود کو خلق کیا جاتا ہے جب کہ انشائیے میں موجود کو نئے پہلوؤں اور نئے زاویوں سے دیکھنے اور دکھانے کی کوشش کی جاتی ہے۔اسی طرح خاکہ نگاری، سیرت نویسی کی بھی انشائیے میں کوئی گنجائش نہیں، البتہ کسی شخصیت کے بعض پہلوؤں کو اُجاگر کیا جا سکتا ہے۔

بات میں بات پیدا کرنا انشائیہ نگاری کا خاص وصف ہے۔کالم نویس بھی بات میں بات پیدا کرنے کا ہنر جانتا ہے مگر دونوں کے طریقِ کار میں اور مقصدِ تحریر اور اندازِ تحریر میں واضح فرق ہوتا ہے۔کالم نویس اخباری پالیسی، وقت کے تقاضے یا کسی خاص حکمتِ عملی کے تحت کالم لکھتا ہے۔جب کہ انشائیہ نگار کا ذہن اس طرح کے عوامل سے یکسر پاک ہوتا ہے۔اس کی انفرادیت اپنا راستہ الگ بناتی ہے۔جس میں دیگر اصناف کا عکس نظر تو آسکتا ہے مگر مکمل دخل کی گنجائش نہیں ہوتی۔

انشائیہ کیوں کہ ایک پُر لطف اور دل چسپ صنف ہے، اس لئے شگفتگی اس کی جان ہے۔یہی وجہ ہے کہ سنجیدہ طرزِ اُسلوب کے بجائے وہ طنزیہ اور مزاحیہ اسالیب جزوی مطابقت اور مناسبت رکھتا ہے۔طنز میں اصلاح کا پہلو سنجیدہ مقصد کے حصول کا جذبہ یا کبھی کبھی دل آزاری کا پہلو بھی کارفرما ہوتا ہے۔جس کے سبب طنز کے عمل میں نشتریت کا عمل بھی شامل ہو جاتا ہے جب کہ انشائیے کو نشتریت یا تلخی سے کوئی واسطہ نہیں۔اس کے مقصد جداگانہ ہیں۔یہی وجہ ہے کہ ایک اچھے طنز نگار کے یہاں طنز ایک سہارے کا کام کرتا ہے، مقصود بالذات نہیں ہوتا۔ اسی طرح اس مزاح کا معاملہ بھی ہے جو سطحیت کی طرف لے جاتا ہے اور جس میں بات ہنسنے ہنسانے سے آگے نہیں بڑھتی۔انشائیہ نگار اس نوع کی مزاح سے اجتناب کرتا ہے اور یہی باتیں انشائیے کو دیگر اصناف سے منفرد بناتی ہیں اور اس کی علاحدہ پہچان قائم کرتی ہیں۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:۔

﴿۷﴾ انشائیہ اور قصہ گوئی میں کیا فرق ہے؟

﴿۸﴾ انشائیہ اور کالم میں کیا فرق ہے؟

﴿۹﴾ انشائیہ اور طنز و مزاح کے اُسلوب میں کیا فرق ہے؟

﴿۱۰﴾ انشائیے میں عدم تکمیلیت سے کیا مراد ہے؟

01.08 خلاصہ

انشائیہ، اردو ادب کی ایک جدید اور مقبول صنف ہے۔ اردو ادب میں اس صنف یعنی انشائیے کی روایت بہت زیادہ قدیم نہیں ہے۔ اس کا شمار اردو کی جدید اصناف میں ہوتا ہے۔ انشائیہ ایک آزاد صنف ہے یہ ایک ایسا بیانیہ ہے جس کا کوئی خاص موضوع یا خاص اُسلوب متعین نہیں ہے اس لئے اس کی تعریف اس طرح نہیں کی جاسکتی جس طرح ناول، افسانہ، ڈراما یا دیگر اصناف ادب کی تعریف کی جاتی ہے۔ اردو میں جدید نظم کی طرح انشائیے کی ابتدا بھی سرسید کی عہد میں انگریزی کے زیر اثر ہوئی۔ انشائیہ کسی خاص موضوع کا پابند نہیں ہے۔ دنیا کی ہر شئے اور زندگی کے ہر پہلو پر انشائیہ لکھا جاسکتا ہے۔ انفرادیت اس کی یہ ہے کہ کسی سنجیدہ مقالے کی طرح اس کی دلائل میں منطقی ربط و تسلسل نہیں ہوتا۔ انشائیہ شگفتہ موڈ کی پیداوار ہے اس لئے اس کی اُسلوب بیان میں فطری طور پر شگفتگی اور لطافت پائی جاتی ہے۔ اس میں فلسفیانہ موشگافیاں، منطقی استدلال، پندونصائح، سنجیدہ مباحث یا خشک تعلیم و تبلیغ کے لیے کوئی جگہ نہیں ہوتی۔

سرسید احمد اور ان کے رفقا محسن الملک، وقارالملک، الطاف حسین حالؔی اور محمد حسین آزادؔ کے مضامین (نیرنگِ خیال) میں اس صنف کی ابتدائی نقوش دیکھے جاسکتے ہیں۔ دیگر اہم انشائیہ نگاروں میں مولوی ذکاء اللہ، مہدی افادی، مرزا فرحت اللہ بیگ، عبدالحلیم شررؔ، نیاز فتح پوری، سجاد حیدر یلدرم، خواجہ حسن نظامی، پطرس بخاری، رشید احمد صدیقی، فکر تونسوی، کنھیا لال کپور، مشتاق احمد یوسفی، احمد جمال پاشا، نظیر صدیقی، وزیر آغا وغیرہ شامل ہیں۔

01.09 فرہنگ

- اجتناب : پرہیز، بچاؤ، دوری اختیار کرنا
- اسالیب : اسلوب کی جمع، طرز، طریقہ، اسٹائل
- استدلال : دلیل لانا، دلیل چاہنا
- اُسلوب : طریقہ، انداز
- افسانہ طرازی : افسانہ بنانا، بات کا بتنگڑ بنانا
- انبوہ : بھیڑ، جمع
- بصیرت : رہنمائی، یقین، قلب و نظر کی روشنی
- پند : نصیحت
- تخلیق : پیدا کی ہوئی، پیدا کرنا
- تشکیل : شکل پانا، شکل بنانا
- تکمیل : مکمل ہونا، کامل کرنا
- تمثیلی مضامین : رمزیہ مضامین، وہ مضامین جس میں غیر جان دار کو جان دار بنا کر پیش کیا گیا ہو
- رفعت : بلندی، اونچائی
- زردوزی : کارچوبی
- سطحیت : جس میں گہرائی نہ ہو، اوچھاپن، اوپری پن پھکڑ پن۔ غیر معاری، ہلکاپن
- شرفِ میزبانی : میزبان کی عزت
- شگفتگی : کھلاوٹ، تازگی، شادابی
- عدم تکمیلیت : نامکمل ہونا، ادھوراپن
- فلسفیانہ موشگافیاں : فلسفی کے انداز میں بال کی کھال نکالنا
- کام جوئی : کارگزاری، کامرانی، کارکردگی، کام کا جذبہ
- لطافت : نرمی، پاکیزگی، تازگی
- لطیف : نرم، پاکیزہ
- متعین : طے کیا ہوا، مقرر کیا ہوا

جنات	: جن کی جمع	محمول	: گمان کیا ہوا
حواس باختہ	: جس کے ہوش وحواس ٹھکانے نہ ہو، بدحواس	مقصود بالذات	: خاص اسی مقصد کے لئے، جو بذات خود مقصد ہو
خیال آرائی	: خیال کو سجا سنوار کر پیش کرنا، خوش حالی		
خیال آفرینی	: خیال کو نئے رنگ وروپ دینا، خیال سے خیال پیدا کرنا	ناقدین	: ناقد کی جمع، تنقید کرنے والا
		نصائح	: نصیحت کی جمع، بھلی باتیں، تجربہ کی باتیں، اچھی باتیں
دیوزادوں	: دیو کی اولادوں، دیو، لحیم شحیم، لمبے تڑنگے		
ردِعمل	: وہ عمل جو کسی عمل کے نتیجے میں کیا جائے (Reaction)	نقوش	: نقش کی جمع نشانات
		ہیبت	: ڈر، خوف

01.10 نمونہ امتحانی سوالات

الف: درجِ ذیل سوالوں کے جوابات ۱۰/۱۰ سطروں میں دیجیے:

سوال نمبر۱ انشائیہ کسے کہتے ہیں؟ وضاحت کیجیے۔

سوال نمبر۲ انشائیہ کے متعلق اپنا موقف سپردِ قرطاس کیجیے۔

سوال نمبر۳ انشائیہ کی تعریف کرتے ہوئے ان کی موضوعات پر روشنی ڈالیے۔

ب: درج ذیل سوالوں کے جوابات ۳۰/۳۰ سطروں میں دیجیے:

سوال نمبر۱ انشائیے کے اسلوب کی خصوصیات تحریر کیجیے۔

سوال نمبر۲ انشائیے کی تعریف بیان کیجیے اور اس کی آغاز اور اِرتقا پر روشنی ڈالیے۔

سوال نمبر۳ انشائیہ، ناول، افسانہ، ڈراما، خاکہ، وسوانح اور کالم نویسی سے کس طرح مختلف ہے؟ واضح کیجیے۔

01.11 حوالہ جاتی کتب

۱۔ اردو ادب میں طنز و مزاح از ڈاکٹر وزیر آغا

۲۔ اردو اسیز از سید ظہیر الدین مدنی

۳۔ انشائیہ اور انشائیے از سید محمد حسین

۴۔ اردو کا بہترین انشائی ادب از ڈاکٹر وحید قریشی

۵۔ اردو کے بہترین انشائیے از جمیل آرزو

01.12 اپنے مطالعے کی جانچ کے جوابات

(۱) انشائیہ ایک اسلوب کا نام ہے مگر یہ ایک ایسا آزاد اسلوب ہے جس کا کوئی موضوع بھی متعین نہیں۔

(۲) اردو میں انشائیہ کی ابتدا عہد سرسید میں ہوئی۔

(۳) انشایئے کا کوئی ایک موضوع مقرر نہیں۔ زندگی کے کسی بھی پہلو پر انشائیہ لکھا جا سکتا ہے۔

(۴) انشایئے کی انفرادیت یہ ہے کہ اس کی ظاہری بے ربطی اور عدم تکمیلیت کے باوجود خیال آفرینی، کشادگی اور رفعت کا احساس قائم رہتا ہے اور حصول مسرت و بصیرت کے مراحل خوش اسلوبی اور خوش طبعی کے ساتھ طے کیے جاتے ہیں۔

(۵) انشائیہ شگفتہ موڈ کی پیداوار ہے اس لئے اس کے اسلوب میں شگفتگی، بے ساختگی اور لطافت پائی جاتی ہے

(۶) تازگی، لچک اور خیال آفرینی۔

(۷) قصہ کہانی میں غیر موجود کو خلق کیا جاتا ہے جب کہ انشائیہ میں موجود کو نئے نئے زاویوں سے دکھایا جاتا ہے۔

(۸) کالم نویس، اخبار کی پالیسی یا کسی خاص حکمت عملی کے تحت کالم لکھتا ہے جب کہ ایک انشائیہ نگار حصول مسرت و بصیرت کا خواہاں ہوتا ہے۔

(۹) طنز میں اصلاح کی خواہش یا دل آزاری کا پہلو نکلتا ہے اور مزاح کا مقصد ہنسنا ہنسانا ہے جب کہ انشائیہ مسرت

(۱۰) انشایئے میں عدم تکمیلیت سے یہ مراد ہے کہ بات کو مکمل کرنا یا انجام تک پہنچانا ضروری نہیں۔ اسے پڑھ کر قاری کو تشنگی کا احساس رہتا ہے۔ قاری تشنگی کی اس آگ کو غور و فکر کے پانی سے بجھاتا ہے۔

اکائی 02 انشائیہ کی بنیادی خصوصیات

ساخت

02.01 : اغراض و مقاصد

02.02 : تمہید

02.03 : انشائیہ کی تعریف

02.04 : انشائیہ کی بنیادی خصوصیات

02.05 : خلاصہ

02.06 : فرہنگ

02.07 : نمونہ امتحانی سوالات

02.08 : حوالہ جاتی کتب

02.01 اغراض و مقاصد

غیر افسانوی اصناف کے تحت وہ تمام اصناف آتی ہیں جن میں قصہ یا کہانی شامل نہیں ہوتی۔ مثال کے طور پر خاکہ، آپ بیتی، سوانح، رپورتاژ، سفرنامہ، مضمون اور انشائیہ وغیرہ۔ اس اکائی میں آپ غیر افسانوی نثری اصناف کے تحت صنف انشائیہ کا مطالعہ کریں گے۔ اسی کے تحت اس اکائی میں آپ کو انشائیہ کی بنیادی خصوصیات پر مفید معلومات فراہم کی جائے گی۔ تاکہ آپ شاملِ نصاب اردو ادب کے انشائیوں سے لطف اندوز ہو سکیں۔

02.02 تمہید

انشائیہ اردو زبان کی جدید نثری اصناف میں سے ایک اہم صنف ہے۔ انشائیہ نگار بے ساختہ اور فطری انداز میں شخصی خیالات و تاثرات کو پیش کرتا ہے۔ اس کی پیش کش ایسی دل چسپ ہوتی ہے کہ انشائیہ کا مطالعہ کرنے والا ایک نئے تجربے اور نئی بصیرت سے دو چار ہوتا ہے۔ اس اعتبار سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ انشائیہ کا سفر مسرّت سے شروع ہو کر بصیرت پر تمام ہوتا ہے۔

انشائیہ میں غزل کا سا انداز ہوتا ہے کیوں کہ انشائیہ نگار گہرے اور پیچیدہ خیالات اور فلسفیانہ افکار و مباحث کو بھی ہلکے پھلکے انداز میں اس طرح پیش کرتا ہے کہ ایک خوش گوار فضا قائم ہو جاتی ہے۔ انشائیہ نگار فطری اور بے ساختہ گفتگو کا طرز اختیار کرتا ہے۔ لہٰذا انشائیہ میں ترتیب اور منصوبہ بند طریقے سے خیالات کا اظہار نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ ناقدین ادب انشائیہ کو غیر منظّم ادب پارہ بھی کہتے ہیں۔

02.03　انشائیہ کی تعریف

انشائیہ ہماری زبان میں مغرب سے آیا۔ دراصل اردو زبان کے لفظ ''مضمون'' کی طرح انگریزی زبان کا لفظ (ESSAY) بہت وسیع المعنی لفظ ہے۔ کیوں کہ لفظ ''ESSAY'' میں ''ESSAY'' کی تمام قسمیں شامل ہیں۔

انشائیہ کی صنف چوں کہ ہمارے یہاں انگریزی سے آئی ہے۔ اردو لفظ مضمون'' کی طرح انگریزی زبان کے(ESSAY) میں زندگی سے متعلق کسی بھی مسئلہ، پہلو، یا گوشے کو اظہارِ خیال کے لئے منتخب کیا جا سکتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ انشائیے کو انگریزی زبان میں ''PERSONAL OR LIGHT ESSAY'' بھی کہا جاتا ہے۔

اردو زبان میں انشائیہ کی تعریف کے متعلق تقریباً تمام ناقدین نے اس بات پر اتفاق کیا ہے کہ انشائیہ کو بے تکلف اور غیر رسمی ہونا چاہیے۔ علاوہ ازیں کسی ناقد نے انشائیہ میں مزاحیہ عناصر کی شمولیت کو درست کہا ہے تو کسی نے انشائیہ کو مزاح سے دُور رکھنے پر زور دیا ہے پھر بھی سبھی اس نکتے پر متحد و متفق ہیں کہ انشائیہ بہر حال مزاح نگاری نہیں ہے۔

البتہ انشائیہ میں مزاح کی آمیزش دیگر بات ہے جو انشائیہ کے رنگ کو مناسب طریقے سے نکھارنے کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ اگر چہ اُردو کے مزاح نگاروں نے بہت سے ایسے مضامین لکھے ہیں جن میں بہترین انشائیے کی خصوصیات موجود ہیں۔

اردو زبان میں انشائیہ کی تعریف متعین کرتے ہوئے ڈاکٹر محمد حسنین لکھتے ہیں:

> ''ایک جملے میں انشائیہ کی تعریف مشکل ہے۔ صنفی اور فنی لحاظ سے ہمارے یہاں یہ ''ادب پارہ'' بنا ہے اور قابل تعریف۔ انگریزی ادب میں مصرف عام ہے۔ انگریزی تعریفوں میں جانسن کا فقرہ بہت موزوں ہے۔ وہ کہتا ہے ''He is a loose sally of mind'' یعنی انشائیہ دماغ کی ایک ترنگ ہے۔ آزاد و خوش گوار لفظ ''ترنگ'' انشائیہ کی روح کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ وہ روح جس میں جولانی ہے مگر گرمی نہیں، جس میں انتشار ہے مگر پراگندگی نہیں، وہ روح جو دماغ سے زیادہ دل کو چھیڑتی ہے۔ انشائیہ کسی عنوان پر قلم کار کی گپ ہے۔ یہ گپ سنی سنائی نہیں ہوتی یہ ذاتی ہوتی ہے۔ اس میں آپ بیتی اور پرائی بیتی دونوں کا لطف ہوتا ہے۔ یہ ذہنی لہروں کی پیداوار ہے۔ اچھا اور کامیاب انشائیہ ذہن کا ایک شرارہ ہوتا ہے۔ جس کی ہر چنگاری آزاد و منتشر ہوتی ہے۔ ہم اسے ادب کی ایک پھل جھڑی بھی کہہ سکتے ہیں۔''
>
> مضمون: ادب کی ایک خاص صنف انشائیہ... ڈاکٹر محمد حسنین

یہاں یہ واضح کرنا ضروری ہے کہ ''مضمون'' اور ''انشائیہ'' ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں۔ انشائیہ اور مضمون میں جو فرق ہوتا ہے اُسے بہتر طریقے سے اسی وقت سمجھا جا سکتا ہے جب ایک ہی موضوع پر انشائیہ نگار اور مضمون نگار خامہ فرسائی کریں۔

دراصل مضمون موضوع کی گہرائی اور سنجیدگی اور دلائل کا متقاضی ہوتا ہے جب کہ انشائیہ نگار کا نقطۂ نظر ہمیشہ شخصی اور ذاتی ہوتا ہے۔ افکار و خیالات میں یکسانیت کے باوجود انشائیہ نگار سنجیدگی اختیار نہیں کرتا۔ وہ اظہارِ خیال کے چاہے جس موضوع کو منتخب کرے اس کے انداز بیان میں شگفتگی اور شادابی ہر حال موجود رہتی ہے۔ لہٰذا ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ انشائیہ نگار اپنے موضوع کا نہیں بلکہ اپنے موڈ کے تابع ہوتا ہے۔

02.04 انشائیہ کی بنیادی خصوصیات

انشائیہ صنفِ سخن ذہن کی ایک آزاد ترنگ ہے۔ یہ ترنگ خود میں آزاد، خود مختار اور خوش گوار ہے۔ انشائیہ کی مثال ذہن کی آزاد ترنگ سے دی جاتی ہے لہٰذا اس کا خاص وصف انتشار ہے مگر یہ انتشار پراگندگی سے آلودہ نہیں۔ انشائیہ کی یہ صفات اسے دوسری اصنافِ ادب سے منفرد و ممتاز کرتی ہیں۔ انتشار انشائیہ کی وسعت کا ضامن ہے۔ کیوں کہ دل چسپ گفتگو کرنے والا شخص جب ترنگ میں آ کر گفتگو کرتا ہے تو گفتگو کا دائرہ خود بخود موضوع کی قید سے آزاد ہو جاتا ہے اور شگفتگی اور بے تکلفی گفتگو میں شامل ہو کر بات کو پُر لطف بنا دیتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ انشائیہ میں مصنف کی شخصیت بے نقاب ہو کر ہمارے سامنے آتی ہے۔ انشائیہ کے ذریعے ہم مصنف کے ذوق و شوق، پسند و ناپسند، محبت و عداوت اور عقائد و توہمات سے واقفیت حاصل کرتے ہیں۔ دراصل انشائیہ نگار اپنی دَبی ہوئی خواہشات اور عادات و اطوار کا ذکر اس انداز میں کرتا ہے کہ بات بھی مکمل ہو جائے اور پردہ بھی قائم رہے لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ انشائیہ میں جو باتیں بیان کی جائیں ان کا انشائیہ نگار سے بہر حال کوئی تعلق ہو۔ دراصل انشائیہ کی دل کشی و تاثیر اس کے شخصی اور ذاتی ہونے کے وصف سے مشروط ہے۔ انشائیہ نگار غیر شخصی باتوں کو بھی شخصی اور ذاتی انداز میں پیش کر دیتا ہے۔ انشائیہ ذاتی احساسات اور جذبات و خیالات کو آزادنہ طور پر بیان کرنے کے لئے وجود میں آیا۔ اردو کے مشہور انشائیہ نگار رشید احمد صدیقی اپنے انشائیوں میں خیال کی آزاد ترنگ وئے کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''میرے مضامین غزل کی نوعیت کے ہوتے ہیں مربوط اور مسلسل نظم کے مانند ہیں۔''

انشائیہ کا فن اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ باتوں باتوں میں ایسی پتے کی بات کہہ دی جائے کہ قارئین کی نگاہوں کے سامنے نئی بصیرت کے باب وَا ہو جائیں۔ انشائیہ نگار اپنی دانش مندی سے ایسی باتیں کرتا ہے کہ اس کے قاری کا ذہن باتوں سے بہلتا رہے اور ہمہ تن گوش ہو کر اس کی باتیں سنے۔ انشائیہ نگار فلسفی کی مانند عقل کی باتیں نہیں کرتا بلکہ عقل مندی کی باتیں کرتا ہے۔ وہ فلسفیانہ موشگافی نہیں کرتا بلکہ بہتر طریقے سے زندگی کے اَسرار و رُموز اور پیچ و خم سے پردہ اُٹھاتا ہے۔ اس کا مقصد دل چسپ باتیں کر کے دوستی کی فضا قائم کرنا چاہتا ہے تا کہ اسے قارئین کا اعتماد حاصل ہو جائے۔ چنانچہ جب ایک بار یہ فضا قائم ہو جاتی ہے تو وہ قارئین کے سامنے جی بھر کے دل کی باتیں کرتا ہے۔

حاصلِ کلام یہ کہ انشائیہ نگار خشک مزاج واعظ نہیں بلکہ بذلہ سنج ہوتا ہے اور اس کا کام خوش گفتاری کے ذریعہ محفل کو زعفران زار بنانا ہے۔ انشائیہ نگار سنجیدہ موضوع کو غیر سنجیدہ اور غیر سنجیدہ موضوع کو سنجیدہ موضوع بنانے کے فن میں یدطولیٰ رکھتا ہے۔ جیسے وہ پارلیمنٹ کو ارہر کا کھیت بنا سکتا ہے اور کتوں کی نوائے سمع خراش کو طرحی غزل میں بدل سکتا ہے۔

آخرش یہ کہ انشائیہ اردو ادب کی ایک جدید صنف ہے۔ اور اب تک انشائیہ کو اردو ادب میں وہ مناسب مقام نہیں ملا ہے جس کے وہ لائق ہے۔ اردو ادب میں انشائیوں کا ایک بڑا ذخیرہ ان اُدبا کا تخلیق کردہ ہے۔ جو طنز و مزاح کے پیرائے میں اپنے افکار و خیالات کو پیش کرتے ہیں۔ ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ یہ صنف اپنے اندر بہت وسعت رکھتی ہے۔

انشائیے کی چند بنیادی خصوصیات اجمالی طور پر ملاحظہ کیجیے۔

﴿۱﴾ انشائیہ شخصی ردِ عمل کا اظہار ہے۔

﴿۲﴾ انشائیے کی ایک خوبی، اختصار بھی ہے۔

﴿۳﴾ انشائیہ مسرّت اور بصیرت بہم پہنچاتا ہے۔

﴿۴﴾ انشائیہ وسعت اور رفعت کا احساس دلاتا ہے۔

﴿۵﴾ انشائیہ ایک دل چسپ اور لطیف صنفِ ادب ہے۔

﴿۶﴾ خیال آفرینی، انشائیے کی ایک اہم خصوصیت ہے۔

﴿۷﴾ انشائیے کی ایک اہم خصوصیات اس کی عدم تکمیلیت ہے۔

﴿۸﴾ انشائیے میں اہم اور غیر تمام مرحلے خوش طبعی کے ساتھ طے کیے جاتے ہیں۔

﴿۹﴾ انشائیہ، انشائیہ نگار کے گہرے مشاہدے اور تجربے کی تاثراتی ردِّ عمل کا آئینہ ہوتا ہے۔

02.05 خلاصہ

اس اکائی میں انشائیہ کی تعریف کے متعلق مختصراً مگر جامع گفتگو کی گئی ہے جس میں اردو ادب کے کئی اہم ادیبوں کے ذریعے انشائیہ کی تعریف بیان کی کوشش کی گئی ہے جو کہ طلبا کو با آسانی سمجھ میں آجائے مثلاً انشائیہ ہماری زبان میں مغرب سے آیا۔ دراصل اردو زبان کے لفظ ''مضمون'' کی طرح انگریزی زبان کا لفظ (ESSAY) بہت وسیع المعنی لفظ ہے۔ کیوں کہ لفظ ''ESSAY'' میں ''ESSAY'' کی تمام اقسام شامل ہیں۔ انشائیہ کی صنف چوں کہ ہمارے یہاں انگریزی سے آئی ہے۔ اردو لفظ مضمون'' کی طرح انگریزی زبان کے (ESSAY) میں زندگی سے متعلق کسی بھی مسئلہ، پہلو، یا گوشے کو اظہارِ خیال کے لئے منتخب کیا جا سکتا ہے۔

اردو زبان میں انشائیہ کی تعریف کے متعلق تقریباً تمام ناقدین نے اس بات پر اتفاق کیا ہے کہ انشائیہ کو بے تکلف اور غیر رسمی ہونا چاہیے۔ علاوہ ازیں کسی ناقد نے انشائیہ میں مزاحیہ عناصر کی شمولیت کو درست کہا ہے تو کسی نے انشائیہ کو مزاح سے دُور رکھنے پر زور دیا ہے پھر بھی سبھی اس نکتہ پر متحد و متفق ہیں کہ انشائیہ بہر حال مزاح نگاری نہیں ہے۔

انشائیہ میں انشائیہ نگار کے ذاتی تجربات و احساسات کی بنیادی اہمیت ہوتی ہے۔ انشائیہ نگار اپنے مشاہدات اور گرد و پیش کی زندگی میں رونما ہونے والے واقعات کو ذاتی اور شخصی تجربہ بنا کر اس انداز سے پیش کرتا ہے کہ اس میں مصنوعی انداز نام کو نہیں ہوتا۔ غرض کہ بے تکلفی، سادگی، شستگی اور شگفتگی انشائیہ کے اہم اوصاف ہیں۔ انشائیہ نگار سنجیدگی کا لبادہ نہیں اوڑھتا بلکہ حکمت و فلسفہ کی باتیں بھی سادہ اور خوش گوار انداز میں بیان کر دیتا ہے۔ خصوصی طور پر اس اکائی میں انشائیہ کی بنیادی خصوصیات پیش کیا ہے۔ جو کہ اس کا عنوان ہے۔ امید کی جاتی بی.اے طلبا کے لئے یہ اکائی کے مفید و معاون ثابت ہوگی۔

02.06 فرہنگ

آمیزش	: ملاوٹ، ملونی	عدم تکمیلیت	: ادھورا پن
اطوار	: طور طریقے، رنگ ڈھنگ	غیر رسمی	: رسم و رواج کے خلاف
افسانوی نثر	: داستان، ناول، افسانہ اور ڈراما	فطری	: قدرتی طور پر
انتشار	: پراگندگی، بے ترتیبی، بدنظمی	فلسفی	: فلاسفر، علم فلسفہ جاننے والا

بذلہ سنجی	: لطیف گو، ظریف، خوش طبع	قارئین	: پڑھنے والا
بصیرت	: سوجھ بوجھ	گپ	: افواہ، بک بک، ہنسی مذاق کی بات
بہرحال	: ہر حال میں	گردوپیش	: آس پاس، گردونواح
بے تکلف	: اچانک، ناگہانی	لبادہ	: جُبّہ
بے ساختہ	: دفعتاً، اچانک	متقاضی	: تقاضہ طلب کرنے والا
پراگندگی	: پریشاں، منتشر	مربوط	: جڑا ہوا، مسلسل، رواں
پیش کش	: کر کے دِکھانا	مزاح	: ہنسی ٹھٹھولی
پھلجھڑی	: فتنہ انگیز بات	مشروط	: جس کے ساتھ کوئی شرط ہو
ترنگ	: لہر، موج، خیال	معاون	: مددگار
توہمات	: وہم، قیاس	مغرب	: یورپ
جولانی	: ولولہ، جوش، طبیعت وغیرہ کی تیزی	منصوبہ بند	: منظّم طور پر
حق بجانب	: حق کی طرف	موڈ	: کسی کام کے لئے طبیعت کا موزوں ہونا
حکمت	: دانائی، خوبی، مصلحت		
خوش طبعی	: ظرافت، دل لگی، ہنسی مزاق	ناقدین	: ناقدی جمع، تنقید کرنے والے
دوچار	: ملاقات، سامنا ہونا، کچھ، چند	نقطۂ نظر	: نظریہ
ردِّعمل	: کسی عمل کا جوابی عمل	نکتہ	: خاص بات
زعفران زار	: پُر رونق، چہل پہل	نوائے سمع خروش	: کانوں کو پریشان کرنے والی
سنجیدگی	: توازن، وقار، متانت	واضح کرنا	: ظاہر کرنا، وضاحت کرنا
شرارہ	: آگ کا پتنگا، چنگاری	ہمہ تن گوش	: پوری توجہ اور انہماک سے سننے والا
شمولیت	: شامل کرنا	یکسانیت	: برابر، ایک جیسا

02.07 نمونہ امتحانی سوالات

الف: درجِ ذیل سوالوں کے جوابات ۱۰/۱۰ سطروں میں دیجیے:

سوال نمبر۱ انشائیہ کسے کہتے ہیں؟ تعریف کیجیے۔

سوال نمبر۲ انشائیہ پر اپنی معلومات سپردِ قرطاس کیجیے۔

سوال نمبر۳ شاملِ نصاب کسی انشائیے پر اپنا موقف بیان کیجیے۔

ب: درج ذیل سوالوں کے جوابات ۳۰/۳۰ سطروں میں دیجیے:

سوال نمبر۱ انشائیے کے اسلوب کی خصوصیات تحریر کیجیے۔

سوال نمبر۲ انشائیے کی بنیادی خصوصیات مفصل طور پر روشنی ڈالیے۔

سوال نمبر۳ شاملِ نصاب اپنی پسند کے کسی انشائیہ نگار پر ایک مضمون رقم کیجیے۔

02.08 حوالہ جاتی کتب

۱۔ اردو ادب میں طنز و مزاح	از	ڈاکٹر وزیر آغا
۲۔ اردو اسیز	از	سید ظہیر الدین مدنی
۳۔ اردو کا بہترین انشائی ادب	از	ڈاکٹر وحید قریشی
۴۔ اردو کے بہترین انشائیے	از	جمیل آرزو

✲

اکائی 03 سچ اور جھوٹ کا رزم نامہ : محمد حسین آزاد

ساخت

- 03.01 : اغراض و مقاصد
- 03.02 : تمہید
- 03.03 : محمد حسین آزاد کے حالاتِ زندگی
- 03.04 : محمد حسین آزاد کی انشائیہ نگاری
- 03.05 : انشائیہ ''سچ اور جھوٹ کا رزم نامہ'' کا متن (اقتباس)
- 03.06 : انشائیہ ''سچ اور جھوٹ کا رزم نامہ'' کا تجزیہ
- 03.07 : خلاصہ
- 03.08 : فرہنگ
- 03.09 : نمونہ امتحانی سوالات
- 03.10 : حوالہ جاتی کتب
- 03.11 : اپنے مطالعے کی جانچ کے جوابات

03.01 اغراض و مقاصد

اس اکائی کے مطالعے کا مقصد یہ ہے کہ آپ محمد حسین آزاد کا بحیثیت انشائیہ نگار کے تعارف حاصل کر سکیں۔ محمد حسین آزاد کی انشائیہ نگاری کی خصوصیات سے واقفیت حاصل کریں۔ ان کی معرکتہ الآرا تصنیف ''نیرنگِ خیال'' سے متعارف ہو سکیں اور محمد حسین آزاد کے منفرد اُسلوب کو جان سکیں۔ آپ اس اکائی کے مطالعے سے انشائیہ ''سچ اور جھوٹ کا رزم نامہ'' کے اندازِ بیاں کا جائزہ بھی لے سکیں گے۔

03.02 تمہید

آپ نے انشائیہ نگاری کے بارے میں پڑھا ہے۔ انشائیہ دراصل مضمون کی ہی ایک قسم ہے۔ مضمون میں سنجیدہ موضوعات پر منطقی انداز میں اظہار خیال کیا جاتا ہے لیکن مضمون کے برخلاف انشائیہ میں انشائیہ نگار عام طور سے موضوعات پر اظہار خیال کے ساتھ فکر و فلسفے کے اہم نکات بیان کرتا ہے۔ یہ نہایت ہلکے پھلکے مضامین ہوتے ہیں۔ تاہم انشائیہ نگار اپنے شخصی احساسات اور تاثرات شامل کر کے اس کی اہمیت میں اضافہ کرتا ہے۔ یعنی بات سے بات پیدا کر کے بڑی اہم، فکر انگیز اور معنویت سے پُر باتیں پیش کرتا ہے۔ محمد حسین آزاد سے قبل ماسٹر رام چندر اور سر سید احمد خاں نے مضامین لکھے۔ ان دونوں نے علمی، ادبی و سائنسی اور اصلاحی مضامین لکھے۔ جب کہ انشائیہ کے لئے شگفتہ بیانی اور تمثیلی انداز ضروری ہوتا ہے۔ محمد حسین آزاد وہ پہلے انشا پرداز ہیں جن کے یہاں یہ خوبیاں ملتی ہیں۔ محمد حسین آزاد کے علاوہ سجاد حیدر یلدرم، نیاز فتح پوری، مولانا ابوالکلام آزاد، مہدی افادی، خواجہ حسن نظامی اور رشید احمد صدیقی اردو کے اہم انشائیہ نگار ہیں۔

03.03 محمد حسین آزادؔ کے حالات زندگی

محمد حسین نام تھا اور آزادؔ تخلص کرتے تھے۔ ۱۰؍ جون ۱۸۳۰ء بروز جمعرات دلّی میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام محمد باقر تھا۔ محمد باقر ایک اچھے صحافی تھے۔ وہ ہند کے اوّلین اخبار ''اردو اخبار'' کے ایڈیٹر تھے۔ انہوں نے اپنے اخبار کے ذریعے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں حصّہ لیا تھا۔ آزادؔ چار سال کے ہوئے کہ ان کی والدہ امانی خانم کا انتقال ہو گیا۔ تب محمد باقر اور ان کی بہن یعنی آزادؔ کی پھوپھی نے ان کی پرورش کی۔ خصوصاً محمد باقر نے آزادؔ کی تعلیم پر خاص توجہ دی۔ ابتدائی تعلیم کے بعد ۱۸۴۵ء میں ''دہلی کالج'' میں داخل ہوئے۔ یہ اس دَور کا مشہور کالج تھا۔ اس کالج میں نذیر احمد اور مولوی ذکاء اللہ ان کے ہم جماعت تھے۔ آزادؔ کا شمار کالج کے ذہین طلبا میں ہوتا تھا، انہیں کالج سے وظیفہ بھی ملا کرتا تھا۔

آزادؔ نے شاعری شروع کی تو ابراہیم ذوقؔ سے اصلاح لینے لگے۔ کئی سالوں تک آزادؔ، ذوقؔ کے شاگرد رہے۔ بعد میں ذوقؔ کے دیوان کو آزادؔ ہی نے مرتب کیا۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں آزادؔ کو بہت ساری پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ان کے والد محمد باقر انگریزوں کے خلاف جنگِ آزادی میں حصہ لینے کی پاداش میں شہید کر دیے گئے۔ آزادؔ کا گھر بار لوٹ لیا گیا۔ اسی سال ان کی ایک سالہ بچی کا انتقال ہو گیا۔

دلی کی تباہی کے بعد آزادؔ اِدھر اُدھر تلاشِ روزگار میں بھٹکتے رہے۔ کبھی لاہور کبھی پنجاب میں مختلف مقامات پر خدمات انجام دیتے رہے۔ آخر کار پنجاب یونیورسٹی میں ملازمت کے بعد انہیں معاشی فراغت نصیب ہوئی۔ وہیں میجر فلر اور کرنل ہالرائیڈ کے ساتھ مل کر ''انجمنِ پنجاب'' کی بنیاد ڈالی۔ ۱۸۶۸ء میں آزاد اس کے سکریٹری مقرّر رہے۔ مولانا الطاف حسین حالیؔ بھی ان کے شریک کار تھے۔ ۱۸۷۰ء میں کرنل ہالرائیڈ نے انہیں گورنمنٹ کالج میں عربی فارسی کا پروفیسر مقرّر کیا۔ ان کی گراں قدر علمی و ادبی خدمات پر ۱۸۸۷ء میں ''شمس العلما'' کا خطاب دیا گیا۔ ۱۸۵۷ء کی ہلاکت خیزی، والد کی شہادت، اپنی دخترِ اُمت السکینہ کی موت، پھر ۱۸۷۷ء میں ان کی پھوپھی کا انتقال اور اسی زمانے میں ان کے لڑکوں کی وفات نے آزادؔ کے ذہن کو منتشر کر دیا۔ اس عرصے میں انہوں نے متعدّد نوحے، سلام، مناجات اور مرثیے لکھے لیکن وہ سب برباد ہو گئے۔ تمام ناگہانی حالات نے ان کے ذہن کو منتشر کر دیا جس کی وجہ سے وہ آخری عمر میں اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھے اور بالآخر ۲۲؍ جنوری ۱۹۱۰ء کو ان کا انتقال ہو گیا۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:۔

﴿۱﴾ محمد حسین آزادؔ کس سنہ میں پیدا ہوئے؟

﴿۲﴾ محمد حسین آزادؔ کے والد کس اخبار کے ایڈیٹر تھے؟

﴿۳﴾ محمد حسین آزادؔ نے شاعری میں کس سے اصلاح لی؟

﴿۴﴾ محمد حسین آزادؔ نے کس کے ساتھ مل کر ''انجمن پنجاب'' کی بنیاد ڈالی؟

﴿۵﴾ محمد حسین آزادؔ کو ان کے علمی و ادبی کارناموں پر کس خطاب سے نوازا گیا؟

﴿۶﴾ محمد حسین آزادؔ کا انتقال کس سنہ میں ہوا؟

محمد حسین آزاد اردو ادب کی تاریخ میں کئی حیثیتوں سے بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ انہیں جدید اردو شاعری کا بانی مانا جاتا ہے۔ اس لئے کہ محمد حسین آزاد سے قبل شاعری صرف عشقیہ موضوعات اور مثنویوں کے داستانوی قصوں تک محدود تھی۔ جب کہ آزاد نے مختلف موضوعات پر کارآمد نظمیں لکھ کر اردو شاعری کے دامن کو وسیع کیا۔ آزاد ایک صاحبِ طرز ادیب کی حیثیت رکھتے ہیں۔ نثر میں انہوں نے ایسی تصانیف چھوڑی ہیں جنھوں نے انہیں شہرتِ دَوام بخشی ہیں۔ ان کا منفرد اُسلوب اور طرزِ تحریر ان سے شروع ہو کر ان پر ہی ختم ہوگیا۔ ان کی تحریر کے بانک پن کی کوئی بھی تقلید نہ کر سکا۔

''قصصِ ہند'' آزاد کا پہلا کارنامہ ہے۔ ''سخندانِ فارس''، فارسی زبان و ادب سے متعلق تصنیف ہے۔ آزاد کی تمثیلی انشائیوں کا مجموعہ ''نیرنگِ خیال'' دو حصوں میں شائع ہوا۔ ''دربارِ اکبری'' میں تاریخ ہند کے سنہرے دَور کو موضوع بنایا گیا۔ ''سیرِ ایران'' میں ایران کے سفر کے تجربات بیان کیے گئے۔ ہیں، نظم آزاد، آزاد کے نئے تصوّرِ ادب کی ترجمان ہے۔ ''نصیحت کا کرن پھول''، پنڈت من پھول کی فرمائش پر لکھی گئی۔ آزاد کی شاہ کار تصنیف جس نے انہیں شہرت عطا کی وہ ''آبِ حیات'' ہے۔ یہ کتاب اردو شعرا کا تذکرہ ہے۔ اس میں ادبی تاریخ کی خصوصیتیں بھی شامل ہیں۔ یہ کتاب ان کی منفرد اُسلوب کی وجہ سے بڑی شہرت رکھتی ہے۔

محمد حسین آزاد جہاں نثر میں متعدد تصانیف کی بنا پر بلند حیثیت رکھتے ہیں، وہیں اردو شاعری میں بھی بلند مقام رکھتے ہیں۔ ''انجمنِ پنجاب'' کے بدولت انہوں نے اردو میں نظم نگاری کو فروغ دیا اور نئے نئے موضوعات پر نظمیں لکھ کر شاعری میں کئی جہتیں تلاش کیں۔ اس کے علاوہ انہوں نے کئی مثنویاں بھی لکھیں جو اپنی سادہ بیانی اور مختلف موضوعات کی وجہ سے اہمیت رکھتی ہیں۔ بچوں کے لئے بھی انہوں نے درسی کتابیں تصنیف کیں۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:۔

﴿۷﴾ محمد حسین آزاد کو کس شاعری کا بانی مانا جاتا ہے؟

﴿۸﴾ محمد حسین آزاد کا پہلا کارنامہ کون سا ہے؟

﴿۹﴾ محمد حسین آزاد کے تمثیلی انشائیوں کے مجموعہ کا نام کیا ہے؟

﴿۱۰﴾ ''دربارِ اکبری'' کا موضوع کیا ہے؟

﴿۱۱﴾ ایران کے سفر کے تجربات کو آزاد نے کس کتاب میں قلم بند کیا ہے؟

﴿۱۲﴾ محمد حسین آزاد کی وہ کون سی تصنیف ہے جس نے انہیں شہرت کی بلندیوں پر پہنچا دیا؟

﴿۱۳﴾ جدید ادب سے متعلق آزاد کے تصوّرات کس کتاب میں ملتے ہیں؟

﴿۱۴﴾ ''نصیحت کا کرن پھول' کس کی فرمائش پر لکھی گئی؟

03.04 محمد حسین آزاد کی انشائیہ نگاری

محمد حسین آزاد کا دَور اصلاحی ادب کا دَور تھا۔ اس دَور میں سرسید اور ان کے رفقاء اصلاحی ادب کی ترویج و اشاعت کر رہے تھے۔ مختلف موضوعات پر سنجیدہ مضامین لکھ رہے تھے۔ ان مضامین میں انشائیہ کی خصوصیات نہیں ملتیں۔ ماسٹر رام چندر، ذکاء اللہ، نذیر احمد اور سرسید کے مضامین میں اصلاحی مقصد اور راست انداز نمایاں تھا۔ جب کہ محمد حسین آزاد وہ پہلے مضمون نگار ہیں جس کے مضامین میں انشائیہ کے نقوش

ملتے ہیں۔آزاد کی شاعرانہ طبیعت اور انفرادیت نے انگریزی ادب سے متاثر ہو کر اپنے افکار و تصوّرات کو ایک نئے سانچے میں ڈھال کر اظہار کرنے کی کوشش کی۔

''نیرنگِ خیال'' محمد حسین آزاد کے انشائیوں کا مجموعہ ہے۔یہ مجموعہ دو حصوں میں شائع ہوا۔انشائیوں کا حصہ اوّل ۱۸۸۱ء میں شائع ہوا۔اس میں آٹھ انشائیے شامل ہیں حصہ دوم کو آزاد کے انتقال کے بہت عرصہ بعد آغا محمد طاہر (نبیرۂ آزاد) نے شائع کروایا۔''نیرنگِ خیال'' کی اشاعت نے اردو انشاپردازی میں ایک نئے باب کا آغاز کیا۔''نیرنگِ خیال'' اپنے دل کش اُسلوب کی وجہ سے اردو ادب میں ہمیشہ زندہ رہے گی۔کیوں کہ آزاد نے مختلف موضوعات پر تمثیلی انداز میں جس طرح اظہارِ خیال کیا ہے اسی کے بنا پر اردو میں تمثیل نگاری کی ایک منفرد مثال قائم ہوگئی۔آزاد سے قبل مُلّا وجہی نے اپنی تصنیف ''سب رَس'' میں تمثیلی پیرایے کو اپنایا تھا لیکن وہ داستانوی صنف تھی اور اس میں طوالت تھی۔تاہم آزاد نے مختصر مضامین میں جس خوب صورتی سے تمثیل کو ڈھالا ہے یہ ان ہی کی خوبی ہے۔

تمثیل یا رمزیہ کو انگریزی میں "Allegory" کہتے ہیں اس صنفِ ادب میں غیر مادی تصوّرات کو مادی کرداروں کی شکل میں فرض کر لیا جاتا ہے اور ان کی خصوصیات کو مادّی کرداروں کی صورت میں اس طرح بیان کیا جاتا ہے کہ اس سے ایک قصہ بیان ہوتا ہے۔اس طرح سے کہ یہ قصہ دو سطحوں پر حرکت کرتا ہے۔ایک تو اس کے ظاہری معنی ہوتے ہیں اور دوسرے تمثیلی مطالب میں گہرے معنی پنہاں ہوتے ہیں۔ اس صنف ادب کا مقصد راست اخلاقی تعلیم کے بجائے تمثیلی قصے کے روپ میں اخلاقی تعلیم دینا زیادہ کارگر سمجھا جاتا تھا۔

''نیرنگِ خیال'' محمد حسین آزاد کے تمثیلی انشائیوں کا مجموعہ ہے۔اس مجموعے کے تمام مضامین انگریزی کے تمثیلی مضامین سے ماخوذ ہیں، ترجمہ نہیں۔جس کا اعتراف خود آزاد نے کیا ہے۔وہ لکھتے ہیں:

> ''میں انگریزی میں بالکل بے زبان ہوں۔اور اس ناکامی کا مجھے بھی احساس ہے۔یہ چند مضمون جو لکھے ہیں نہیں کہہ سکتا کہ ترجمہ کیے ہیں۔ہاں جو کچھ کانوں نے سنا فکرِ مناسب نے زبان کے حوالے کیا۔ ہاتھوں نے اسے لکھ دیا۔''
>
> ('نیرنگ خیال'۔دیباچہ۔ص۵)

ظاہر ہے آزاد نے انگریزی مضامین کو سن کر اس سے استفادہ کیا اور اپنی ذہنی اُپج سے ان کو انشائیوں کے روپ میں پیش کیا۔انہوں نے انگریزی کے مشہور مضمون نگار Addison اور Johnson کے مضامین سے استفادہ کیا۔یہ ضرور ہے کہ آزاد نے انگریزی انشاپردازوں کے خیالات سے چراغِ شوق روشن کیے۔تاہم اردو کے مزاج اور ہندوستانی تاریخ و تہذیب کو اپنے مدِنظر رکھا اس کے لئے انہیں اصل سے انحراف بھی کرنا پڑا۔

''نیرنگ خیال'' کے مضامین کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس میں واعظ و نصیحت کے خشک مضامین کو قصہ کا روپ دے کر دل چسپ بنا دیا گیا ہے۔اس میں آزاد کی ذہنی اُپج اور قوّتِ تخیل کا دخل ہے اور یہی ان کی تحریر کی خوبی ہے۔ان کا قلم جو ہر دکھاتا نظر آتا ہے اور وہ ایک بہترین انشاپرداز کی حیثیت سے ظاہر ہوتے ہیں۔ان مضامین میں زورِ بیان، رنگینی اور افسانویت وڈرامائیت خاص طور پر نمایاں ہوتی ہے۔ ان کی طرزِ تحریر سادہ اور سلیس ہے لیکن تشبیہات اور استعارات کے استعمال سے اس میں رنگینی پیدا ہوتی ہے۔

''نیرنگِ خیال'' کے مضامین میں غیر مادی تصوّرات اوران کے متعلقات کو بڑی خوبی سے مادی کرداروں کی شکل دی گئی ہے۔مثلاً: ''آدم'' کوایک بادشاہ فرض کیا گیا۔''سچ'' کوایک ملکہ خیال کر کے''ملک صداقت زمانی'' کا نام دیا گیا اور''دروغ دیوزاد'' کو جھوٹ کا بادشاہ تصوّر کیا گیا۔آزاد نے اس طرح سے کئی کردار تراشے ہیں۔تمام مفروضات کو استعارہ سے کام لے کر قصے روپ میں پیش کیا ہے۔اوران قصّوں سے اخلاقی نتیجے نکالے ہیں۔جن کے پیچھے مفید اور کارآمد نصیحتیں پوشیدہ ہیں۔ان انشائیوں کی سب سے بڑی خوبی یہی ہے کہ واعظ و نصیحت کے خشک مضامین کو دل چسپ قصے کہانیاں بنا دیا گیا ہے۔یہی آزاد کی طرزِ تحریر کی خوبی ہے۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:۔

﴿۱۵﴾ محمد حسین آزاد کے انشائیوں کے مجموعہ کا کیا نام ہے؟

﴿۱۶﴾ ''نیرنگِ خیال'' کا پہلا حصہ کس سنہ میں شائع ہوا؟

﴿۱۷﴾ ''نیرنگ خیال'' سے پہلے کس تصنیف میں تمثیلی پیرایہ ملتا ہے؟

﴿۱۸﴾ محمد حسین آزاد نے انگریزی کے کن مضمون نگاروں سے استفادہ کیا ہے؟

03.05 انشائیہ ''سچ اور جھوٹ کا رزم نامہ'' کا متن (اقتباس)

عہد قدیم کے مؤرّخ لکھتے ہیں کہ اگلے زمانے میں فارس کے شرفا اپنے بچوں کے لئے تین باتوں کی تعلیم میں بڑی کوشش کرتے تھے۔شہسواری، تیراندازی اور راست بازی۔شہسواری اور تیراندازی تو بے شک سہل آجاتی ہوگی مگر کیا اچھی بات ہوتی۔اگر ہمیں معلوم ہوجاتا کہ راست بازی کن کن طریقوں سے سکھاتے تھے۔اور وہ کون سی سپر تھی کہ جب دروغ دیوزاد آکران کے دلوں پر شیشۂ جادو مارتا تھا۔تو یہ اس چوٹ سے اس کی اُوٹ میں بچ جاتے تھے۔اس میں شک نہیں کہ دنیا بری جگہ ہے!چندروزہ عمر میں بہت سی باتیں پیش آجاتیں ہیں جو اس مشتِ خاک کو اس دیو آتش زاد کی اطاعت کے لئے مجبور کرتی ہیں۔انسان سے اکثر ایسا جرم ہوجاتا ہے کہ اگر قبولے تو مرنا پڑتا ہے۔ناچار سکڑنا پڑتا ہے۔کبھی اَبلہ فریبی کر کے جاہلوں کو پھنساتا ہے۔جب لقمۂ رزق پاتا ہے۔اس کے علاوہ بہت مزے دنیا کے ہیں کہ مکرو دغا ان کی چاٹ لگاتی ہے اور جزوی جزوی خطائیں ہوجاتی ہیں جن سے مکرتے ہی بن آتی ہے۔الغرض بہت کم انسان ہوں گے جن میں یہ حوصلہ اور استقلال ہو کہ راستی کے رستے میں ہر دم ثابت قدم ہی رہیں۔

یہ بھی یاد رہے کہ انسان کے سچ بولنے کے لئے سننے والے بھی ضرور ہیں کیوں کہ خوشامد جس کی دُکان میں آج موتی برس رہے ہیں، اس سے زیادہ جھوٹ کیا ہوگا اور کون ایسا ہے جو اس کی قید کا زنجیری نہیں۔ڈرپوک بے چارا ڈر کا مارا خوشامد کرتا ہے۔تابعدار اُمید کا بھوکا آقا کو خوش کر کے پیٹ بھرتا ہے۔دوست محبت کا بندہ ہے۔اپنے دوست کے دل میں اسی سے گھر کرتا ہے۔بہت سے ایسے بھی ہیں کہ نہ غلام ہیں نہ ڈرپوک ہیں۔انہیں باتوں باتوں میں خوش کردینے ہی کے شوق ہے۔اس طرح جب جلسوں میں نمودِیے گدھوں کی دعوے بل ڈاگ (ایک قسم کا شکاری کتا ہے، جسے ہندوستانی زبان میں گلڈانک کہتے ہیں) کی آواز سے کئی میدان آگے نکل جاتے ہیں۔تو ان میں وہ لوگ بھی ہوتے ہیں جنہیں کچھ اُمید، کچھ ڈر، کچھ مروّت سے غرض چار و ناچار کبھی ان کے ساتھ ساتھ کبھی ان کے پیچھے پیچھے دَوڑنا پڑتا ہے۔

آج کل تو یہ حال ہے کہ جھوٹ کی عمل داری دُور دُور تک پھیل گئی ہے بلکہ جن صاحب تمیزوں کو قوتِ عقلی جھوٹ نہیں بولنے دیتی اور خود اس مردار سے متنفّر ہیں۔ وہ بھی اسی کے حامی ہو کر اَوروں کے اخلاق خراب کرتے ہیں۔

سچ کا عجب حال ہے کہ اتنا تو اچھا ہے مگر پھر بھی لوگ اسے ہر وقت اچھا نہیں سمجھتے۔ چنانچہ جب کسی شئے پر دل آتا ہے اور سچ اس کے برخلاف ہوتا ہے تو اس وقت سچ سے زیادہ کوئی برا ہی نہیں معلوم ہوتا۔ اصل یہ ہے کہ حضرت انسان کو حقیقت اور واقعیت سے کچھ غرض نہیں۔ جس چیز کو جی نہیں چاہتا اس کا جاننا بھی نہیں چاہتے۔ جو بات پسند نہیں آتی۔ اس کا ذکر بھی نہیں سنتے۔ اس کان سنتے ہیں، اس کان نکال دیتے ہیں۔ حکیموں نے جھوٹ سے متنفّر ہونے کی بہت سی تدبیریں نکالی ہیں اور جس طرح بچوں کو کڑوی دوا مٹھائی میں ملا کر کھلاتے ہیں۔ اسی طرح انواع واقسام کے رنگوں میں اس کی نصیحتیں کی ہیں۔ تا کہ لوگ اسے ہنستے کھیلتے چھوڑ دیں۔

واضح ہو کہ ملک صداقت زمانی سلطان آسمان کی بیٹی تھی جو کہ ملکہ دانش خاتون کے پیٹ سے پیدا ہوئی تھی۔ جب ملکہ موصوفہ نے ہوش سنبھالا تو اوّل تعلیم وتربیت کے سپرد ہوئی۔ جب انہوں نے اس کی پرورش میں اپنا حق ادا کر لیا تو باپ کے دربار میں سلام کو حاضر ہوئی۔ اسے نیکی اور نیک ذاتی کے ساتھ خوبیوں اور محبوبیوں کی زیور سے آراستہ دیکھ کر سب نے صدق دل سے تعریف کی۔ عزت ودَوام کا تاج مرصّع سر پر رکھا گیا اور حکم ہوا کہ جاؤ اَولادِ آدم میں اپنا نور پھیلاؤ۔ عالمِ سفلی میں دروغ دیوزاد ایک سفلہ نابکار تھا کہ حمق تیرہ دماغ اس کا باپ تھا اور ہوس ہوا پرست اس کی ماں تھی۔ اگر چہ اسے دربار میں آنے کی اجازت نہ تھی مگر جب کسی تفریح کی صحبت میں تمسخر اور ظرافت کے بھانڈ آیا کرتے تھے۔ تو اُن کی سنگت میں وہ بھی آجاتا تھا۔ اتفاقاً اس دن وہ بھی آیا ہوا تھا اور بادشاہ کو ایسا خوش کیا کہ اسے ملبوس خاص کا خلعت مل گیا تھا۔ یہ منافق دل میں سلطان آسمانی سے سخت عداوت رکھتا تھا ملکہ کی قدر ومنزلت دیکھ کر اسے حسد کی آگ نے بھڑکا دیا۔ چنانچہ وہاں سے چپ چپاتے نکلا اور ملکہ کے عمل میں خلل ڈالنے کو ساتھ ساتھ روانہ ہوا۔ جب یہ دو دعویدار نئے ملک اور نئی رعیت کے تسخیر کرنے کو اُٹھے۔ تو چوں کہ بزرگانِ آسمانی کو ان کی دشمنی کی بنیاد ابتدا سے معلوم تھی۔ سب کی آنکھیں ادھر لگ گئیں کہ دیکھیں ان کی لڑائی کا انجام کیا ہو؟ سچ کے زور وطاقت کو کون نہیں جانتا۔ چنانچہ ملکہ صداقت کو بھی حقیقت کے دعوے تھے، اُٹھی اور اپنے زور میں بھری ہوئی تھی۔ اسی واسطے بلند اُٹھی۔ اکیلی آئی اور کسی کی مدد ساتھ نہ لائی۔ ہاں آگے آگے فتح واقبال نور کا غبار اُڑاتے آتے تھے اور پیچھے پیچھے اِدراک پری پرواز تھا مگر صاف معلوم ہوتا تھا کہ تابع ہے شریک نہیں۔ ملکہ کی شان شاہانہ تھی اور دبدبہ خسروانہ تھا۔ اگر چہ آہستہ آہستہ آتی تھی مگر استقلال رکاب پکڑے تھا اور جو قدم اُٹھتا تھا، دس قدم آگے پڑتا نظر آتا تھا۔ ساتھ اس کے جب ایک دفعہ جم جاتا تھا تو انسان کیا فرشتہ سے بھی نہ ہٹ سکتا تھا۔ دروغ دیوزاد بہروپ بدلنے میں طاق تھا۔ ملکہ کی ہر بات نقل کرتا تھا اور نئے نئے سانگ بھرتا تھا۔ تو بھی وضع اس کی گھبرائی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ دنیا ہوا وہوس ہزاروں رسالے اور پلٹنیں اس کے ساتھ لئے تھیں اور چوں کہ یہ ان کی مدد کا محتاج تھا۔ اسی لالچ کا مارا کمزور تابعداروں کی طرح ان کا حکم اُٹھاتا تھا۔ ساری حرکتیں اس کی بے معنی تھیں اور کام بھی اُلٹ پلٹ بے اوسان تھے کیوں کہ استقلال ادھر نہ تھا۔ اپنے شعبدہ بازی اور نیرنگ سازی سے فتح یاب تو جلد ہو جاتا تھا مگر تھم نہ سکتا تھا۔ ہوا وہوس اس کے یار وفادار تھے اور اگر کچھ تھے تو وہی سنبھالے رہتے تھے۔

03.06 انشائیہ ''سچ اور جھوٹ کا رزم نامہ'' کا تجزیہ

محمد حسین آزادؔ کا انشائیہ ''سچ اور جھوٹ کا رزم نامہ'' نیرنگ خیال کے حصہ اوّل میں شامل ہے۔ یہ انشائیہ انگریزی مضمون نگار جانسن (Johnson) کے مضمون "Truth,Falsehood and Fiction, an Allegory" سے ماخوذ ہے اس انشائیہ میں محمد حسین آزادؔ نے غیر مادی تصوّرات جیسے ''سچ'' اور ''جھوٹ'' کو دو بنیادی کرداروں کی شکل میں پیش کیا ہے۔ انسانی فطرتوں میں ان دو تصوّرات کی آپسی کش مکش کو ایک قصہ کا روپ دیا ہے۔ کہ کس طرح 'جھوٹ' ہمیشہ 'سچ' کو مات دینے کی کوشش کرتا ہے لیکن آخر میں سچ کی ہی فتح ہوتی ہے۔

اس انشائیہ میں سچ اور جھوٹ کو جسمانی پیکر دے کر اس کی خوبیوں اور خرابیوں کو تمثیلی پیرایے میں بہت خوب صورتی سے پیش کیا گیا ہے جیسا کہ زمانے میں جھوٹ کا عمل دُور تک پھیل گیا ہے اور سچ کو لوگ بہتر نہیں سمجھتے اور سچ کو ہر موقع پر استعمال نہیں کرتے۔ اس طرح سچ اور جھوٹ کے درمیان ہمیشہ رسہ کشی چلتی رہتی ہے۔ آخر کار سچ کی کوششوں سے جھوٹ کی قلعی کھل جاتی ہے اور وہ کامیاب ہو جاتا ہے۔

کہانی کچھ اس طرح سے ہے کہ ملکہ صداقت زمانی بیگم جو سلطان آسمانی اور دانش خاتون کی بیٹی ہے خوبیوں اور عزت و دوام کے تاج سے مرصّع ہے۔ دوسری طرف حمق تیرہ دماغ اور ماں ہوس ہوا پرست کا بیٹا دروغ دیوزاد ہے۔ یہ منافق سلطان آسمانی سے سخت عداوت رکھتا ہے۔ ملکہ صداقت زبانی کی قدر و منزلت اور خوبیاں دیکھ کر اس کے من میں حسد کی آگ بھڑک اُٹھتی ہے اور وہ ملکہ کے عمل میں خلل ڈالنے کی سوچ لیتا ہے۔ ادھر ملکہ صداقت بھی اس سے مقابلے پر اُتر آئی۔ جتنا دروغ دیوزاد حملہ کرتا ملکہ اپنے دبدبہ اور استقلال سے مقابلہ پر ڈٹی رہتی۔ مقابلے کے لئے وہ شیخی، نمود، دغا، طراری، ہوا و ہوس جیسے ساتھیوں کی مدد بھی حاصل کرتا تاہم اکثر معرکہ آرائیوں میں ملکہ ہی فتحیاب ہوتی نتیجتاً دروغ دیوزاد نے دھوکہ بازی اور شبہ کاری کا روپ بدل کر دنیا پر حملے شروع کیے اور کئی مقامات پر کامیاب بھی ہو گیا اور دروغ شاہ دیوزاد کا لقب اختیار کر کے دنیا پر حکومت کرنے لگا۔

ملکہ صداقت یہ سمجھتی تھی کہ بنی آدم اس کے آنے سے خوش ہوں گے اور ہر لمحہ اس کا ساتھ دیں گے لیکن جب دیکھا کہ ہر مقام پر فکر و فریب سے سابقہ پڑتا ہے۔ مایوس ہو کر اس سلطان آسمانی کو لکھ بھیجا کہ یہاں میری ضرورت نہیں ہے مجھے واپس بلا لیں تب سلطان آسمانی نے عالمِ بالا کے پاک نہادوں کو جمع کر کے مشاورت کی اور وجوہات پر غور کرنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچے کہ ملک صداقت زبانی کی طبیعت میں در اصل سختی اور تلخی ہے۔ سچ کا سخت رویہ سب کو برا معلوم ہوتا ہے اور اکثر سچ کی راست بازی کی وجہ سے لوگوں کو نقصان بھی اُٹھانا پڑتا ہے۔ جب کہ زمانے میں دُور اندیشی کی ضرورت ہے۔ جیسا کہ دروغ دیوزاد چالاکی سے اپنی چالیں چل جاتا ہے۔ مصلحت کا لباس زیبِ تن کرتا ہے اور کامیاب ہو جاتا ہے۔ سلطانِ آسمانی نے ملکہ کو بھی اس طرح کے مصلحتوں کا پیرہن زیبِ تن کرنے کا حکم دیا۔ چنانچہ ملکہ نے اس حکم کی تعمیل کی۔ مصلحت کا لباس پہنے ملک ملک پہنچتی اور پھر نیا جامہ اُتار پھینکتی۔ جامہ کے اُترتے ہی اس کی اصلی روشنی اور حُسن و جمال چمک اُٹھتا اور جھوٹ اپنی سیاہی کے ساتھ وہاں سے دُور ہٹ جاتا۔

محمد حسین آزادؔ کا یہ ایک خوب صورت تمثیلی انشائیہ ہے۔ جس میں بھرپور افسانویت اور ڈرامائیت پائی جاتی ہے۔ یہ انشائیہ ایک خاص مقصد کو پیش کرتا ہے کہ جھوٹ زمانہ میں کتنی کوششیں کر لے ناکام ہی رہتا ہے۔ سچ اور جھوٹ کی روز اوّل سے کش مکش ضرور رہی ہے لیکن ایک وقت ایسا ضرور آتا ہے کہ جھوٹ کو مات ہوتی ہے اور سچ غالب آجاتا ہے۔ اس طرح آزادؔ نے اس اخلاقی مسئلہ کو استعاروں کے سہارے اس

خوب صورتی سے پیش کیا کہ یہ ایک پر اثر کہانی بن گئی۔ جھوٹ کے جتنے رُخ اور جہتیں ہو سکتی تھیں ان کی طرف مضمون نگار نے بڑی کامیابی کے ساتھ متوجہ کیا ہے اور یہ آزاد کے قلم کا جادو ہی ہے کہ انہوں نے اس انشائیہ میں جو منظر کھینچا ہے وہ متحرک نظر آتا ہے۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:۔

﴿۱۹﴾ ''سچ اور جھوٹ کا رزم نامہ'' انگریزی کے کس مضمون سے ماخوذ ہے؟

﴿۲۰﴾ ''سچ'' کے کرداروں کا نام کیا ہے؟

﴿۲۱﴾ ''جھوٹ'' کو کیا نام دیا گیا ہے؟

03.07 خلاصہ

انشائیہ اردو ادب کی ایک اہم صنف ہے۔ یہ دراصل مضمون کی ایک ہی قسم ہے لیکن مضمون کے برخلاف اس میں عبارت کو سجا کر بات سے بات پیدا کی جاتی ہے۔ محمد حسین آزاد نے سب سے پہلے انشائیہ لکھے۔ اس سے قبل سرسید، ماسٹر رام چند اور مولوی ذکاء اللہ کے مضامین ملتے ہیں لیکن ان کے مضامین میں وہ شگفتگی یا استعاراتی انداز نہیں ملتا جو کہ انشائیہ کے لئے ضروری ہے۔

محمد حسین آزاد اردو کے نامور انشاپرداز ہیں۔ ان کا شمار اردو کے عناصرِ خمسہ میں ہوتا ہے۔ وہ ایک صاحبِ طرز ادیب ہیں وہ جس موضوع پر بھی قلم اُٹھاتے ہیں اپنی شگفتہ بیانی سے اسے دل چسپ بنا دیتے ہیں۔ نثر میں ان کی متعدّد کتابیں اردو ادب میں شاہ کار کا درجہ رکھتی ہیں۔ خاص کر ان کے انشائیوں کا مجموعہ ''نیرنگِ خیال'' ان کی شگفتہ اُسلوب کی بہترین یادگار ہے۔ آزاد اردو شاعری کی تاریخ میں بھی خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ ''انجمنِ پنجاب'' کے قیام کے بعد سے انہوں نے مختلف موضوعات پر نظمیں لکھ کر اردو شاعری کو ایک نئی جہت عطا کی اور غزل کو بھی کافی فروغ دیا۔

آزاد کے انشائیہ کا مجموعہ ''نیرنگِ خیال'' دو حصّوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصّے میں آٹھ اور دوسرے حصّے میں پانچ مضامین ہیں۔ آزاد نے انگریزی مضمون نگاروں اڈیسن اور جانسن کے مضامین پڑھوا کر سنے اور اس سے استفادہ کر کے اردو میں انشائیہ لکھے۔ ان کے انشائیوں کی خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے تمثیلی انداز اختیار کیا اور غیر مادی صفات اور اشیاء کو مادی پیکر عطا کر کے بڑے ہی خوب صورتی سے قصہ کے انداز میں پیش کیا۔

ان قصوں میں ڈرامائیت کی بنا پر دل چسپی قائم ہو جاتی ہے۔ ان کے انشائیہ ایک خاص مقصد کے پیش نظر لکھے گئے کہ لوگ برائیوں کو سمجھیں اس سے دُور رہیں اور اپنی زندگی سنوار لیں۔ بنیادی طور پر ان کے انشائیوں میں یہی اخلاقی نقطۂ نظر غالب رہا۔ ''انشائیہ سچ اور جھوٹ کا رزم نامہ'' اس مقصد کو پورا کرتا ہے۔

03.08 فرہنگ

استقلال	: مستقل مزاج	راستی	: مسیحائی، ایمانداری
انشاءپرداز	: مضمون نگار، ادیب	سانگ	: نقل، اداکاری، بہروپ
تاج مرصع	: جواہر جڑا ہوا تاج	شاہ کار	: سب سے بڑا کارنامہ

تخیل	:	تصور، خیال	طراری	:	تیزی، چالاکی
تفریح طبع	:	دل بہلاوا، دل لگی	قلعی	:	روغن، رنگ
تمسخر	:	ہنسی، مزاق	ماخوذ	:	اخذ کیا گیا
خلعت	:	وہ پوشاک جو بادشاہ یا امراء کی طرف سے بطور عزت افزائی ملے	مادی	:	قدرتی، طبعی، اصلی
			متنفر	:	نفرت کرنے والا
دانائی	:	عقل، دانش	منافق	:	ریاکار، نفاق رکھنے والا

03.09 : نمونہ امتحانی سوالات

الف: درجِ ذیل سوالوں کے جوابات ۱۰/۱۰ سطروں میں دیجیے:

سوال نمبرا محمد حسین آزادؔ کے حالاتِ زندگی قلم بند کیجیے۔

سوال نمبر۲ محمد حسین آزاد کی ادبی خدمات کا سرسری جائزہ لیجیے۔

سوال نمبر۳ تمثیل یا رمزیہ (Allegory) سے کیا مراد ہے؟ بیان کیجیے۔

ب: درجِ ذیل سوالوں کے جوابات ۳۰/۳۰ سطروں میں دیجیے:

سوال نمبرا محمد حسین آزادؔ کی انشائیہ نگاری پر مفصل نوٹ لکھیے۔

سوال نمبر۲ محمد حسین آزادؔ کی حیات اور ادبی خدمات کا جائزہ لیجیے۔

سوال نمبر۳ ''سچ اور جھوٹ کا رزم نامہ'' کا خلاصہ لکھتے ہوئے اس انشائیہ کے مرکزی خیال کی وضاحت کیجیے۔

03.10 حوالہ جاتی کتب

۱۔ اردو مضمون کا اِرتقا از ڈاکٹر سیدہ جعفر

۲۔ انشائیہ اور انشائیے از سید محمد حسنین

۳۔ محمد حسین آزادؔ حیات اور تصانیف از ڈاکٹر اسلم فرخی

۴۔ نیرنگ خیال از محمد حسین آزاد

03.11 اپنے مطالعے کی جانچ کے جوابات

﴿۱﴾ ۱۸۰۳ء

﴿۲﴾ اردو اخبار

﴿۳﴾ ابراہیم ذوقؔ

﴿۴﴾ میجر فلر اور کرنل ہالرائیڈ

﴿۵﴾ شمس العلما

﴿۶﴾ ۱۹۱۰ءمیں

﴿۷﴾ جدید شاعری

﴿۸﴾ قصصِ ہند

﴿۹﴾ نیرنگِ خیال

﴿۱۰﴾ تاریخ ہند

﴿۱۱﴾ سیرِ ایران

﴿۱۲﴾ آبِ حیات

﴿۱۳﴾ نظم آزاد

﴿۱۴﴾ پنڈت من پھول

﴿۱۵﴾ نیرنگِ خیال

﴿۱۶﴾ ۱۸۸۱ءمیں

﴿۱۷﴾ سب رَس

﴿۱۸﴾ Johnson اور Addison

﴿۱۹﴾ Truth, Falsehood and Fiction, an Allogery

﴿۲۰﴾ ملکہ صداقت زمانی بیگم

﴿۲۱﴾ دروغ دیوزاد

✲

اکائی 04　دیہات کی زندگی : عبدالحلیم شرر

ساخت

04.01 : اغراض ومقاصد
04.02 : تمہید
04.03 : عبدالحلیم شرؔر کے حالاتِ زندگی
04.04 : عبدالحلیم شرؔر کی انشائیہ نگاری
04.05 : انشائیہ ''دیہات کی زندگی'' کا متن (اقتباس)
04.06 : انشائیہ ''دیہات کی زندگی'' کا تنقیدی جائزہ
04.07 : خلاصہ
04.08 : فرہنگ
04.09 : نمونہ امتحانی سوالات
04.10 : حوالہ جاتی کتب
04.11 : اپنے مطالعے کی جانچ کے جوابات

04.01　اغراض ومقاصد

اس اکائی میں آپ عبدالحلیم شرؔر کے انشائیہ ''دیہات کی زندگی'' کا تفصیل سے مطالعہ کریں گے۔ اس میں انشائیہ کی تعریف، اس کی خصوصیات اور اس کی زبان واُسلوب سے متعلق پہلوؤں پر روشنی ڈالی جائے گی۔ زیرِنظر اکائی کی مطالعہ سے آپ عبدالحلیم شرؔر کی حیات، ان کی ادبی خدمات، ان کی انشائیہ نگاری اور خاص طور سے ان کے انشائیہ ''دیہات کی زندگی'' میں پیش کیے گئے خیالات اور ان کی زبان واُسلوب کے بارے میں واقفیت حاصل کرسکیں گے۔

04.02　تمہید

انشائیہ (Light Essay) اردو نثر کے ایک اہم صنف ہے۔ جس کی کوئی مخصوص ہیئت نہیں ہوتی اور نہ ہی موضوع اور مواد کے لحاظ سے ہی اس کے کوئی حد یا زاویہ متعیّن ہوتا ہے۔ انشائیے میں ہر طرح کے خیالات کو پیش کیا جاسکتا ہے لیکن شرط یہ ہے کہ مصنّف اپنی تحریر کو بوجھل اور خشک نہ ہونے دے بلکہ وہ زبان وبیان کی تازگی اور اُسلوب کی دل کشی اور رنگارنگی کے ذریعے قاری کو گدگدائے اور اسے لطف و لذّت سے ہمکنار کرے۔ اردو کے نمائندہ انشائیہ نگاروں میں محمد حسین آزؔاد، رتن ناتھ سرشؔار، عبدالحلیم شرؔر، فرحت اللہ بیگ، خواجہ حسن نظامی، ناصر دہلوی، نیاز فتح پوری، پطرس بخاری، ابوالکلام آزؔاد، رشید احمد صدیقی اور مشتاق احمد یوسفی وغیرہ کے نام خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔

04.03 عبدالحلیم شرؔر کی حالات زندگی

عبدالحلیم شرؔر کی پیدائش ۱۰ر جوری ۱۸۶۰ء کو لکھنؤ کے ایک متمول گھرانے میں ہوئی تھی۔ان کا خاندان علمی و تعلیمی اعتبار سے کافی اہمیت رکھتا تھا۔ان کے والد کا نام تفضّل حسین تھا۔شرؔر کے نانا منشی قمرالدین کا تعلق اودھ کے شاہی دربار سے تھا۔جب ۱۸۵۶ء میں انگریزوں نے ریاستِ اودھ کا الحاق کرلیا اور واجد علی شاہ کو لکھنؤ سے کلکتہ لے گئے تو منشی قمرالدین بھی واجد علی شاہ کے ساتھ کلکتہ گئے اور ان کے ساتھ مٹیا برج میں رہنے لگے۔بعد میں شرؔر کے والد تفضّل حسین بھی منشی قمرالدین کے توسط سے کلکتے میں واجد علی شاہ کے خاص ملازموں میں شامل ہو گئے۔اگر چہ شرؔر کو بچپن ہی میں ان کے نانا لکھنؤ میں اپنے بڑے بھائی مولوی حفیظ الدین کے مکتب میں داخل کرادیا تھا، جہاں سے ان کی ابتدائی تعلیم شروع ہوئی لیکن بعد کو ان کے والد اور نانا نے شرؔر کو بھی کلکتہ بلالیا۔جہاں انہوں نے عربی اور فارسی کی باضابطہ تعلیم حاصل کی۔

عبدالحلیم شرؔر کو بچپن ہی سے پڑھنے لکھنے کا شوق تھا۔کلکتے میں والد اور نانا کی نگرانی میں ان کی تعلیمی ذوق وشوق اور نکھرتا گیا۔کلکتے میں شرؔر کو درباری ماحول اور شہزادوں کی صحبت ملی جہاں عیش وعشرت کی تمام سہولتیں میسر تھیں۔اس ماحول نے شرؔر کے ذہن کو رنگین مزاجی کی طرف مائل کیا لیکن اس ماحول سے متاثر ہونے کے باوجود انہیں نے اپنے علمی ذوق وشوق کو برقرار رکھا۔کلکتے میں قیام کے دَوران شرؔر کی دل چسپی مذہبی تعلیم میں بھی بڑھی۔کلکتہ کے ایک بزرگ عالم محمد تقی اور دیگر علما کی صحبتوں سے انہوں نے خوب فیض حاصل کیا۔مذہبی تعلیم کے حصول کا ذوق کلکتے سے واپس لکھنؤ آنے کے بعد بھی برقرار رہا۔لکھنؤ میں خاص طور سے مولانا عبدالحی اور مولانا حامد حسین کی علمی لیاقت نے شرؔر کے علمی ذوق کو اور فروغ دیا۔

۱۸۷۹ء میں لکھنؤ کے ہی ایک علمی گھرانے میں شرؔر کی شادی ہوگئی۔شادی کے بعد شرؔر کچھ دنوں کے لئے دہلی چلے گئے اور وہاں بھی اپنے علم کی پیاس کو بجھانے میں مصروف رہے۔دہلی میں ہی مولانا نذیر حسین کی شاگردی میں شرؔر مضمون نگاری کی طرف مائل ہوئے اور پھر ان ہی کی توسط سے شرؔر کی ملاقات منشی احمد علی کسمنڈوی سے ہوئی۔منشی احمد علی کسمنڈوی نے مضمون نگاری کے سلسلے میں شرؔر کی نہ صرف تربیت کی بلکہ ان کی صلاحیت اور دل چسپی کو پروان چڑھانے میں بھی اہم کردار ادا کیا۔

مضمون نگاری کے شوق نے ہی شرؔر کو لکھنؤ کے ''اودھ اخبار'' سے وابستہ کیا، جہاں انہوں نے سب ایڈیٹر کی حیثیت سے ملازمت اختیار کرلی۔شرؔر نے اودھ اخبار میں مختلف موضوعات پر لاتعداد مضامین لکھے جس سے ان کی شہرت میں روز بروز اضافہ ہوتا گیا ساتھ ہی ان کے ادبی جوہر کو نکھرنے کا بھی خوب خوب موقع ملا۔اسی زمانے میں شرؔر نے مولانا عبدالباسط کے نام سے ایک رسالہ نکالا جس کا نام ''محشر'' رکھا لیکن دو سال بعد ''اودھ'' اخبار کے مالک منشی نول کشور نے ان کو خاص نامہ نگار بنا کر حیدرآباد بھیج دیا جس کے سبب ''محشر'' کو بند کرنا پڑا۔

اودھ اخبار سے شرؔر کی ملازمت کا رشتہ کچھ عرصے بعد ختم ہوگیا تو شرؔر بے روزگار ہوگئے لیکن جلد ہی منشی نثار حسین جو رسالہ ''پیامِ یار'' کے مدیر تھے، ان کی تحریک پر شرؔر ناول نگاری کی طرف مائل ہوئے اور پہلا ناول ''دل چسپ'' لکھا۔اس ناول کی مقبولیت نے ان کے حوصلے کو تقویت عطا کی۔شرؔر اس درمیان انگریزی زبان سیکھنے کی طرف بھی مائل ہوئے۔انگریزی زبان نے شرؔر کو ناول نگاری کی فن سے آگاہی بخشی۔انہوں نے بنگلہ ناول ''درگیش نندنی'' کے انگریزی ترجمہ کو اردو میں ''زمیندار کی بیٹی'' کے نام سے منتقل کیا۔اس ناول کی اشاعت نے شرؔر کی شہرت میں اور اضافہ کیا۔اسی دَوران مولوی بشیر الدین کے مشورے اور تحریک پر شرؔر نے اپنا رسالہ ''دلگداز'' نکالنا شروع

کیا۔ جو اپنے عہد کا ایک اہم اور معیاری ادبی رسالہ تھا۔ اس رسالے کی مقبولیت نے شرؔر کی ادبی و علمی حیثیت کو نہ صرف چار چاند لگایا بلکہ ان کی مالی حالت کو بھی مستحکم بنا دیا۔ ''دلگداز'' کی آمدنی سے خود انہوں نے اپنا پریس بھی قائم کر لیا اس کے بعد شرؔر نے مڑ کر کبھی پیچھے نہیں دیکھا اور یکسوئی کے ساتھ انہوں نے یکے بعد دیگرے بڑی تعداد میں ناول، مضامین، انشائیے لکھنے کے علاوہ تاریخ اور سوانح وغیرہ پر بھی متعدّد کتابیں لکھیں۔

شرؔر نے انگلستان کا سفر بھی کیا اور وہیں دَورانِ قیام فرانسیسی زبان بھی سیکھی۔ وہ ایک جہاں دیدہ انسان تھے اور اعلیٰ علمی وادبی ذوق رکھنے کے ساتھ ساتھ پختہ عصری شعور کے بھی حامل تھے۔ مشرقی روایتوں اور اپنی تہذیب وثقافت سے انہیں گہرا لگاؤ تھا۔ اس لئے ان کی حفاظت کے لئے زندگی بھر اپنے قلم کے ذریعے کوشاں رہے۔ ان کے اندر قومی جذبہ اور وطن پرستی کا مادہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ انہوں نے اپنی تحریروں اور تخلیقات کے ذریعے عوام کے دلوں میں بھی قومی اور وطنی جذبے کو بھرنے کی خوب کوشش کی۔

عبدالحلیم شرؔر تقریباً چالیس سال تک ادب اور صحافت کے میدان میں سرگرم رہے۔ وہ اپنے عہد کے ممتاز ادیب اور دانش وَر تھے۔ ان کی تحریریں اور تصانیف ان کی علمی قابلیت اور لیاقت کا بین ثبوت ہیں۔ اپنی عمر کی آخری منزل میں بھی شرؔر علمی وادبی سرگرمیوں میں مصروف رہے۔ وہ اردو زبان وادب کے ایک اہم سپاہی اور بے لوث خادم تھے۔ اردو کے دامن کو بے شمار جواہر پاروں سے مالا مال کرنے والا یہ خادم ۷۰/برس کی عمر میں ۱۰/جنوری ۱۹۲۶ء کو لکھنؤ ہی میں اس دارِفانی سے رخصت ہوا۔ شرؔر کی علمی وادبی خدمات کو اردو زبان وادب کی تاریخ کبھی فراموش نہیں کر سکے گی۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:۔

﴿۱﴾ عبدالحلیم شرؔر کی پیدائش کب اور کہاں ہوئی تھی؟

﴿۲﴾ عبدالحلیم شرؔر کے والد گرامی کا نام کیا تھا؟

﴿۳﴾ عبدالحلیم شرؔر کے نانا منشی قمرالدین کس ریاست کے دربار سے وابستہ تھے؟

﴿۴﴾ عبدالحلیم شرؔر نے شروع میں کس اخبار میں ملازمت کی تھی؟

﴿۵﴾ عبدالحلیم شرؔر کے رسالے کا نام کیا تھا؟

عبدالحلیم شرؔر نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز گرچہ مضمون نگاری سے کیا اور خاص طور سے اودھ اخبار میں شائع ہونے والے ان کے مضامین اپنے موضوعات اور زبان وبیان کے سبب کافی مقبول ہوئے لیکن جلد ہی انہوں نے ناول نگاری کو اپنا خاص میدان بنا لیا ان کا پہلا ناول ''دل چسپ'' ۱۸۸۴ء سے ۱۸۸۵ء کے درمیان شائع ہوا جس سے ان کی مقبولیت کا ایک نیا باب کھلا اور پھر یکے بعد دیگرے انہوں نے کئی اہم ناول تخلیق کیے۔ خاص طور سے تاریخی ناول نگاری میں کوئی بھی ان کا ثانی نظر نہیں آتا۔ انہوں نے ایک اہم رسالہ ''دلگداز'' بھی نکالا اور مختلف موضوعات پر مضامین اور ناول لکھنے کے علاوہ تاریخی اور سوانحی کتابیں بھی لکھیں جن میں ''تاریخِ سندھ'' اور ''تاریخِ عزیزِ مصر'' خاص طور سے اہمیت رکھتی ہیں۔

عبدالحلیم شرؔر کے ناولوں میں ''دل چسپ، ملک العزیز ورجینا، حسن انجلینا، منصور موہنا، فلورا فلورنڈا، ایامِ عرب، فردوسِ بریں، شوقین ملکہ، فتحِ اندلس، زوالِ بغداد، رومۃ الکبریٰ، حسن کا ڈاکو، خوف ناک محبت، بابک خرمی'' اور ''مینا بازار'' بطورِ خاص قابلِ ذکر ہیں۔

عبدالحلیم شرؔر کی شناخت اردو ادب میں خاص طور سے ایک تاریخی ناول نگار کی حیثیت سے ہوتی ہے۔ انہوں نے اردو میں تاریخی ناول نگاری کی بنیاد ڈالی اور اس کی روایت کو پروان چڑھایا۔ اسی مناسبت سے انہیں اردو کا والٹر اسکاٹ بھی کہا جاتا ہے۔ ''ملک العزیز ورجینا'' شرؔر کا پہلا تاریخی ناول ہے جس کی تخلیق انہوں نے انگریزی کے مشہور تاریخی ناول نگار والٹر اسکاٹ کے ناول ''طلسمات'' کے جواب میں کی تھی۔ اس ناول کی اشاعت سے بطور تاریخی ناول نگار شرؔر کا سکہ ایسا جما کہ آج تک اردو ناول نگار پر اس سکہ کی چھاپ موجود ہے۔ اس کے بعد شرؔر نے تاریخی ناول نگاری کو ہی اپنا خاص میدان بنالیا اور تقریباً دو درجن تاریخی ناول لکھے جنہیں بے پناہ مقبولیت حاصل ہوئی۔

تاریخی ناولوں کے علاوہ عبدالحلیم شرؔر نے کئی معاشرتی ناول بھی لکھے، جن میں شرؔر کے اور اس معاشرے کی تہذیبی وسماجی صورتِ حال کی عمدہ ترجمانی ملتی ہے۔ جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا۔ ناولوں کے علاوہ مضمون نگاری اور انشائیہ نگاری وغیرہ میں بھی شرؔر نے ایک خاص مقام حاصل کیا۔ انہوں نے ڈرامے اور نظم کے میدان میں بھی طبع آزمائی کی، خاص طور سے نظم معریٰ کی بنیاد گزاروں میں شرؔر کا نام خاص اہمیت رکھتا ہے۔

شرؔر کا تخلیقی سفر ۱۸۸۴ء یا ۱۸۸۵ء سے شروع ہو کر ۱۹۲۶ء تک جاری رہا۔ انہوں نے اس مدت میں بے شمار کتابیں، مضامین اور انشائیہ لکھ کر اردو ادب کے دامن کو مالا مال کیا۔ ان بیش بہا ادبی خدمات کی بنا پر شرؔر کا نام اردو ادب کی تاریخ میں ہمیشہ زندہ و تابندہ رہے گا۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:۔

﴿۶﴾ عبدالحلیم شرؔر کے پہلے ناول کا نام بتایئے۔

﴿۷﴾ عبدالحلیم شرؔر کو مغرب کے کس ادیب کے مماثل کہا جاتا ہے؟

04.04 عبدالحلیم شرؔر کی انشائیہ نگاری

عبدالحلیم شرؔر بنیادی طور پر ناول نگار تھے۔ انہوں نے اردو میں تاریخی ناول نگاری کی بنیاد ڈالی۔ اس میدان میں انہیں کافی شہرت و مقبولیت حاصل ہوئی لیکن انہوں نے انشائیہ نگاری کے میدان میں بھی اپنے قلم کا خوب جادو جگایا اور خوب داد وصول کی۔ شرؔر نے اپنے رسالہ ''دلگداز'' میں مختلف مسائل اور موضوعات پر بڑی تعداد میں انشائیہ لکھے جنہیں کافی پسند کیا گیا۔ ان کے نمائندہ اور مقبول انشائیوں میں ''نہیں''، ''نسیمِ سحر''، ''صحبتِ برہم''، ''عمرِ رفتہ''، ''دیہات کی زندگی''، ''لالۂ خودرو'' اور ''ہم تم اور وہ'' خاص طور سے اہمیت رکھتے ہیں۔

عبدالحلیم شرؔر انشائیوں کے خاص صفت فکر کی رنگارنگی اور زبان و بیان کی تازگی ہے۔ ان کے انشائیہ لطیف انداز میں قاری کے فکر و احساس کو بیدار کرتے ہیں۔ وہ قاری کو لطف اور جمالیاتی سُرور عطا کرنے کے ساتھ ساتھ اس کی حِس کو بھی گدگداتے ہیں۔ ان کا انشائیہ ''دیہات کی زندگی'' انہی خوبیوں کا حامل ہے۔

04.05 انشائیہ ''دیہات کی زندگی'' کا متن (اقتباس)

اے شہروں کے عالیشان محلوں میں رہنے والوں! تمہیں نہیں معلوم کہ دیہات والے دنیا سے کیا لطف اُٹھاتے ہیں۔ تم ایک منزل عشرت میں ہو۔ عالم کی نیرنگیاں تمہاری نظر سے بہت کم گزرتی ہیں۔ جس مقام پر تم ہو وہاں صبح و شام کی مختلف کیفیتیں بھی اپنا پورا پورا اثر نہیں دکھاسکتیں۔ خبر بھی نہیں ہوتی کہ آفتاب کب نکلا اور کب غروب ہوا۔ ہوا کس طرف کی چلی اور کیا بہار دکھا گئی مگر غریب دیہات والے جنہیں تم نے اکثر ذلت کی نظر سے دیکھا ہوگا، وہ ان امور کا ہر وقت اندازہ کرتے رہتے ہیں۔ ہر صبح انہیں ایک نیا لطف دکھاتی ہے اور ہر شام سے انہیں ایک نئی راحت نصیب ہوتی ہے۔

گاؤں کے جفاکش رہنے والے صبح ہونے سے پہلے ہی نیند کا پورا مزہ اُٹھا چکتے ہیں۔ صبح کے تارے ہنوز جھلملانے بھی نہیں پاتے ہیں اور وہ اپنی رات کی ضروری راحت سے اُکتا چکتے ہیں۔ ایسے وقت میں نسیمِ سحر کی خوش گوار اور نازک جھونکے آتے ہیں اور بڑے ادب سے انہیں جگانے لگتے ہیں۔ اس وقت ان کے ناز اور بادِ سحر کے نیاز دیکھنے کے قابل ہوتے ہیں۔ صبح کی ہوا نہایت شگفتگی کے ساتھ جگاتی ہے اور وہ نہیں جاگتے صرف کروٹیں بدل بدل کر رہ جاتے ہیں۔...... صبح کے نقیب مرغانِ سحر اُٹھتے ہیں اور انہیں اُٹھاتے ہیں۔ غریب محنت پسند لوگ تازہ دَم اُٹھ بیٹھتے ہیں۔ وقت کی کیفیتوں کو نہایت غور سے اور بڑے لطف کے ساتھ دیکھتے ہیں۔ ان کا پہلا کام ہوتا ہے کہ جھونپڑوں سے باہر نکلے۔ آسمان کو دیکھا جس میں تارے جھلملا رہے تھے۔ اُفق مشرق کی روشنی پر نظر ڈالی جو رات بھر کے چمکے ہوئے تاروں پر غالب آتی جاتی تھی کچھ کچھ نمودار ہونے والے درختوں کو دیکھا جن پر چڑیاں چہچہا رہی تھیں۔ یہ سماں اپنی خوبیاں دکھا کر انہیں بے خود کرنے کو تھا کہ انہوں نے اپنے دن کے کام کو یاد کیا اور آگے بڑھے اور رات کی دَبی ہوئی آگ پر گری پڑی پتیاں جمع کر کے آگ جلائی۔ تاپ تاپ کر افسردہ ہاتھ پاؤں کو گرمایا۔ اس کے بعد پاس کے شکستہ جھونپڑے میں جا کے بَیل کھولے اور عین اس وقت جب کہ آفتاب کی کھڑی کھڑی کرنیں مشرقی کنارے آسمان سے اوپر کو چڑھتی نظر آتی تھیں۔ یہ لوگ لمبے لمبے ہلوں کو کندھے پر رکھ کر کھیت کی طرف روانہ ہوئے۔ کھیتوں کے مینڈوں پر جا رہے ہیں اور زمین کی فیاضیوں کو کس مسرت اور خوشی کی نظر سے دیکھتے جاتے ہیں۔ ہرے ہرے کھیت ٹھنڈی ہوا کے چلنے سے لہرا رہے ہیں۔ نظر اس خوش گوار سبزے سے عجیب لطف کے ساتھ کھیلتی ہوئی دُور تک چلی جاتی ہے چھوٹے چھوٹے پودے جو خدا کے پاس سے دنیا والوں کی روزی لے کر آئے ہیں کس قدر شگفتہ اور بشاش نظر آتے ہیں۔ رات کا برقع اُڑھا کر آسمان نے انہیں اور خوب صورت بنا دیا ہے۔ کیوں کہ تاروں کی چھاؤں میں اس وقت ان کی نازک اور چھوٹی پتیوں پر شبنم کے موتی جھلک رہے ہیں۔ ایک عالَم جواہر ہے جس پر جھلملاتے ہوئے تاروں کی شعاعیں خدا جانے کیا کیفیت دکھا رہی ہیں۔ کیاریاں کیا ہیں؟ کسی رات کی بے تکلفی کا صدمہ اُٹھاتے ہوئے سراپا ندامت حورِوش کا پسیجا ہوا چہرہ ہیں۔ جس پر سے پسینے کی طرح شبنم کی قطرے ٹپک ٹپک کر گر رہے ہیں۔ ان جفاکشوں نے اس وسیع میدان کو نہایت شوق سے دیکھا جو اس وقت تو صرف ان کی نظر ہی کو خوش کرتا ہے مگر اصل میں قدرت کے ہدیہ اور نیچر کے تحفے ہر جان دار کو اسی کی فیاضیوں سے ملتے ہیں۔ یہ لوگ کھیتوں میں پہنچ کر اپنی غفلت پر نادِم ہو گئے کیوں کہ اور لوگ ان سے پیشتر پہنچ چکے تھے۔

یہ سب لوگ تر و تازہ کھیتوں میں منتشر ہو گئے۔ آفتاب کی کرنوں نے جو امیر و غریب سب کو ایک نظر سے دیکھتی ہیں کھیتوں کی مینڈوں پر اور کنوؤں کے کناروں پر ان کا خیر مقدم ادا کیا۔ اب یہ لوگ اپنے کام میں اس قدر مصروف ہیں کہ نیچر کے جذبات بھی ان پر اپنا اثر

نہیں ڈال سکتے اور قدرت کی بہار بھی ان کی دل فریبی کرنے سے عاجز ہے۔ وہ ہراہرا سبزہ زار، وہ سہانا سماں، وہ صبح کی بہار، وہ تروتازہ ہوا، وہ اُجلی کرنیں ایسی چیزیں ہیں جن کا شوق اکثر بے چین طبیعت والوں کو شہروں سے باہر کھینچ لے جایا کرتا ہے۔ ان کو یاد کرتے ہی بار ہا ہم پر ایسی وحشت سوار ہوتی ہے کہ گھر سے دو دو تین کوس تک نکل گئے ہیں مگر یہ لوگ اپنے روزانہ کاموں میں ایسے مصروف ہیں کہ ان کیفیتوں کو آنکھ اُٹھا کر نہیں دیکھتے۔ زمین کی استعداد بڑھانے میں دل جان سے مساعی ہیں جو صرف ان کے لئے نہیں تمام دنیا کے لئے مفید ہے۔ جان توڑ توڑ کر محنت کر رہے ہیں۔ غریب کم قوت بیل جو شاید رزق رسانیِ عالم کی فکر میں دُبلے ہو گئے ہیں، ان کے ہاتھوں کی مار کھاتے ہیں اور زمین کو پیداوار کے قابل بناتے چلے جاتے ہیں۔ اپنی محنت آسان کرنے کے لئے یہ لوگ نہایت دردناک آواز میں کچھ گاتے جاتے ہیں اور ان کی آواز کھلے میدان میں گونج گونج کر ایک نئی کیفیت پیدا کرتی جاتی ہے۔ کنویں کے کنارے والے پانی نکال نکال کر زمین کو سیراب اور چھوٹے چھوٹے درختوں کو زندہ کر رہے ہیں۔ دیکھو وہ کس شوق سے اس بات کے منتظر ہیں کہ ڈول اُوپر آئے اور اُنڈیلیں اور جس وقت ڈول ان کے ہاتھ میں آجاتا ہے کس جوش کے عالم میں چلا اُٹھتے ہیں ''اللہ دین'' پانی ان کی بڑی دولت ہے جس کی اُمید میں وہ آرزومند بن کر کبھی آسمان کو دیکھتے ہیں اور کبھی کنویں کی طرف رُخ کرتے ہیں۔ آفتاب پوری طرح بلندی پر پہنچ کر نیچے کی طرف مائل ہوتا ہے اور جھکتے جھکتے اُفق مغرب کے پہنچتے وقت باغِ عالم کی دل چسپیوں سے رخصت ہونے کے خیال میں زَرد پڑ جاتا ہے۔ خلاصہ یہ کہ آفتاب کی حالت اور وضع میں اختلاف ہو جاتے ہیں مگر یہ نہ تھکنے والے اور دھن کے پکے دہقان ایک ہی وضع اور ایک ہی وقت سے اپنا کام کیے جاتے ہیں نہ محنت انہیں تھکاتی ہے نہ مشقت انہیں ماند کرتی ہیں۔ نہ دھوپ سے پریشان ہوتے ہیں نہ کام سے اُکتاتے ہیں۔ الغرض آفتاب غروب ہوتا ہے۔ دن ان سے رخصت ہوتا ہے اور یہ شام کی دل فریب کیفیتوں کا لطف بخوبی دیکھ کر یہ اُمید لگا کے کہ کل کھیتوں کو آج سے زیادہ تروتازہ پائیں، اپنے کھیتوں سے رخصت ہوتے ہیں۔ خوش خوش اس کچے اور کم حیثیت گھر میں آتے ہیں...... بی بی غریبی کا کھانا اور فصل کی مناسب غذا ان کے سامنے لا کے رکھ دیتی ہے اور یہ تہِ دل سے خدا کا شکر یہ ادا کر کے کھاتے ہیں اور دوسرے دن کی محنت کا خیال کر کے اپنے تئیں سویرے ہی سلا دیتے ہیں۔ یہ وہ وقت ہے جس وقت شہروں کے پہروں چڑھے تک سونے والے سیہ کار اپنی شرم ناک زندگی کے برے نمونے دکھانے کے لئے جاگتے ہوتے ہیں۔ زاہد نمازِ عشاء پڑھ کر سو چکا ہے، بےفکرے گپیں اُڑا رہے ہیں۔ شعرا مضمون آفرینی کی فکر میں ہیں۔ اُمرا کے محلوں میں کھانے کا اہتمام ہوتا ہے۔ بچے کہانیاں سن رہے ہیں۔ طلبا کتاب پر جھکے ہوئے ہیں۔ مے کش وہ پیاس بجھا رہے ہیں جو کمبخت نہیں بجھتی۔ سیہ کار بدکاری کی دھن میں شہر کی سڑکیں اور گلیاں چھان رہا ہے اور یہ جفاکش عجیب میٹھی نیند میں غافل ہو گئے ہیں تا کہ تڑکے آنکھ کھلے۔ یہ پچھلا اطمینان اور یہ سچی آسائش بے شک حسد کے قابل ہے۔

دیہات کی کنواری لڑکی اپنے خیالات اور اپنے ارادوں اور اپنے حرکات وسکنات غرض ہر حیثیت سے پاک دامن اور باعفت ہے۔ اس کا حُسن اس کی سادگی ہے اس کی خوبیاں اس کے کام کاج ہیں۔ صبح کو اُٹھتے ہی وہ دھان کوٹنا شروع کرتی ہے اور گھر بھر کی ضرورت کے موافق چاول تیار کر لیتی ہیں۔ گیہوں پچھوڑ کر آٹا پیستی ہے اور بڑی شگفتگی اور خوشی کے ساتھ ماں کا ہاتھ بٹاتی ہے اور اس سے اس امر کا موقع روز دیتی ہے کہ گھر کے آدمیوں کے لئے کھانا پکائے۔ قدرت کا قیمتی اور سادہ ہدیہ یعنی دودھ دَہی معمولاً اسے بافراط ملا کرتا ہے اسے وہ بڑی مسرّت کے ساتھ خدا کا شکریہ ادا کر کے اپنی غذا میں شریک کرتی ہے۔ ہماری طرح اس دولت میں وہ خود غرضی نہیں کرتی بلکہ پڑوس والوں کو بھی اس میں شریک کرتی ہے۔ یہ کام اسے اتنی بھی فرصت نہیں دیتے کہ اپنے حُسن کی قدر کرے۔ خدا نے اسے جیسا حُسن دیا ہے اس کو ویسا ہی

باقی رکھتی ہے نہ دنیاوی تکلّفات کی اسے خبر ہے اور نہ ان کو پسند کرتی ہے۔ کبھی کبھی سادہ اور بھدا زیور اس کے حُسن کے بڑھانے میں کام آ جاتا ہے مگر شہر کی وضع دار اور حُسن فروش لڑکیوں کی طرح اس پر وہ کچھ غرور اور ناز نہیں کرتی۔ اس کی نظر میں ہاتھ پاؤں اس کے حُسن عالمِ فریب سے زیادہ قیمتی ہیں۔ وہ جانتی ہی نہیں کہ ادا کیا چیز ہے اور غمزدہ کسے کہتے ہیں۔ اسے خبر نہیں کہ اس کے حُسن کا کیا اثر ہو سکتا ہے اور اس سے کیوں کر کام لے۔ اسی سبب سے وہ اپنے باپ کی خادمہ ہے۔ اپنی ماں کی فرماں بردار ہے اپنے بھائیوں کی مطیع ہے اور ایک روز اپنے شوہر کی لونڈی ہو جائے گی۔ بے عصمتی کی اسے ہوا بھی نہیں لگی ہے۔ شہر سے سیہ کار بدمعاش کی نظر سے اس کا پیارا خوب صورت چہرہ چھپا ہوا ہے۔ بری نظر سے دیکھنے والوں کی جال میں وہ نہ پھنسی ہے اور نہ پھنسے گی۔ اسے حیرت ہوتی ہے کہ شہر کی لڑکیاں کیوں بدمعاشوں کی پھندے میں پھنس جایا کرتی ہیں۔ اپنے باپ کی طرح وہ بھی رات میں سویرے ہی سو رہتی ہے۔ اس کے گھر میں مغلانی یا اس قسم کی ساتھ کی لڑکیاں بھی نہیں جن کی زبانی پیال پر لیٹ کے سوتے وقت وہ بدکاری کا جوش پیدا کرنے والی حُسن و عشق کی کہانیاں سنا کرے۔ وہ اپنی محبت کی داستان اپنے دل سے کہتی ہے اور آپ ہی سنتی ہے۔ چوں کہ کل کے کاموں کا خیال آ جاتا ہے اس لئے لیٹتے ہی سو جاتی ہے۔ اس کے پیارے نازک خوب صورت اور دنیا بھر سے زیادہ بھولے چہرے کی شگفتگی اور افسردگی فصل کی عمدگی اور خرابی پر منحصر ہے۔ فضول میلے اسے خوش نہیں کر سکتے ناچ رنگ میں اس کا دل نہیں لگتا۔ گانا نہ خود جانتی ہے اور نہ کچھ اس کا ذوق ہے بلکہ اس کو اور کے گھر کو اس روز پوری خوشی ہے جس روز نیا غلہ اور نئی فصل کا تحفہ پرانے مٹی کے برتنوں میں اس کے سامنے لا کے رکھا جائے۔

04.06 انشائیہ ''دیہات کی زندگی'' کا تنقیدی جائزہ

انشائیہ ''دیہات کی زندگی'' میں عبدالحلیم شؔرر نے دیہات کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔ دیہات کی زندگی سادگی، صداقت اور فطری پن سے عبارت ہوتی ہے۔ شہر کی زندگی کے برعکس دیہات میں لوگ فطرت سے زیادہ قریب ہوتے ہیں صبح ہو یا شام دن ہو یا رات، چاندنی ہو یا دھوپ، برسات ہو یا جاڑا، ان کا اصل مزہ یا اصل لطف دیہات کے لوگ ہی اُٹھاتے ہیں۔

شؔرر نے دیہات کے لوگوں کی طرزِ زندگی اور فطرت سے اُن کے لگاؤ کا ذکر کرتے ہوئے اس حقیقت کو آشکارا کیا ہے کہ قدرت کا سچا جلوہ گاہ تو گاؤں ہی ہوتا ہے کیوں کہ وہاں ہر طرف قدرت کا حُسن اور اس کے مناظر بکھرے ہوئے ہوتے ہیں۔ شہر کے لوگوں کے برخلاف گاؤں میں رہنے والے محنت کش لوگ صبح سویرے اُٹھ کر قدرت کے ان مناظر اور نعمتوں کا بھرپور مزہ لیتے ہیں صبح کی ٹھنڈی ہوا بڑے ناز و انداز سے انہیں اُٹھاتی ہے رات کے آخری پہر میں جھلملاتے تاروں کا منظر چڑیوں کی چہچہاہٹ اور پھر سورج نکلنے کا سماں، ان سب نظاروں اور نعمتوں کے ساتھ دیہات کے لوگوں کے دن کی شروعات ہوتی ہے۔ ان نظاروں کا لطف اُٹھاتے ہوئے کسان اپنے ہل بیل لے کر تڑکے اپنے کھیتوں پر پہنچ جاتے ہیں۔ صبح صبح پودوں میں لہلہاتے ہوئے پودوں کا منظر بڑا سہانا ہوتا ہے۔ ان پودوں کی نازک پتیوں پر شبنم کے قطرے موتیوں کی طرح چمکتے ہیں۔ ہرے بھرے کھیت، صبح کی تازہ ہوا، سورج کی کرنیں، یہ سارے مناظر ان کسانوں کے لئے عام باتیں ہیں۔ وہ ان سے بیگانہ ہو کر اپنے کام میں مگن رہتے ہیں۔ دیہات کے کسان اپنی محنت سے زمین کو پیداوار کے لائق بناتے ہیں وہ صبح سے شام تک جی توڑ محنت کرتے ہیں اور محنت کرتے وقت اکثر گانے گا کر ماحول کو اور خوش نما بنا دیتے ہیں۔ کنوئیں سے پانی نکال کر وہ اپنے کھیتوں کی سینچائی کرتے ہیں۔ پانی چاہے آسمان سے برسنے والا پانی ہو یا پھر کنوئیں سے نکالا جائے، پانی ان کے لئے بہت بڑی ضرورت اور دولت ہوتا ہے کیوں کہ کسان کی ساری محنت کا اور اس کی اچھی فصلوں کا انحصار پانی پر ہی ہوتا ہے۔

دن بھر کھیتوں میں کام کرنے والے یہ کسان کبھی تھکنے کا نام نہیں لیتے۔ وہ ایک ہی دھن میں صبح سے شام تک لگے رہتے ہیں۔ شام کو گھر آ کر انہیں جو کچھ بھی میسر ہوتا ہے اسے کھا لیتے ہیں اور خود کو فضول کے کسی کاموں میں اُلجھانے کے بجائے رات کو جلد ہی سو جاتے ہیں تا کہ کل پھر تازہ دَم ہو کر صبح سویرے اپنے کام پر جا سکیں۔ دن بھر محنت کرنے کے بعد رات کو وہ جس میٹھی نیند کا مزہ لیتے ہیں وہ شہر والوں کو کہاں میسر۔

عبدالحلیم شؔرر نے اس انشایئے میں دیہات کی لڑکیوں اور کنواریوں کی خوبیوں کو بھی بڑی تفصیل سے بیان کیا ہے۔ انہوں نے یہ بتایا ہے کہ گاؤں کی لڑکیاں بہت سادگی پسند، پاک دامن اور معصوم طبیعت کی ہوتی ہیں۔ ان کا ذہن گندے خیالات سے پاک ہوتا ہے۔ صبح سویرے اُٹھ کر وہ بھی اپنے کام کاج میں لگ جاتی ہیں۔ گھر کے لوگوں کے لئے کھانا بنانے اور دوسرے کاموں میں اپنی ماں کی مدد کرتی ہیں۔ وہ شہر کی لڑکیوں کی طرح بناؤ سنگار، ناز و ادا اور دوسرے فضول کے شوق سے بے نیاز ہوتی ہیں۔ وہ تو اپنے ماں باپ اور شوہر کی فرماں برداری اور خدمت کو ہی اپنا قیمتی زیور اور حُسن تصوّر کرتی ہیں۔ گمراہ کرنے والے قصے، کہانیوں اور اُوباش و بدمعاش لڑکوں جھانسوں سے انہیں کوئی غرض نہیں ہوتا۔ انہیں میلے ٹھیلے اور ناچ گانوں کا شوق بھی نہیں ہوتا ان کی خوشیاں تو ان کی محنت اور بہتر پیداوار سے جڑی ہوتی ہیں۔

شؔرر نے دیہات کے چودھری کی صفت بیان کرتے ہوئے اس بات کی وضاحت کی ہے کہ دیہات کا چودھری اپنے علاقے کا بادشاہ ہوتا ہے۔ گاؤں کے سبھی لوگ اس کے حکم اور اس کے فیصلے کی تعمیل کرتے ہیں اور اس کی عزت کرتے ہیں۔ وہ بھی اپنے گاؤں والوں کے ساتھ برابری کا سلوک کرتا ہے۔ وہ ان کو خود سے کمتر نہیں سمجھتا۔ اس کا رہن سہن اور طور طریقہ بھی گاؤں کے عام لوگوں کی طرح ہوتا ہے۔ گاؤں والوں کی عزت اس کی اپنی عزت ہوتی ہے۔ اس کی دولت اور ملکیت، اس کے کھیتوں کے اناج اور اس کے مویشی ہوتے ہیں۔

غرض کے شؔرر نے اپنے اس انشائیہ میں دیہات کے لوگوں کی زندگی اور ان کی خصوصیات کا تفصیل سے بیان کرتے ہوئے ہمیں یہ باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ دیہات کے لوگ سیدھے سادے محنتی اور جفا کش ہوتے ہیں۔ وفاداری، ایمان داری، سچائی، محبت اور اتحاد ان کا شیوہ ہوتا ہے۔ شہر کی بناوٹی زندگی اور ان کی ہوس اور سیہ کاری کی مقابلے، دیہات کے لوگوں کی زندگی امن و چین، قناعت اور کفالت شعاری جیسی خوبیوں کی حامل ہوتی ہے۔ چھوٹی چھوٹی خوشیاں ان کی زندگی میں بڑی اہمیت رکھتی ہیں، اپنے کھیتوں اور مویشیوں سے انہیں بے پناہ لگاؤ ہوتا ہے۔ اپنی محنت و مشقت سے وہ کھیتوں کو ہرا بھرا بناتے ہیں۔ ان میں لہلہاتی فصلیں ان کی دولت ہوتی ہیں اسی دولت سے وہ اپنا اور شہر والوں کا بھی پیٹ بھرتے ہیں۔ پورے ملک اور قوم کی ضرورتیں پوری کرنے کے لئے وہ سال بھر جی توڑ محنت کرتے ہیں۔ وہ انسانیت کے اصل ہم دَرد اور محسن ہیں۔

لہٰذا ہمیں چاہیے کہ ہم دیہات کے ان محنت کش کسانوں سے سبق حاصل کریں، ان کی پیروی اور قومی ہم دَردی کا زبانی دَم بھرنے کی بجائے اپنی نئی نسل کی صحیح تربیت کریں۔ اس کی ترقی و خوش حالی کے لئے موافق فضا تیار کریں ورنہ مستقبل تاریک ہو جائے گا۔

اس انشائیہ میں عبدالحلیم شؔرر نے ایک سنجیدہ موضوع کو بڑے ہی دل نشیں انداز میں پیش کر کے قاری کو لطف اور آ گہی دونوں سے آشنا کیا ہے۔ زبان و بیان کی تازگی اس انشائیہ کی لطافت میں اضافہ کرتی ہے۔ اُسلوب میں شامل چاشنی اور خیال کی نیرنگی قاری کے احساس کو گدگدانے کے ساتھ ساتھ اسے دیہات کی زندگی کا بھرپور سیر کراتی ہے اور اس کے علم و آ گہی میں اضافہ کرتی ہے۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:۔

﴿۸﴾ عبدالحلیم شرؔر کی نگاہ میں دیہات کی لڑکیاں کیسی ہوتی ہیں؟

﴿۹﴾ دیہات کی چودھری کی کیا حیثیت ہوتی ہے؟

04.07 خلاصہ

عبدالحلیم شرؔر کا شمار اردو کے ممتاز ادیبوں میں ہوتا ہے۔انہوں نے بطورِ ناول نگار کافی شہرت حاصل کی۔خاص طور سے اردو میں تاریخی ناول نگاری کی روایت شرؔر نے ہی ڈالی تھی لیکن انشائیہ نگاری میں بھی انہیں کمال حاصل تھا۔انہوں نے مختلف موضوعات پر بڑی تعداد میں انشائیے لکھے جو اپنے دل کش اندازِ بیان کے سبب کافی مقبول ہوئے۔

''دیہات کی زندگی'' ہی شرؔر کا ایک نمائندہ انشائیہ ہے۔اس انشائیے میں انہوں نے دیہات کے ماحول، وہاں کے فطری مناظر، دیہات کے زندگی کے مختلف پہلوؤں، کسانوں کی طرزِ زندگی، ان کے حالات، ان کی محنت و مشقّت اور سادگی و سچائی اور خلوص و اتحاد کو بڑے ہی دل نشیں انداز میں پیش کیا ہے۔

''دیہات کی زندگی'' کا موضوع گرچہ سنجیدہ فکر کا حامل موضوع ہے لیکن عبدالحلیم شرؔر نے اس موضوع کو اپنے اُسلوب اور اندازِ بیان کے ذریعہ دل چسپ اور سبک بنا دیا ہے۔جس کو پڑھتے وقت ذہن بوجھل نہیں ہوتا بلکہ زبان کی لطافت اور چاشنی قاری کو لطف اور لذّت عطا کرتی ہے۔

04.08 فرہنگ

بادِ سحر، نسیم سحر	صبح کی ٹھنڈی ہوا، ہلکی ہلکی ہوا	رفع	نکالنا، مکمل کرنا، دور کرنا
باعفت	عزت والا، والی، پارسا	شعاعیں	کرنیں
بشاش	ہنس مکھ، خوش	صناعی	کاریگر، ہنرمندی
بہ افراط	کثرت سے	عشرت	عیش، خوشی
پیال	دھان کا سوکھا ڈنٹھل	کفایت شعاری	کم خرچ، واجبی خرچ
تکلفات	نمائش، ظاہرداری	مرغانِ سحر	بانگ دے کر صبح کی آمد کی خبر دینے والے مرغ
جان فزا	خوشی بخشنے والا، فرحت بخش	مطیع	فرمابردار، اطاعت کرنے والا
جفاکش	محنت کرنے والا، تکلیف اُٹھانے والا	مغلانی	محل سرا میں رہنے والی خادمہ، ملازمہ
جلوہ گاہ	جلوہ دکھانے کی جگہ، دیدار کرنے کی جگہ	مینڈ	کھیت کی باڑ، کنارا
چابک دست	ہنرمند، دستکار	نقیب	خبر دینے والا، آواز لگانے والا
حسن عالم فریب	دنیا کو دھوکے میں ڈالنے والی خوب صورتی، نمائش	نیرنگیاں	حُسن، خوب صورتی
		وضع دار	اپنے طور طریقوں پر قائم رہنے والا، بانکا
حوروش	خوب صورت، حوروں جیسا چہرے والی	ہدیہ	تحفہ، نذر

04.09 نمونہ امتحانی سوالات

الف: درجِ ذیل سوالوں کے جوابات ۱۰/۱۰ سطروں میں دیجیے:

سوال نمبر۱ عبدالحلیم شرؔر کا تعارف پیش کیجیے۔

سوال نمبر۲ شرؔر کی ادبی خدمات پر روشنی ڈالیے۔

سوال نمبر۳ دیہات کی زندگی پر ایک مختصر نوٹ لکھیے۔

ب: درج ذیل سوالوں کے جوابات ۳۰/۳۰ سطروں میں دیجیے:

سوال نمبر۱ انشائیہ کسے کہتے ہیں؟ شرؔر کی انشائیہ نگاری کی خصوصیات بیان کیجیے۔

سوال نمبر۲ ''دیہات کی زندگی'' میں شرؔر نے دیہی لوگوں کی کن خصوصیات کا ذکر کیا ہے؟

سوال نمبر۳ شرؔر نے گاؤں کو قدرت کا سچا جلوہ گاہ کیوں کہا ہے اور ساتھ ہی دیہاتیوں سے کیا سبق لینے کی تلقین کی۔

04.10 حوالہ جاتی کتب

۱۔	انشائیہ اور انشائیہ نگار	از	ڈاکٹر سید محمد حسنین
۲۔	انشائیہ کی بنیاد	از	ڈاکٹر سلیم اختر
۳۔	عبدالحلیم شرؔر	از	ڈاکٹر شریف احمد
۴۔	عبدالحلیم شرؔر بحیثیت ناول نگار	از	ڈاکٹر علی احمد فاطمی

04.11 اپنے مطالعے کی جانچ کے جوابات

﴿۱﴾ عبدالحلیم شرؔر کی پیدائش ۱۰/جنوری ۱۸۶۰ء کو لکھنؤ میں ہوئی تھی۔

﴿۲﴾ شرؔر کے والد کا نام تفضّل حسین تھا۔

﴿۳﴾ شرؔر کے نانا منشی قمرالدین ریاست اودھ کے دربار سے وابستہ تھے۔

﴿۴﴾ شرؔر نے شروع میں ''اودھ اخبار'' میں ملازمت کی تھی۔

﴿۵﴾ شرؔر کے رسالے کا نام ''دلگداز'' تھا۔

﴿۶﴾ شرؔر کے ناول کا نام ''دل چسپ'' تھا۔

﴿۷﴾ والٹر اسکاٹ

﴿۸﴾ سادگی پسند، پاک دامن اور معصوم طبیعت

﴿۹﴾ علاقے کے بادشاہ جیسی

اکائی 05 مچھر : خواجہ حسن نظامی

ساخت

05.01 : اغراض و مقاصد

05.02 : تمہید

05.03 : خواجہ حسن نظامی کی حالاتِ زندگی

05.04 : خواجہ حسن نظامی کی تصنیفات

05.05 : خواجہ حسن نظامی کی انشائیہ نگاری

05.06 : انشائیہ ''مچھر'' کا متن (اقتباس)

05.07 : انشائیہ ''مچھر'' کا تنقیدی جائزہ

05.08 : خلاصہ

05.09 : فرہنگ

05.10 : نمونہ امتحانی سوالات

05.11 : حوالہ جاتی کتب

05.01 اغراض و مقاصد

اس اکائی میں آپ خواجہ حسن نظامی کے حالات زندگی، ادبی تخلیقات اور انشائیہ نگاری کا مطالعہ کریں گے۔ جس سے آپ کو خواجہ حسن نظامی اور ان کی انشائیہ نگاری کو سمجھنے میں آسانی ہوگی۔ آپ کے لئے اس اکائی میں خواجہ حسن نظامی کا مشہور و معروف انشائیہ ''مچھر'' کا متن اور اس کا تنقیدی جائزہ پیش کیا جائے گا اور اس کے بعد اس کا خلاصہ بھی پیش کیا جائے گا۔ اس اکائی میں فرہنگ بھی دی جائے گی جس کے ذریعے آپ مشکل الفاض کے معنی سمجھ سکیں گے۔ اس کے بعد نمونہ امتحانی سوالات اور معروضی سوالات اور ان کے جوابات پیش کیے جایں گے۔ آخر میں حوالہ جاتی کتب پیش کی جایں گی۔ اکائی کے مطالعے کے بعد آپ سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ آپ خواجہ حسن نظامی کی زندگی کے بارے میں اہم معلومات اور ان کی انشائیہ نگاری کی خصوصیات سے بخوبی واقف ہو جایں گے۔

05.02 تمہید

خواجہ حسن نظامی کا شمار اُردو ادب کے معروف انشائیہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ وہ ایک صاحبِ طرز ادیب اور مشہور صحافی بھی تھے۔ اُردو کے ایک خاص ادیب اور موئرخ کی حیثیت سے بھی انہیں جانا جاتا ہے۔ خواجہ حسن نظامی اردو ادب کی تاریخ میں ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے۔ روز نامچہ کو با قاعدہ صنف کی حیثیت انہوں نے ہی دی۔ قلمی چہروں کا سلسلہ بھی انہوں نے ہی شروع کیا۔ بحیثیت صحافی ان کا نام بہت بلند

ہے۔ان کی سر پرستی اور ادارت میں سب سے زیادہ روز نامے، ہفتہ وار اخبار اور ماہانہ جرائد شائع ہوئے۔نظام المشائخ، روز نامہ رعیت، ماہانہ دین دنیا، منادی، ماہ نامہ آستانہ ان تمام اخبارات ورسائل سے خواجہ حسن نظامی کی کسی نہ کسی طور پر وابستگی رہی ہے۔

خواجہ حسن نظامی کی ۱۸۵۷ء کے انقلاب پر گہری نظر تھی۔انہوں نے اس ضمن میں جو کتابیں لکھی ہیں وہ تاریخ کا بیش قیمتی سرمایہ ہیں۔بیگمات کے آنسو، غدر کے اخبار، غدر کے فرمان، بہادر شاہ ظفر کا مقدمہ، غدر کی صبح وشام، محاصرہ دہلی کے خطوط ان کی نہایت اہم کتابیں ہیں۔ویسے تو انہوں نے اپنی ادبی زندگی میں بہت کچھ لکھا۔لیکن اُردو ادب میں انہیں جو شہرت انشائیہ نگاری کے ذریعے حاصل ہوئی وہ دیگر اصناف کے ذریعے حاصل نہ ہو سکی۔

05.03 خواجہ حسن نظامی کی حالاتِ زندگی

اُردو ادب میں اپنی ایک الگ پہچان رکھنے والے ادیب، صحافی، موئرخ اور اپنی شان دار نثر نگاری کے ممتاز ترین نثر نگار خواجہ حسن نظامی کی ولادت ۱۸۷۹ء کو دہلی کی بستی حضرت نظام الدینؒ میں ہوئی۔اُن کے والد کا نام حافظ سید عاشق حسین تھا جو درگاہ شریف کے پیرزادوں میں سے تھے۔ان کی والدہ کا نام سیدہ چہیتی بیگم تھا۔ان کا شجرہ حضرت علی مرتضیٰؓ سے ملتا ہے۔خواجہ حسن نظامی کے والدین ان سے بے پناہ محبت کرتے تھے اور ان کا نام قاسم علی رکھا تھا۔ان کے ماموانہیں پیار سے علی حسن کہتے تھے۔خواجہ حسن نظامی کی عرفیت حسن نظامی تھی۔خواجہ حسن نظامی نے اپنی ابتدائی تعلیم بستی نظام الدین میں اُردو، عربی اور فارسی میں حاصل کی۔ان کے اساتذہ میں مولانا اسماعیل کاندھلوی، مولانا یحیٰ کاندھلوی جیسی عظیم ہستیاں تھیں۔انہوں نے اپنی پڑھائی جاری رکھنے کے لئے مولانا رشید احمد گنگوہی کے مدرسہ رشیدیہ گنگوہ میں تقریباً ۱۵ مہینے گزارے اور وہیں سے فراغت حاصل کی۔اٹھارہ سال کی عمر میں ہی ان کی شادی سیدہ حبیب بانو سے ہوئی جو ان کے حقیقی چچا سید معشوق علی کی دختر نیک اختر تھیں۔خواجہ حسن نظامی کا بچپن بہت ہی زیادہ تکلیفوں میں گزرا۔ان کے والد کتابوں کی جلد سازی کر کے اپنے گھر کا خرچ چلاتے تھے۔خود نظامی صاحب نے درگاہ کے زائرین کے جوتوں کی حفاظت کر کے گھر والوں کی مدد کی۔گزراوقات کے لئے نظامی صاحب نے پھیری لگا کر کتابیں اور دہلی کی عمارتوں کے فوٹو بھی فروخت کیے۔

خواجہ حسن نظامی کا تعلق صوفی خاندان سے تھا اس لئے اُنہوں نے بھی خاندانی روایت کے مطابق خواجہ غلام فرید کے ہاتھ پر بیعت کی۔ان کے انتقال کے بعد حضرت پیر مہر علی شاہ گولڑوی سے بیعت ہوئے۔وہ درگاہ سے وابستہ تھے مگر پیرزادگی انہیں پسند نہ تھی اس لئے معاش کی دوسری راہ نکالی۔وہ صحافت سے وابستہ ہو گئے۔انہوں نے حلقہ نظام المشائخ قائم کیا جس کے تحت 'نظام المشائخ' کے نام سے ایک رسالہ جاری کیا۔اپنے ایک دوست احسان الحق کے ہفتہ وار اخبار 'توحید' کی ادارت کے فرائض انجام دیے۔پھر اپنا رسالہ 'منادی' بھی نکالا۔خواجہ حسن نظامی کے دشمنوں کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ان کے بارے میں دشمنوں نے یہ مشہور کر رکھا تھا کہ وہ انگریزوں کے جاسوس ہیں۔ان کے خلاف اخبارات بھی شائع کیے گئے۔ان کے 'منادی' کے خلاف ہفتہ وار اخبار 'سنادی' نکالا گیا۔

خواجہ حسن نظامی نے ان مخالفتوں کی پرواہ نہیں کی اور مسلسل محنت کرتے رہے اور اس محنت نے انہیں شہرت اور عظمت عطا کی انہوں نے اپنا ایک بھی لمحہ ضائع نہیں کیا۔ہمہ وقت کتابوں کی تصنیف وتالیف میں مصروف رہتے۔ان کتابوں پر ہی ان کی آمدنی کا انحصار تھا۔کتابوں کے کاروبار سے حلال رزق کھاتے تھے اس لئے نذر و نیاز سے دوری بنائے رکھی تھی۔انہوں نے ایک دواخانہ بھی کھول رکھا تھا۔جس میں

دوائیاں تیار کی جاتیں تھی۔ انہوں نے ایک اُردو سرمہ بھی تیار کیا تھا جس کا اشتہار اپنے رسالہ ’منادی‘ میں دیتے ہوئے انہوں نے لکھا تھا کہ ’’آج میں نے ایک سرمہ تیار کیا ہے۔ میں نے اس سرمہ کا نام اُردو سرمہ اس واسطے تجویز کیا ہے کہ اردو زبان بھی آنکھوں کو ایسا ہی روشن کرتی ہے۔‘‘ نظامی صاحب ایک صاحب طرز انشا پرداز، اپنے اسلوب کے موجد اور خاتم بھی تھے۔ خواجہ حسن نظامی کا انتقال ۱۳ جولائی ۱۹۵۵ء میں عیدالاضحیٰ کے دن ہوا اور انہیں بستی حضرت نظام الدین نئی دہلی میں دفن کیا گیا۔

05.04 خواجہ حسن نظامی کی تصنیفات

جیسا کہ آپ کو پہلے بتایا جا چکا ہے کہ بحیثیت انشائیہ نگار خواجہ حسن نظامی کا نام اُردو ادب کے انشائیہ نگاروں میں اپنا منفرد اور اعلیٰ مقام رکھتا ہے۔ انہوں نے بہت سے انشائیے لکھے لیکن جتنے بھی لکھے بہت خوب لکھے۔ ان کے کردار ہمارے روز مرّہ زندگی اور معاشرے ہی کے چلتے پھرتے اور جیتے جاگتے کردار ہیں۔ خواجہ حسن نظامی تاریخ ادب اُردو میں کئی حیثیتوں سے یاد رکھے جائیں گے۔ روزنامچہ کو باقاعدہ صنف کی حیثیت انہوں نے ہی دی۔ قلمی چہروں کا سلسلہ بھی انہوں نے ہی شروع کیا۔ بحیثیت صحافی ان کا نام بہت بلند ہے۔ ان کی سرپرستی اور ادارت میں سب سے زیادہ روزنامے، ہفتہ وار اخبار اور ماہانہ جرائد شائع ہوئے۔ نظام المشائخ، روزنامہ رعیت، ماہانہ دین دنیا، منادی، ماہ نامہ آستانہ ان تمام اخبارات و رسائل سے خواجہ حسن نظامی کی کسی نہ کسی طور پر وابستگی رہی ہے۔ خواجہ حسن نظامی ایک موئرخ بھی تھے۔ ۱۸۵۷ء کے انقلاب پر ان کی گہری نظر تھی۔ انہوں نے اس ضمن میں جو کتابیں لکھی ہیں وہ تاریخ کا بیش قیمتی سرمایہ ہیں۔ بیگمات کے آنسو، غدر کے اخبار، غدر کے فرمان، بہادر شاہ ظفر کا مقدمہ، غدر کی صبح و شام، محاصرہ دہلی کے خطوط ان کی نہایت اہم کتابیں ہیں۔

خواجہ حسن نظامی نے ہر موضوع پر لکھا، شاید ہی کوئی ایسا موضوع ہو جس پر ان کی کوئی تحریر نہ ملے۔ انہوں نے آپ بیتی بھی لکھی، سفرنامے بھی لکھے۔ سفرنامہ حجاز مصر و شام، سفرنامہ ہندوستان، سفرنامہ پاکستان، قابل ذکر کتابیں ہیں۔ ’گاندھی نامہ‘ اور ’یزید نامہ‘ بھی ان کی اہم کتابوں میں سے ہیں۔ خواجہ حسن نظامی نے انشائیے بھی لکھے۔ جھینگر کا جنازہ، گلاب تمہارا کیکر ہمارا، مرغ کی اذان، مچھر، مکھی، الّو ان کے مشہور انشائیے ہیں۔ خواجہ حسن نظامی کا اسلوب سب سے الگ تھا۔ وہ ایک صاحب طرز انشا پرداز، اپنے اسلوب کے موجد اور خاتم بھی تھے۔ یہ تمام تصنیفات خواجہ حسن نظامی کی قابل ذکر اور قابل قدر ہیں ان کا مطالعہ کرنے کے بعد سمجھ میں آتا ہے کہ وہ ہمارے ایسے انشائیہ نگار تھے جن کے انشائیے اُردو ادب میں خوب پڑھے جاتے ہیں اور ہمیشہ پڑھے جاتے رہیں گے۔ اس کی خاص وجہ یہ بھی ہے کہ ان کے انشائیوں کو پڑھنے کے بعد انسان کچھ نہ کچھ سیکھتا ضرور ہے۔

05.05 خواجہ حسن نظامی کی انشائیہ نگاری

انشائیہ اُردو نثر کی ایک خاص اور قابل قبول صنف ہے۔ اس میں عبارت کو سجا کر پیش کیا جاتا ہے اور بات سے بات پیدا کی جاتی ہے۔ انشائیہ اصل میں مختصر نویسی کا اعجاز ہے اور مختصر نویسی کا فن ہر کسی انسان کے بس کی بات نہیں۔ اُردو ادب میں انشائیہ کا مفہوم وہی ہے جو انگریزی ادب میں ایسے (Essay) کا ہے۔ جو فرانسیسی لفظ (Essai) کا مترادف ہے۔ اکثر یہ دیکھا گیا ہے کہ زیادہ تر لوگ انشائیہ، مضمون اور مقالہ میں فرق واضح نہیں کر پاتے۔ انشائیہ کی ساخت اور بناوٹ، اس کے موضوع اور فنی محاسن کی روشنی میں کئی ایک بحثیں ہوتی رہی ہیں۔ لیکن یہ بات نکل کر سامنے آتی ہے کہ انشائیہ ایجاز و اختصار کے باعث نثری اصناف میں زیادہ مقبول رہا ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ

انشائیہ ایسی ہلکی پھلکی صنف ہے جو کم سے کم وقت میں مکمل کی جا سکتی ہے۔ حالاں کہ اس میں کوئی شک وشبہ کی بات نہیں ہے کہ افسانہ اور ناول اُردو زبان کی مقبول ترین اصناف ہیں۔ لیکن ان کے بعد انشائیہ ہی کا نمبر آتا ہے۔ انشائیہ عربی سے اُردو ادب میں آیا ہے لیکن کچھ محققین کا ایسا خیال ہے کہ انشائیہ اُردو ادب میں انگریزی ادب سے آیا ہے۔ ملا وجہی کی مشہور ومعروف داستان 'سب رس' میں بھی انشائیوں کے نمونے ملتے ہیں۔ خواجہ حسن نظامی نے تقریباً ۱۳۴/انشائیے لکھے جو ان کے مجموعے 'سی پارۂ دل' میں شامل ہیں۔ جھینگر کا جنازہ، گلاب تمہارا کیکر ہمارا، مرغ کی اذان، مچھر، مکھی، الّو ان کے مشہور انشائیے ہیں۔

ذیل میں ان کے کچھ انشائیوں کی مثالیں پیش کی گئیں ہیں، ملاحظہ ہوں:

> میری سب کتابوں کو چاٹ گیا بڑا موذی تھا۔ خدا نے پردہ ڈھک لیا۔ اُفوہ جب اس کی لمبی لمبی دو مونچھوں کا خیال کرتا ہوں۔ جو وہ مجھ کو دکھا کر ہلایا کرتا تھا تو آج اس کی لاش دیکھ کر بہت خوشی ہوتی ہے۔ بھلا دیکھو تو قیصر ولیم کی برابری کرتا تھا۔ اس جھینگر کی داستان ہرگز نہ کہنا۔ اگر دل سے عہد نہ کیا ہوتا۔ کہ دنیا میں جتنے حقیر و ذلیل مشہور ہیں۔ میں ان کو چار چاند لگا کر چمکاؤں گا۔ ایک دن اس مرحوم کو میں نے دیکھا کہ حضرت ابن عربی کی فتوحات کمیہ کی ایک جلد میں چھپا بیٹھا ہے۔ میں نے کہا کیوں رے شریر تو یہاں کیوں آیا۔ اُچھل کر بولا ذرا اس کا مطالعہ کرنا تھا سبحان اللہ۔ بھائی کیا خاک مطالعہ کرتے تھے۔ بھائی یہ تو ہم انسانوں کا حصہ ہے۔ بولا وہ قرآن نے گدھے کی مثال دی ہے کہ لوگ کتابیں پڑھ لیتے ہیں مگر نہ ان کو سمجھتے ہیں نہ ان پر عمل کرتے ہیں۔ لہٰذا وہ بوجھ اٹھانے والے گدھے ہیں۔ جن پر علم وفضل کی کتابوں کا بوجھ لدا ہوا ہے۔ مگر میں نے اس مثال کی تقلید نہیں کی۔ خدا مثال دینا جانتا ہے۔ تو بندہ بھی اس کی دی ہوئی بلاغت سے ایک نئی مثال پیدا کر سکتا ہے اور وہ یہ ہے کہ انسان مثل ایک جھینگر کی ہے۔ جو کتابیں چاٹ لیتے ہیں۔ سمجھتے بوجھتے خاک نہیں۔ جتنی یونیورسٹیاں ہیں سب میں یہی ہوتا ہے۔ ایک شخص بھی ایسا نہیں ملتا جس نے علم کو علم سمجھ کر پڑھا ہو۔ جھینگر کی یہ بات سن کر مجھ کو غصہ آیا اور میں نے زور سے کتاب پر ہاتھ مارا، جھینگر پھدک کر دوسری کتاب پر جا بیٹھا اور قہقہہ مار کر کہنے لگا۔ واہ خفا ہو گئے بگڑ گئے لاجواب ہو کر لوگ ایسا ہی کیا کرتے ہیں۔ لیاقت تو یہ تھی۔ کہ کچھ جواب دیتے۔ لگے ناراض ہونے اور دھتکارنے۔ ہائے کل تو یہ تماشہ دیکھا تھا۔
>
> (جھینگر کا جنازہ)

ان کے ایک اور انشائیے 'مکھی' کی مثال ملاحظہ ہو:

> دیکھنے میں بھنبھناتا ہوا ذرا سا پرندہ ہے بلکہ پرندہ کا لفظ بھی اس کی ننھی سی ہستی پر زیبا نہیں۔ یوں سمجھئے کہ ایک ناچیز وغلیظ ومکروہ بھنگا ہے۔ مگر نظرِ تعمق سے دیکھو تو عرفان قدرت کا پراسرار نوشتہ ہے۔

مکھیوں کی کئی قسمیں ہیں۔ ایک قسم شہد کی مکھیوں کی ہے دوسری قسم وہ مکھیاں ہیں جو انسان کے ساتھ بود و باش رکھتی ہیں۔ تیسری قسم کی مکھیاں قبروں، قتل گاہوں، ذبح خانوں بغیرہ مقامات میں رہتی ہیں۔ قسم اول شہد کی مکھی آدمی کو طریق تمدن سکھانے والی اور بڑی عقل مند ہے۔ قرآن شریف میں ایک سورت اس کے نام سے

منسوب ہے۔اس مکھی کے ضابطے اور قانون انسان کو حیرت میں ڈالتے ہیں۔شہد کی مکھی ابتدا سے خود مختار بادشاہ کے ماتحت ہے۔آدمی کی طرح رنگ نہیں بدلتی۔ان مکھیوں کے ہر چھتے میں ایک حکمراں ملکہ ہوتی ہے جس کے حکم پر ہزاروں مکھیاں گردش کرتی ہیں۔مکھی ملکہ کا فرمان اشاروں ہی اشاروں میں پورا ہو جاتا ہے۔اس کو نہ گزٹ میں اعلان کرنے کی ضرورت ہے نہ وائیسرائے اور ڈپٹی کمشنر کی معرفت کی تلاش۔جب ذرا پروں کو حرکت دی اور آنکھوں کو سامنے کر کے بھنبھنائی،فوراً سب رعایا تعمیل کے لئے کھڑی ہو گئی۔

(مکھی)

خواجہ حسن نظامی کے ایک اور انشائیے 'اُلّو' کی مثال ملاحظہ کیجیے:

اُلّو ایک ایسے جانور کا نام ہے جس کی نحوست کو سب مانتے ہیں۔ضرب المثل کے جملے بے چارہ اس پرندے کے وجود پر بن گئے ہیں۔جب کسی گھر یا شہر کی ویرانی بیان کرنی منظور ہو تو کہتے ہیں وہاں تو اُلّو بول رہا ہے یعنی وہ مقام بالکل اجاڑ ہے۔آبادی کی چہل پہل بالکل نام کو نہیں اور فقط نحوست اور ویرانہ پن میں ہی اُلّو بدنام نہیں ہے،حماقت و بےعقلی کے موقعہ پر بھی اُلّو کا ہی نام لیا جاتا ہے۔اُلّو کی آواز سے بہت سی بدشگونیاں منسوب ہیں۔

پس ایسے منحوس جانور کے ذکر اذکار میں کون جی لگائے گا۔کس کو رغبت ہو گی کہ بلبل ہزار داستان اور طوطی شکر مقال کے چرچوں کو چھوڑ کر اس بدنام پرندہ کے بیان میں مصروف ہو۔مگر دنیا کے پردہ پر سب آدمی ایک مزاج و طبیعت کے نہیں بستے۔ہزار اُلّو کو برا کہنے والے ہیں تو دو چار اس کی مدح سرائی کرنے والے بھی نکل آئیں گے۔خاص کر وہ گروہ جو موجودات کے ہر نیک و بد کو صفاتِ یزدانی کا مظہر تصور کرتا ہے۔

(اُلّو)

05.06 انشائیہ ''مچھر'' کا متن (اقتباس)

یہ بھنبھناتا ہوا ننھا سا پرندہ آپ کو بہت ستاتا ہے۔رات کو نیند حرام کر دی ہے۔ہندو،مسلمان،سکھ،عیسائی،یہودی سب بالاتفاق اس سے ناراض ہیں۔ہر روز اس کے مقابلہ کے لئے مہمیں تیار ہوتی ہیں،جنگ کے نقشے بنائے جاتے ہیں۔مگر مچھروں کے جنرل کے سامنے کسی کی نہیں چلتی۔شکست پر شکست ہوئی چلی جاتی ہے اور مچھروں کا لشکر بڑھا چلا آتا ہے۔

اتنے بڑے ڈیل ڈول کا انسان ذرا سے بھنگے پر قابو نہیں پا سکتا۔طرح طرح کے مصالحے بھی بناتا ہے کہ ان کی بو سے مچھر بھاگ جائیں۔لیکن مچھر اپنی یورش سے باز نہیں آتے۔آتے ہیں اور نعرے لگاتے ہوئے آتے ہیں۔بے چارہ آدم زاد حیران رہ جاتا ہے اور کسی طرح ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔

امیر۔غریب۔ادنیٰ۔اعلیٰ۔بچے۔بوڑھے۔عورت۔مرد۔کوئی اس کے وار سے محفوظ نہیں۔یہاں تک کہ آدمی کے پاس رہنے والے جانوروں کو بھی ان کے ہاتھ سے ایذا ہے۔مچھر جانتا ہے کہ دشمن کے دوست بھی دشمن ہوتے ہیں۔ان جانوروں نے میرے دشمن کی اطاعت کی ہے تو میں ان کو بھی مزا چکھاؤں گا۔

آدمیوں نے مچھروں کے خلاف ایجی ٹیشن کرنے میں کوئی کسر نہیں اُٹھا رکھی۔ ہر شخص اپنی سمجھ اور عقل کے موافق مچھروں پر الزام رکھ کر لوگوں میں ان کے خلاف جوش پیدا کرنا چاہتا ہے مگر مچھر اس کی کچھ پروا نہیں کرتا۔

طاعون نے گڑ بڑ مچائی تو انسان نے کہا کہ طاعون مچھر اور پسو کے ذریعے سے پھیلتا ہے۔ ان کو فنا کر دیا جائے تو یہ ہول ناک وبا دور ہو جائے گی۔ ملیریا پھیلا تو اس کا الزام بھی مچھر پر عائد ہوا۔ اس سرے سے اس سرے تک کالے گورے آدمی غل مچانے لگے کہ مچھروں کو مٹا دو۔ مچھروں کو کچل ڈالو۔ مچھروں کو تہس نہس کر دو اور ایسی تدبیر نکالیں جن سے مچھروں کی نسل ہی منقطع ہو جائے۔

مچھر بھی یہ سب باتیں دیکھ رہا تھا اور سن رہا تھا اور رات کو ڈاکٹر صاحب کی میز پر رکھے ہوئے ''پانیر'' کو آ کر دیکھتا اور اپنی برائی کے حروف پر بیٹھ کر اس خون کی ننھی ننھی بوندیں ڈال جاتا جو انسان کے جسم سے یا خود ڈاکٹر صاحب کے جسم سے چوس کر لایا تھا۔ گویا اپنے فائدہ کی تحریر سے انسان کی ان تحریروں پر شوخیانہ ریمارک لکھ جاتا کہ میاں تم میرا کچھ نہیں کر سکتے۔

انسان کہتا ہے کہ مچھر بڑا کم ذات ہے۔ کوڑے، کرکٹ، میل کچیل سے پیدا ہوتا اور گندی موریوں میں زندگی بسر کرتا ہے اور بزدلی تو دیکھو اس وقت حملہ کرتا ہے جب کہ ہم سو جاتے ہیں۔ سوتے پر وار کرنا، بے خبر کے چر کے لگانا مردانگی نہیں انتہا درجے کی کمینگی ہے۔ صورت تو دیکھو کالا بھتنا۔ لمبے لمبے پاؤں بے ڈول چہرہ اس شان وشوکت کا وجود اور آدمی جیسے گورے چٹے۔ خوش وضع۔ پیاری ادا کے آدمی کی دشمنی، بے عقلی اور جہالت اسی کو کہتے ہیں۔ مچھر کی سنو تو وہ آدمی کو کھری کھری سناتا ہے اور کہتا ہے کہ جناب ہمت ہے تو مقابلہ کیجیے۔ ذات صفات نہ دیکھیے۔ میں کالا سہی، بدرونق سہی، نیچ ذات سہی اور کمینہ سہی مگر یہ تو کہیے کہ کس دلیری سے آپ کا مقابلہ کرتا ہوں اور کیوں کر آپ کی ناک میں دم کرتا ہوں۔

یہ الزام سراسر غلط ہے کہ بے خبری میں آتا ہوں اور سوتے میں ستاتا ہوں۔ یہ تم اپنی عادت کے موافق سراسر ناانصافی کرتے ہو۔ حضرت میں تو کان میں آ کر ''الٹی میٹم'' دے دیتا ہوں کہ ہوشیار ہو جاؤ۔ اب حملہ ہوتا ہے۔ تم ہی غافل رہو تو میرا کیا قصور۔ زمانہ خود فیصلہ کر دے گا کہ میدان جنگ میں کالا بھتنا، لمبے لمبے پاؤں والا بے ڈول فتح یاب ہوتا ہے یا گورا چٹا آن بان والا۔

میرے کارناموں کی شاید تم کو خبر نہیں کہ میں نے اس پردہ دنیا پر کیا کیا جوہر دکھائے ہیں۔ اپنے بھائی نمرود کا قصّہ بھول گئے جو خدائی کا دعویٰ کرتا تھا اور اپنے سامنے کسی کی حقیقت نہ سمجھتا تھا۔ کس نے اس کا غرور توڑا۔ کون اس پر غالب آیا۔ کس کے سبب اس کی خدائی خاک میں ملی؟ اگر آپ نہ جانتے ہوں تو اپنے ہی کسی بھائی سے دریافت کیجیے یا مجھ سے سنیے کہ میرے ہی ایک بھائی مچھر نے اس سرکش کا خاتمہ کیا تھا۔

اور تم تو ناحق بگڑتے ہو اور خواہ مخواہ اپنا دشمن تصور کیے لیتے ہو۔ میں تمہارا مخالف نہیں۔ اگر تم کو یقین نہ آئے تو اپنے کسی شب بیدار صوفی بھائی سے دریافت کر لو۔ دیکھو وہ میری شان میں کیا کہے گا۔ کل ایک شاہ صاحب عالم ذوق میں اپنے ایک مرید سے فرما رہے تھے کہ میں مچھر کی زندگی کو دل سے پسند کرتا ہوں۔ دن بھر بے چارا خلوت خانہ میں رہتا ہے رات کو، جو خدا کی یاد کا وقت ہے، باہر نکلتا ہے اور پھر تمام شب تسبیح وتقدیس کے ترانے گایا کرتا ہے۔ آدمی غفلت میں پڑے سوتے ہیں تو اس کو ان پر غُصّہ آتا ہے۔ چاہتا ہے کہ یہ بھی بیدار ہو کر اپنے مالک کے دیے ہوئے اس سہانے خاموش وقت کی قدر کرے اور حمد شکر کے گیت گائے۔ اس لئے پہلے ان کے کان میں جا کر کہتا ہے کہ اُٹھو میاں! اُٹھو جاگو جاگنے کا وقت ہے۔ سونے کا اور ہمیشہ سونے کا وقت ابھی نہیں آیا۔ جب آئے گا تو بے فکر ہو کر سونا۔ اب تو ہوشیار رہنے اور کچھ کام کرنے کا موقع ہے مگر انسان اس سریلی نصیحت کی پروا نہیں کرتا اور سوتا رہتا ہے تو مجبور ہو کر غُصّہ میں آ جاتا ہے اور اس کے چہرہ اور ہاتھ

پاؤں پر ڈنک مارتا ہے۔ پرواہ رے انسان، آنکھیں بند کیے ہوئے ہاتھ پاؤں مارتا ہے اور بے ہوشی میں بدن کھجا کر پھر سو جاتا ہے اور جب دن کو بیدار ہوتا ہے تو بے چارا مچھر کو صلواتیں سناتا ہے کہ رات بھر سونے نہیں دیا۔ کوئی اس دروغ گو سے پوچھے کہ جناب عالی! کتنے سکنڈ جاگے تھے جو ساری رات جاگتے رہنے کا شکوہ ہو رہا ہے۔

شاہ صاحب کی زبان سے یہ عارفانہ کلمات سن کر میرے دل کو بھی تسلی ہوئی کہ غنیمت ہے ان آدمیوں میں بھی انصاف والے موجود ہیں بلکہ میں دل میں شرمایا کہ کبھی کبھی ایسا ہو جاتا ہے کہ شاہ صاحب مصلے پر بیٹھے وظیفہ پڑھا کرتے ہیں اور میں ان کے پیروں کا خون پیا کرتا ہوں۔ یہ تو میری نسبت ایسی اچھی اور نیک رائے دیں اور میں ان کو تکلیف دوں۔ اگر چہ دل نے یہ سمجھایا کہ تو کاٹتا تھوڑی ہے۔ قدم چومتا ہے اور ان بزرگوں کے قدم چومنے ہی کے قابل ہوتے ہیں لیکن اصل یہ ہے کہ اس سے میری ندامت دور نہیں ہوتی اور اب تک میرے دل میں اس کا افسوس باقی ہے۔

سو اگر سب انسان ایسا طریقہ اختیار کر لیں جیسا کہ صوفی صاحب نے کیا تو یقین ہے کہ ہماری قوم انسان کو ستانے سے خود بخود باز آ جائے گی ورنہ یاد رہے کہ میرا نام مچھر ہے۔ لطف سے جینے نہ دوں گا اور بتا دوں گا کہ کمین اور نیچ ذات اعلیٰ ذات والوں کو یوں پریشان اور بے چین کر سکتی ہے۔

05.07 انشائیہ ''مچھر'' کا تنقیدی جائزہ

خواجہ حسن نظامی صاحب نے اپنے مشہور انشائیے (مچھر) کے مقابلے میں مچھر کو بہت طاقت ور، ذہین اور بڑا مدبر بتایا ہے جو اس طرح سے ایک کردار کی شکل میں سب کے سامنے آتا ہے جسے انسانوں کو تکلیف دینے میں بڑا مزا آتا ہے۔ اگر آپ اس انشائیے (مچھر) کے سب سے پہلے جملے (بھنبھناتا) پر غور کریں تو ظاہر ہے کہ یہ ایک معمولی اور چھوٹا سا جملہ ہے۔ جس کا مخاطب انشائیے کا قاری یا کوئی انسان ہے۔ مصنف کا انداز بہت ہم دَردانہ ہے۔ اس کو انسانوں کی تکلیف و پریشانیوں کا بھی احساس ہے۔ یہ پریشانیاں ایک چھوٹے سے پرندے کی وجہ سے ہیں جو بھنبھناتا ہے اور انسانوں کو ستاتا ہے۔ لیکن اس جملے سے یہ پتہ نہیں لگ پاتا کہ بھنبھناتا ہوا ننھا سا پرندا ہے اور بڑے بڑے انسانوں کو ستاتا ہے، آخر یہ ہے تو ہے کون؟ پھر ذہن میں یہ خیال آتا ہے کہ وہ مچھر ہے، مکھی ہے، بھڑ ہے، بھنورا ہے یا کوئی اور ہے۔ جو لفظ بھنبھناتا ہے اس سے یہ تو ضرور واضح ہو جاتا ہے کہ وہ پروانہ یا جگنو نہیں اور یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ وہ چڑیا یا گوریا کی نسل کا پرندہ بھی نہیں ہے۔

اب ہم اس انشائیے کے دوسرے جملے پر غور کرتے ہیں اور وہ دوسرا لفظ (ننھا) سا پرندہ ہے۔ ایک ایسا ننھا سا پرندہ جس نے لوگوں کی ناک میں دم کر رکھا ہے۔ جس کے بھنبھناتے ہی انسانوں کی نیندیں خراب ہو جاتی ہیں وہ سوتے ہوئے اچانک سے اٹھ بیٹھتے ہیں۔ بلکہ یوں کہیے نیند حرام ہو جاتی ہے اور پھر صبح سے سو بھی نہیں پاتے۔ اتنا چھوٹا سا پرندہ جو انسانوں کی نیندیں حرام کیے ہوئے ہے۔ آخر ہے تو وہ ہے کون؟ اتنا سب سوچنے کے بعد آخر کار قاری یہ قیاس کرتا ہے کہ یہ ننھا سا پرندہ نہ تو بھڑ ہے نہ بھنورا ہے اور نہ ہی یہ مکھی ہو سکتا ہے۔ ممکن ہے کہ وہ مچھر ہو جس کے بھنبھنانے اور پریشان کرنے کی وجہ سے قاری یا انسان کی نیند حرام ہوئی۔

اس کے بعد اب آپ تیسرے جملے پر دھیان دیجیے، جس کے بارے میں مصنف نے یہ اطلاع دی ہے کہ چاہے وہ ہندو ہوں، مسلم ہوں، سکھ ہوں، عیسائی ہوں، یہودی ہوں یا پھر کسی اور مذاہب کے لوگ ہوں سب کے سب اس ننھے سے پرندے سے ہمیشہ ناراض و ناخوش ہی رہتے ہیں۔ کیوں کہ یہ ہر مذاہب کے لوگوں کی نیندیں خراب کر دیتا ہے۔ اس سادہ سے جملے میں مصنف نے اپنی فنی چابک دستی سے ایک

خوب صورت پہلو یہ بھی پیش کر دیا ہے کہ دنیا میں جتنے بھی مذاہب کے ماننے والے لوگ ہیں جو ہمیشہ باہمی نا اتفاقی کے شکار رہتے ہیں اور ایک دوسرے سے متفق نہیں ہو پاتے ہیں۔ وہ سب کے سب اس ننھے سے پرندے سے (جو رات بھر کان پر بھنبھناتا ہے، پریشان کرتا ہے، راتوں کی نیندیں حرام کرتا ہے، ایک پل بھی چین سے سونے نہیں دیتا) خوف کھائے ہوئے ہیں اور متفقہ طور پر ناراض بھی ہیں۔

چوتھے جملے پر مزید غور و فکر کرنے کے بعد مصنف یہ اطلاع فراہم کرتا ہے کہ ہر دن اس سے مقابلہ کرنے کے لئے بہت سی مہمیں تیار کی جاتی ہیں بہت سی چالیں سوچی جاتی ہیں۔ اتنا سب کچھ ہونے کے بعد بھی مصنف اس پرندے کا کچھ بھی اتا پتا نہیں لگنے دیتا۔

اب پانچویں اور آخری جملے (مگر مچھروں کے جنرل کے سامنے کسی کی نہیں چلتی) پر غور و فکر کرنے کے بعد یہی حل نکلتا ہے کہ یہ ننھا سا پرندہ نہ تو بھڑ ہے، نہ تو مکھی ہے، نہ تو بھنورا ہے اور نہ ہی کوئی اور پرندہ۔ اگر یہ ہے تو یقیناً مچھر ہی ہے۔ سب کے سامنے یہاں تک لانے کے بعد مصنف اپنے قاری کو اس بھنبھناتے ہوئے ننھے سے پرندے (جس نے لوگوں کی نیندیں حرام کر رکھی ہیں) کو چالاک، ہوشیار، خبردار، اہم اور طاقت ور کی شکل میں پیش کرتا ہے۔ یعنی وہ ننھا سا پرندہ اتنا ہوشیار اتنا طاقت ور ہے کہ اس کے مقابل میں بہت سی مہمیں بہت سے جنگ کے نقشے بہت سے پلان بنائے جاتے ہیں لیکن پھر بھی انسانوں کے صرف اور صرف شکست ہی ہاتھ آتی ہے اس کے علاوہ اور کچھ نہیں۔

مصنف نے دوسرے اقتباس میں تو کمال ہی کر دیا مزید لکھتے ہیں کہ انسان ویسے تو بڑے ڈیل ڈول کا مالک ہے لیکن زرا سے مچھر پر قابو نہیں پا سکتا۔ اس جملے میں نظامی صاحب نے انسان کی بے بسی و ناچاری کو ابھارا ہے اور آگے لکھتے ہیں کہ مچھر اپنے حملوں سے باز نہیں آتے اور یہ بات بھی ہے کہ وہ کسی سے ڈرتے بھی نہیں بلکہ اعلان کرتے ہوئے آتے ہیں۔ آخری مرکب جملے میں بے چارہ آدم زاد کہہ کر مچھروں کے مقابلے میں انسانوں کی بے بسی، ناچاری اور بے چارگی کو نمایاں کیا ہے۔

نظامی صاحب نے تیسرے اقتباس میں انسان کے عہدِ عمر (بچپن، بڑھاپا) اس کے سماجی مرتبے (اعلیٰ، ادنیٰ) اس کے طبقے (امیر، غریب) اور اس کی جنس (مرد، عورت) کے حوالے سے یہ بتایا ہے کہ ان میں کسی سے بھی تعلق رکھنے والا چاہے وہ انسان ہو یا جانور مچھر کے حملے سے بچا نہیں ہے کیوں کہ مچھر کا اپنا ایک اصول ہے کہ وہ اپنے دشمن کے دوست کو بھی اپنا دشمن سمجھتا ہے اور ان کے ساتھ ساتھ ان کے دشمنوں کو بھی تکلیف پہنچاتا ہے۔

05.08 خلاصہ

سب سے پہلے ہم نے اس اکائی میں آپ کو خواجہ حسن نظامی کے حالاتِ زندگی سے واقف کرایا۔ اس کے بعد ان کی انشائیہ نگاری، معاشرتی زندگی سے واقف کرایا اور اس کے بعد ہم نے اس اکائی میں ان کا انشائیہ ''مچھر'' کا متن اور اس کا تنقیدی جائزہ بھی پیش کیا ہے۔ خواجہ حسن نظامی کی ولادت ۱۸۷۹ء کو دہلی کی بستی حضرت نظام الدینؒ میں ہوئی۔ اُن کے والد کا نام حافظ سید عاشق حسین تھا جو درگاہ شریف کے پیرزادوں میں سے تھے۔ ان کی والدہ کا نام سیدہ چہیتی بیگم تھا۔ ان کا شجرہ حضرت علی مرتضیٰؓ سے ملتا ہے۔ خواجہ حسن نظامی کے والدین ان سے بے پناہ محبت کرتے تھے اور ان کا نام قاسم علی رکھا تھا۔ ان کے ماموں انہیں پیار سے علی حسن کہتے تھے۔ خواجہ حسن نظامی کی عرفیت حسن نظامی تھی۔ خواجہ حسن نظامی نے اپنی ابتدائی تعلیم بستی نظام الدین میں اُردو، عربی اور فارسی میں حاصل کی۔ ان کے اساتذہ میں مولانا اسماعیل کاندھلوی، مولانا یحییٰ کاندھلوی جیسی عظیم ہستیاں تھیں۔ انہوں نے اپنی پڑھائی جاری رکھنے کے لئے مولانا رشید احمد گنگوہی کے مدرسہ رشیدیہ گنگوہ میں تقریباً ۱۵ مہینے گزارے اور وہیں سے فراغت حاصل کی۔ اٹھارہ سال کی عمر میں ہی ان کی شادی سیدہ حبیب بانو سے ہوئی جوان کے

حقیقی چچا سید معشوق علی کی دختر نیک اختر تھیں۔ خواجہ حسن نظامی کا بچپن بہت ہی زیادہ تکلیفوں میں گزرا۔ ان کے والد کتابوں کی جلد سازی کر کے اپنے گھر کا خرچ چلاتے تھے۔ خود نظامی صاحب نے درگاہ کے زائرین کے جوتوں کی حفاظت کر کے گھر والوں کی مدد کی۔ گزر اوقات کے لئے نظامی صاحب نے پھیری لگا کر کتابیں اور دہلی کی عمارتوں کے فوٹو بھی فروخت کیے۔

خواجہ حسن نظامی اُردو ادب کی تاریخ میں کئی حیثیتوں سے یاد رکھے جائیں گے۔ روزنامچہ کو باقاعدہ صنف کی حیثیت انہوں نے ہی دی۔ قلمی چہروں کا سلسلہ بھی انہوں نے ہی شروع کیا۔ بحیثیت صحافی ان کا نام بہت بلند ہے کہ ان کی سرپرستی اور ادارت میں سب سے زیادہ روزنامے، ہفتہ وار اخبار اور ماہانہ جرائد شائع ہوئے۔ ''مفلسی کا مجرب علاج'' ۱۹۰۰ء میں شائع ہوئی جو ایک عربی رسالے کا ترجمہ ہے۔ ۱۹۰۸ء میں انہوں نے ایک رسالہ نظام المشائخ جاری کیا۔ جب نظامی صاحب مصر، شام اور حجاز کے سفر پر تھے تب انہوں نے روزنامچے لکھے، جو قسط وار ان کے رسالے میں شائع ہوئے۔ انہوں نے میرٹھ سے ہفت روزہ اخبار ''توحید'' ۱۹۱۳ء میں جاری کیا جس کے وہ ایڈیٹر مقرر کیے گئے۔ ''توحید'' پر پابندی کے بعد نظامی صاحب نے درویش، منادی، روزنامہ رعیت، ماہانہ دین دنیا، منادی، ماہ نامہ آستانہ پیر بھائی، تبلیغ نسواں، غریبوں کا اخبار، عورتوں کا اخبار اور بہت سے رسالے جاری کیے۔ ان تمام اخبارات و رسائل سے خواجہ حسن نظامی کی کسی نہ کسی طور پر وابستگی رہی ہے۔

خواجہ حسن نظامی ایک مورخ بھی تھے۔ ۱۸۵۷ء کے انقلاب پر ان کی گہری نظر تھی۔ انہوں نے اس ضمن میں جو کتابیں لکھی ہیں وہ تاریخ کا بیش قیمتی سرمایہ ہیں۔ بیگمات کے آنسو، غدر کے اخبار، غدر کے فرمان، بہادر شاہ ظفر کا مقدمہ، غدر کی صبح و شام، محاصرہ دہلی کے خطوط ان کی نہایت اہم کتابیں ہیں۔ خواجہ حسن نظامی نے ہر موضوع پر لکھا، شاید ہی کوئی ایسا موضوع ہو جس پر ان کی کوئی تحریر نہ ملے۔ انہوں نے آپ بیتی بھی لکھی، سفرنامے بھی لکھے، سفرنامہ حجاز مصر و شام، سفرنامہ ہندوستان، سفرنامہ پاکستان، قابل ذکر کتابیں ہیں۔ 'گاندھی نامہ' اور 'یزید نامہ' بھی ان کی اہم کتابوں میں سے ہیں۔ خواجہ حسن نظامی نے انشائیے بھی لکھے۔ جھینگر کا جنازہ، گلاب تمہارا کیکر ہمارا، مرغ کی اذان، مچھر، مکھی، الّو ان کے مشہور انشائیے ہیں۔ خواجہ حسن نظامی کا اسلوب سب سے الگ تھا۔ وہ ایک صاحب طرز انشا پرداز تھے، اپنے اسلوب کے موجد بھی اور خاتم بھی۔

05.09 فرہنگ

اطاعت	: پیروی، تعمیل حکم، فرماں برداری	ضرب المثل	: وہ قول یا جملہ جو مثال کے طور پر مشہور ہو، کہاوت
الٹی میٹم	: چیتاونی، آخری انتباہ	ضمن	: درمیان
انحصار	: دارومدار	طریق تمدن	: رہنے سہنے کا انداز
انشاپرداز	: مضمون نگار	عارفانہ کلمات	: روحانی، صوفیانہ کلمات
بودوباش	: سکونت، رہنے سہنے کا عمل	فروخت	: بیچنا
تجویز	: مقرر یا طے کرنا	قیاس	: اندازہ کرنا
تسبیح وتقدیس	: خدا کی پاکیزگی بیان کرنا		

چابک دستی	: پھرتی و چالاکی	مدبر	: ذہین، دانش ور، زیرک
حماقت	: نادانی، بے وقوفی	معاش	: رزق، روزگار
خلوت خانہ	: علیحدگی کی جگہ، تنہا رہنے کی جگہ	منقطع	: ختم، توڑنا
رغبت	: خواہش، آرزو، کسی چیز کی طرف طبیعت کا جھکاؤ	موجد	: ایجاد کرنے والا
		موذی	: تکلیف پہنچانے والا
روزنامچہ	: وہ کتاب جس میں روزانہ کے تاریخ وار حالات یا حساب لکھے جائیں، ڈائری	موئرخ	: تاریخ مرتب کرنے والا
		ندامت	: شرمندگی
سرکش	: نافرمان، مغرور	نوشتہ	: لکھا ہوا، سند
شکست	: ناکامی	ہولناک	: ہیبت، دہشت، ڈر
صلواتیں	: گالیاں، بری باتیں	یورش	: حملہ، دھاوا، چڑھائی

05.10 نمونہ امتحانی سوالات

الف: درجِ ذیل سوالوں کے جوابات ۱۰/۱۰ سطروں میں دیجیے:

سوال نمبر۱ انشائیہ ''مچھر'' کا خلاصہ پیش کیجیے؟

سوال نمبر۲ خواجہ حسن نظامی کے حالاتِ زندگی پر مختصر نوٹ لکھیے؟

سوال نمبر۳ خواجہ حسن نظامی نے 'سی پارۂ دل' میں کتنے انشائیے لکھے؟ اس میں سے پانچ انشائیوں کے نام تحریر کیجیے۔

ب: درج ذیل سوالوں کے جوابات ۳۰/۳۰ سطروں میں دیجیے:

سوال نمبر۱ خواجہ حسن نظامی کی انشائیہ نگاری کو اپنے الفاظ میں بیان کیجیے؟

سوال نمبر۲ خواجہ حسن نظامی کا مشہور انشائیہ ''مچھر'' کا تنقیدی جائزہ پیش کیجیے؟

سوال نمبر۳ انشائیہ ''مچھر'' میں خواجہ حسن نظامی نے کن کن زاویوں پر بات کی ہے؟ روشنی ڈالیے۔

معروضی سوالات

سوال نمبر۱ : خواجہ حسن نظامی کی ولادت کب ہوئی؟

(الف) ۱۸۷۹ء (ب) ۱۸۹۵ء (ج) ۱۹۰۰ء (د) ۱۹۱۵ء

سوال نمبر۲ : خواجہ حسن نظامی کی پیدائش کہاں ہوئی؟

(الف) بریلی (ب) دہلی (ج) امرتسر (د) لکھنؤ

سوال نمبر۳ : خواجہ حسن نظامی کے والد کا کیا نام تھا؟

(الف) ارشد حسین (ب) راشد حسین (ج) حافظ سید عاشق حسین (د) واجد حسین

سوال نمبر۴ : خواجہ حسن نظامی کی وفات کب ہوئی ؟

(الف) ۱۹۱۰ء (ب) ۱۹۶۰ء (ج) ۱۹۲۵ء (د) ۱۹۵۵ء

سوال نمبر۵ : کس مصنف کے اخبار 'منادی' کے خلاف ہفتہ وار اخبار 'سنادی' نکالا گیا؟

(الف) رشید احمد صدیقی کے (ب) خواجہ حسن نظامی کے (ج) محمد حسین آزاد کے (د) پریم چند کے

سوال نمبر۶ : سفر نامہ حجاز مصر و شام، سفر نامہ ہندوستان، سفر نامہ پاکستان کس مصنف کی کتابیں ہیں؟

(الف) راجندر سنگھ بیدی (ب) خواجہ حسن نظامی (ج) غلام عباس (د) پریم چند

سوال نمبر۷ : جھینگر کا جنازہ اور اُلّو کس کے مشہور انشائے ہیں؟

(الف) مرزا فرحت اللہ بیگ (ب) رشید احمد صدیقی (ج) خواجہ حسن نظامی (د) پطرس بخاری

سوال نمبر۸ : خواجہ حسن نظامی نے مولانا رشید احمد گنگوہی کے مدرسہ رشیدیہ گنگوہ میں کتنے مہینے گزارے؟

(الف) ۲ مہینے (ب) ۳ مہینے (ج) ۵ مہینے (د) ۱۵ مہینے

سوال نمبر۹ : انشائیہ ''مچھر'' کے مصنف کون ہیں؟

(الف) پریم چند (ب) غلام عباس (ج) خواجہ حسن نظامی (د) انتظار حسین

سوال نمبر۱۰ : ''مچھر اور مکھی'' کس مصنف کے انشائیے ہیں؟

(الف) خواجہ حسن نظامی (ب) غلام عباس (ج) رشید احمد صدیقی (د) منٹو

معروضی سوالات کے جوابات

جواب نمبر۱ : (الف) ۱۸۷۹ء جواب نمبر۶ : (ب) خواجہ حسن نظامی

جواب نمبر۲ : (ب) دہلی جواب نمبر۷ : (ج) خواجہ حسن نظامی

جواب نمبر۳ : (ج) حافظ سید عاشق حسین جواب نمبر۸ : (د) ۱۵ مہینے

جواب نمبر۴ : (د) ۱۹۵۵ء جواب نمبر۹ : (ج) خواجہ حسن نظامی

جواب نمبر۵ : (ب) خواجہ حسن نظامی کے جواب نمبر۱۰ : (الف) خواجہ حسن نظامی

05.11 حوالہ جاتی کتب

۱۔ انشائیہ از ڈاکٹر آدم شیخ

۲۔ انشائیہ کی بنیاد از ڈاکٹر سلیم اختر

۳۔ آپ بیتی از خواجہ حسن نظامی

۴۔ خواجہ حسن نظامی حیات اور ادبی خدمات از امام مرتضٰی نقوی

۵۔ خواجہ حسن نظامی حیات اور کارنامے از خواجہ حسن ثانی نظامی (مرتبہ)

۶۔ سوانح عمری خواجہ حسن نظامی از ملّا واحدی

اکائی 06 چڑیا چڑے کی کہانی : ابوالکلام آزاد

ساخت

06.01 : اغراض ومقاصد
06.02 : تمہید
06.03 : ابوالکلام آزاد کے حالاتِ زندگی
06.04 : ابوالکلام آزاد کی انشائیہ نگاری
06.05 : انشائیہ ''چڑیا چڑے کی کہانی'' کا متن ''اقتباس''
06.06 : انشائیہ ''چڑیا چڑے کی کہانی'' کا تنقیدی جائزہ
06.07 : خلاصہ
06.08 : فرہنگ
06.09 : نمونہ امتحانی سوالات
06.10 : حوالہ جاتی کتب

06.01 اغراض ومقاصد

اس اکائی میں مولانا ابوالکلام آزاد کی ادبی خدمات اور حالاتِ زندگی کے ساتھ ساتھ ان کی شخصیت کے نمایاں پہلوؤں پر روشنی ڈالی جائے گی خصوصاً ابوالکلام آزاد کی خطوط نگاری کی خصوصیات سے بحث کی جائے گی علاوہ ازیں مولانا کی اہم تصانیف خاص طور پر آپ کے خطوط کے مجموعے بنام غبارِ خاطر میں شامل ''چڑیا چڑے کی کہانی'' کے متن کے ساتھ اس کا تجزیہ پیش کیا جائے گا۔

06.02 تمہید

خطوط نگاری بھی دیگر اصنافِ ادب کی طرح ایک اہم اور ضروری ادبی صنف ہے، عمومی طور پر اس کی حیثیت نجی و ذاتی ہوتی ہے۔ کسی شخصیت کے خطوط اس کی ہمہ شخصیت کے آئینہ دار ہوتے ہیں۔ خطوط جب علمی مضامین، اِنسانی مسائل پسند و ناپسند اور اظہارِ بیان کے اعتبار سے آفاقی ہو جاتے ہیں تو زندہ جاوید ہو کر ادب میں شامل کر لیے جاتے ہیں۔ خطوط نگاری کی اہمیت پہلے بھی تھی اور آج بھی ہے۔ حالاں کہ موجودہ دور میں خطوط نگاری کی شکل مختلف ہوگئی ہے۔ دنیا کی تقریباً اکثر زبانوں میں خطوط کے مجموعے پائے جاتے ہیں۔ انگریزی فرانسیسی، جرمن و دیگر یورپی زبانوں میں ادیبوں کے خطوط کو قدر کی نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے۔ عربی وفارسی میں بھی قدیم زمانے سے خطوط لکھنے کی روایت رہی ہے۔ مروجہ خطوط کی نگاری کی چند اقسام درج ذیل ہیں:

۱۔ نجی خطوط ۲۔ علمی و ادبی خطوط ۳۔ تنبیہی خطوط ۴۔ مبارکبادی خطوط

۵۔ تعزیتی خطوط ۶۔ عوامی خطوط ۷۔ سرکاری خطوط ۸۔ کاروباری خطوط

۹۔ ناصحانہ خطوط وغیرہ

خطوط نگاری ایک بہت بڑا فن ہے۔ایک اچھا خط لکھنے کے لئے اس میں چند اَوصاف کا ہونا انتہائی ضروری ہے جیسے قطعیت، دل چسپی اور لطافت۔اچھے خط کی ایک اہم خوبی لطافت ہے یعنی پڑھنے پر بوجھ محسوس نہ ہو۔لطافت لہجہ اور انداز تحریر دونوں میں نمایا ہونا چاہیے۔

06.03 ابوالکلام آزاد کے حالاتِ زندگی

مولانا ابوالکلام آزاد ایک مشہور ادیب، شاعر اور صحافی تھے۔مولانا ابوالکلام آزاد کی پیدائش ۱۱ر نومبر ۱۸۸۸ء میں شہرِ مقدس مکہ میں ہوئی۔مولانا کا اصل نام محی الدین احمد تھا اور تاریخی نام فیروز بخت تھا۔مولانا نے چودہ برس تک کی ابتدائی تعلیم اپنے والدِ محترم مولانا محمد خیرالدین سے حاصل کی۔ان کی والدہ ماجدہ امیر عرب شیخ کی بیٹی تھیں اور ان کے والد، مولانا خیرالدین، افغان نژاد بنگالی مسلمان تھے۔

مولانا خیرالدین کا شمار اَکابر علمائے اہل سنّت میں ہوتا ہے۔آپ نے علم حدیث تفسیر قرآن اور عقائد پر مستند کتابیں تصنیف کیں۔ مولانا آزاد کے آباواَجداد مغل شہنشاہ بابر کے دور میں اَفغانستان سے ہندوستان ہجرت کر کے آئے تھے۔آپ کی مادری زبان خالص عربی تھی، آپ کے والدِ ماجد نے گھر میں اردو بولنے پر پابندی عائد کر رکھی تھی لیکن مولانا ابوالکلام آزاد چوری چھپے اردو زبان سیکھتے تھے آپ کم سنی سے ہی کافی ذہین اور بے پناہ فطری صلاحیتوں کے مالک تھے اس وجہ سے آپ نے بہت کم وقت میں ہی عربی فارسی کے ساتھ ساتھ اردو زبان بولنے، لکھنے اور پڑھنے پر عبور حاصل کر لیا تھا۔

مولانا آزاد نے اِبتدائی تعلیم گھر میں حاصل کی تھی۔درس نظامی کی کتب کے ساتھ آپ نے اپنے ذاتی مطالعہ کی بدولت اردو شاعری کے سات جدید علوم جیسے تھیلوجیکل سے واقفیت، فلسفہ، جیومیٹری، ریاضی اور اَلجبرا جیسے اہم علوم وفنون میں مہارت حاصل کی۔انہوں انگریزی زبان، عالمی تاریخ اور سیاست میں اپنے مطالعہ کو وسیع و مضبوط کیا۔آپ کی تقریر اور تحریر میں ایک منفرد قسم کی چاشنی اور روانی پائی جاتی تھی۔آپ کی سیاسی و اصلاحی تقاریر ہمیشہ عوام الناس کی توجہ کا مرکز بنی رہیں۔

06.04 ابوالکلام آزاد کی تصنیفات

غبارِ خاطر: مولانا کے تمام ادبی کارناموں میں جتنی شہرت غبارِ خاطر کو حاصل ہوئی وہ کسی دوسری کتاب کے حصے میں نہیں آئی۔

غبارِ خاطر مولانا کے ان خطوط کا مجموعہ ہے جو انہوں نے قلعہ احمد نگر میں نظر بندی کے دوران اپنے دوست مولانا حبیب الرحمٰن شیروانی کے نام لکھے تھے۔اس کتاب کا نام مولانا نے میر عظمت اللہ بے خبر بلگرامی کے مختصر رسالے ''غبار خاطر'' سے مستعار لیا ہے۔ مولانا ۱۰ر اگست ۱۹۴۲ء سے لے کر ۱۵ر جون ۱۹۴۵ء تک سیاسی قید و بند میں رہے۔ابتداً آپ کو احمد نگر کے قلعہ میں اور آخری ڈھائی مہینے احمد نگر سے بانکوڑہ جیل میں منتقل کر دیا گیا تھا۔مولانا نے اپنے عزیز دوست مولانا حبیب الرحمٰن خان شیروانی کے نام پہلا خط ۱۰ر اگست ۱۹۴۲ء کو اور آخری خط ۱۶ر ستمبر ۱۹۴۳ء کو لکھا تھا۔غبار خاطر مولانا کی آخری کتاب تسلیم کی جاتی ہے۔

غبار خاطر کو آزاد کی ذاتی ڈائری کا درجہ حاصل ہے۔ اس میں مولانا نے قید خانے کی تمام کارگزاریوں، مصیبتوں کا ذکر انتہائی دل کش پیرائے میں پیش کیا ہے۔ اس میں اِنشا پردازی کا وہ اَنداز استعمال کیا گیا ہے جس کی مثال اردو ادب میں شاذ و نادر ہے۔ اس مجموعے میں کل چوبیس (۲۴) خطوط شامل ہیں۔ داخل نصاب خط چڑیا چڑے کی کہانی کا شمار نمبر اُنیس (۱۹) ہے۔ غبار خاطر میں اردو کی تقریباً دو درجن سے زائد نامور شعرا کے کم و بیش ۱۱۰ رشعر اور مصرعے اِستعمال کیے گئے ہیں۔

خطبات آزاد: مولانا ابوالکلام آزاد ادب کے ساتھ ساتھ دینی علوم وفنون میں بھی دست رس رکھتے تھے یہی وجہ ہے کہ آپ کے خطبات اور تقاریر میں ایک خاص اثر انگیزی پائی جاتی ہے۔ خطبات آزاد مختلف موضوعات پر دیے گیے ملی، سماجی اور سیاسی خطبات کا مجموعہ ہے۔ اس میں مولانا نے سوئی ہوئی قوم مسلم کو بیدار کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس میں جذبہ دینی کے ساتھ قومی کی شمع روشن کرنے کی کوشش کی ہے۔ خطبات آزاد علمی و ادبی حلقوں میں قدر کی نگاہوں سے دیکھی جاتی ہے۔

قولِ فیصل: اس میں مولانا نے حکومت کے استغاثے کے جوابات شامل ہیں۔ اس میں مولانا نے اپنی گرفتاری کی روداد کے ساتھ مقدمے کی تفصیلات بھی پیش کی ہیں۔ اس میں جذبۂ آزادی کو بیدار اور مہمیز کیا گیا ہے۔ رسالے پر لکھا ہے کہ اسلام میں کسی حال میں بھی جائز نہیں کہ مسلمان آزادی کھوکر زندگی بسر کریں انہیں مرجانا چاہیے، یا آزاد رہنا چاہی، تیسری راہ اسلام میں کوئی نہیں۔

تذکرہ: یہ مولانا آزاد کی خودنوشت سوانح عمری ہے جسے تذکرہ کے نام سے لکھا گیا ہے۔ اس میں مولانا نے اپنے اَسلاف کے متعلق تفصیل سے معلومات پیش کی ہیں ۱۹۱۶ء میں مولانا نے اس کو رانچی کی قید و بند کی زندگی کے دَوران لکھا تھا۔ اَلہلال اور البلاغ کے مہتمم کے اصرار اور فرمائش پر تذکرہ لکھنا شروع کیا تھا۔ اس کی پہلی جلد فضل الدین صاحب کے اِصرار پر اور دوسری جلد مولانا سے عبدالرزاق ملیح آبادی نے لکھوائی تھی جو مولانا کی مکمل سوانح عمری ہے۔

درج بالا کتب کے علاوہ مولانا نے آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی، دعوتِ حیاتِ نو، قرآن کا قانون عروج و زوال، میرا عقیدہ، ہجر و وِصال، ترجمان القرآن، ولادتِ نبوی، حجت ابراہیمی وغیرہ۔

06.05 انشائیہ ''چڑیا چڑے کی کہانی'' کا متن ''اقتباس''

قلعہ احمد نگر

۱۷ر مارچ ۱۹۴۳ء

صدیقِ مکرم

زندگی میں بہت سی کہانیاں بنائیں، خود زندگی ایسی گزری جیسے ایک کہانی ہو:

ہے آج جو سرگزشت اپنی
کل اِس کی کہانیاں بنیں گی

آیئے، آج آپ کو چڑیا چڑے کی کہانی سناؤں:

دیگر ہا شنیدستی، ایں ہم شنو

یہاں کمرے جو ہمیں رہنے کو ملے ہیں، پچھلی صدی کی تعمیرات کا نمونہ ہیں۔ چھت لکڑی کے شہتیروں کی ہے اور شہتیروں کے سہارے کے لئے محرابیں ڈال دی ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ جا بجا گھونسلا بنانے کے قدرتی گوشے نکل آئے اور گوریّاؤں کی بستیاں آباد ہو گئیں۔ دن بھر ان کا ہنگامۂ تگ و دَو گرم رہتا ہے۔ کلکتہ میں بالی گنج کا علاقہ چوں کہ کھلا اور درختوں سے بھرا ہے۔ اس لئے وہاں بھی مکانوں کے برآمدوں اور کارنسوں پر چڑیوں کے غول ہمیشہ حملہ کرتے رہتے ہیں، یہاں کی ویرانی دیکھ کر گھر کی ویرانی یاد آ گئی؛

اُگ رہا ہے در و دیوار پہ سبزہ غالبؔ
ہم بیاباں میں ہیں اور گھر میں بہار آئی ہے

گزشتہ سال جب اگست میں یہاں ہم آئے تھے، تو ان چڑیوں کی آشیاں سازیوں نے بہت پریشان کر دیا تھا۔ کمرہ کے مشرقی گوشہ میں منہ دھونے کی ٹیبل لگی ہے۔ ٹھیک اس کے اُوپر، نہیں معلوم کب سے ایک پرانا گھونسلا تعمیر پا چکا تھا۔ دن بھر میدان سے تنکے چن چن کر لاتیں اور گھونسلے میں بچھانا چاہتیں۔ وہ ٹیبل پر گر کے اسے کوڑے کرکٹ سے اَٹ دیتے۔ اِدھر پانی کا جگ بھروا کے رکھا، اُدھر تنکوں کی بارش شروع ہو گئی۔ پچھّم کی طرف چار پائی دیوار سے لگی تھی۔ اُس کے اُوپر نئی تعمیروں کی سرگرمیاں جاری تھیں۔ ان نئی تعمیروں کا ہنگامہ اور زیادہ عاجز کر دینے والا تھا۔ ان چڑیوں کو ذرا سی تو چونچ ملی ہے اور مٹھی بھر کا بدن نہیں، لیکن طلب وسعی کا جوش اس بلا کا پایا ہے کہ چند منٹوں کے اندر بالشت بھر کلفات کھود کے صاف کر دیں گی۔ حکیم ارشمیدس (Archimedes) کا مقولہ مشہور ہے Dos moi pau sto kai ten gen kineso مجھے فضا میں کھڑا ہونے کی جگہ دے دو، میں کرۂ اَرضی کو اس کی جگہ سے ہٹا دوں گا۔ اس دعوے کی تصدیق ان چڑیوں کی سرگرمیاں دیکھ کر ہو جاتی ہے۔ پہلے دیوار پر چونچ مار مار کے اتنی جگہ بنا لیں گی اور اس زور سے چلائیں گی کہ سارا جسم سکڑ سکڑ کر کانپ نے لگے گا اور پھر تھوڑی دیر کے بعد دیکھیے، تو کئی اِنچ کلفات اُڑ چکی ہوگی۔ مکان چوں کہ پرانا ہے۔ اس لئے نہیں معلوم کتنی مرتبہ چونے اور ریت کی تہیں دیوار پر چڑھتی رہی ہیں۔ اب مل ملا کر تعمیری مسالہ کا ایک موٹا سا دَل بن گیا ہے۔ ٹوٹتا ہے تو سارے کمرے میں گرد کا دھواں پھیل جاتا ہے اور کپڑوں کو دیکھیے، تو غبار کی تہیں جم گئی ہیں۔

اس مصیبت کا علاج بہت سہل تھا، یعنی مکان کی اَزسرِ نو مرمّت کر دی جائے اور تمام گھونسلے بند کر دیے جائیں، لیکن مرمّت بغیر اس کے ممکن نہ تھی کہ معمار بلائے جائیں اور یہاں باہر کا کوئی آدمی اندر قدم رکھ نہیں سکتا، یہاں ہمارے آتے ہی پانی کے نل بگڑ گئے تھے۔ ایک معمولی مستری کا کام تھا، لیکن جب تک ایک انگریزی فوجی انجینئر کمانڈنگ آفیسر کا پروانہ راہ داری لے کر نہیں آیا، ان کی مرمّت نہ ہو سکی۔
چند دنوں تک تو میں نے صبر کیا لیکن پھر برداشت نے صاف جواب دے دیا اور فیصلہ کرنا پڑا کہ اب لڑائی کے بغیر چارہ نہیں ۔

من و گُرز و میدان و افراسیاب

یہاں میرے سامان میں ایک چھتری بھی آ گئی ہے، میں نے اٹھائی اور اعلان جنگ کر دیا۔ لیکن تھوڑی ہی دیر کے بعد معلوم ہو گیا کہ اس کوتاہ دستی کے ساتھ ان حریفانِ سقف و محراب کا مقابلہ ممکن نہیں۔ حیران ہو کر کبھی چھتری کی نارسائی دیکھتا، کبھی حریفوں کی بلند آشیانی۔ بے اختیار حافظ کا شعر یاد آ گیا ۔

خیال قد بلندی تو می کند دل من
تو دست کوتہ من بین و آستینِ دراز

اب کسی دوسرے ہتھیار کی تلاش ہوئی۔ برآمدہ میں جالا صاف کرنے کا بانس پڑا تھا۔ دوڑتا ہوا گیا اور اسے اٹھالایا۔ اب کچھ نہ پوچھیے کہ میدانِ کارزار میں کس زور کا رَن پڑا۔ کمرہ میں چاروں طرف حریف طواف کر رہا تھا اور میں بانس اٹھائے دیوانہ وار اس کے پیچھے دوڑ رہا تھا۔ فردوسی اور نظامی کے رجز بے اختیار زبان سے نکل رہے تھے ؎

بہ خنجر زمیں را مَیستاں کنم
بہ نیزہ ہوا رانَیستاں کنم

آخر میدان اپنے ہی ہاتھ رہا، اور تھوڑی دیر کے بعد کمرہ ان حریفانِ سقف ومحراب سے بالکل صاف تھا:

بیک تاختن تا کجا تا ختم
چہ گردن کشاں را سر اَنداختم

اب میں نے چھت کے تمام گوشوں میں فتح مندانہ نظر ڈالی اور مطمئن ہوکر لکھنے میں مشغول ہوگیا۔ لیکن ابھی پندرہ منٹ بھی پورے نہیں گزرے ہوں گے کہ کیا سنتا ہوں، حریفوں کی رجز خوانیوں اور ہوا پیمائیوں کی آوازیں پھر اُٹھ رہی ہیں۔ سر اُٹھا کے جو دیکھا، تو چھت کا ہر گوشہ اُن کے قبضہ میں تھا۔ میں فوراً اُٹھا اور بانس لاکر پھر معرکۂ کارزار گرم کر دیا:

بر آرم دیار از ہمہ لشکر ش
بہ آتش بسوزم ہمہ کشورش

اس مرتبہ حریفوں نے بڑی پامردی دکائی۔ ایک گوشہ چھوڑنے پر مجبور ہوتے، تو دوسرے میں ڈٹ جاتے، لیکن بالآخر میدان کو پیٹھ دکھانی ہی پڑی۔ کمرہ سے بھاگ کر برآمدہ میں آئے اور وہاں اپنا لاؤلشکر نئے سرے سے جمانے لگے۔ میں نے وہاں بھی تعاقب کیا۔ اور اس وقت تک ہتھیار ہاتھ سے نہیں رکھا کہ سرحد سے، بہت دور تک میدان صاف نہیں ہوگیا تھا۔ اب دشمن کی فوج تتر بتر ہوگئی تھی۔ مگر یہ اندیشہ باقی تھا کہ کہیں پھر اکٹھی ہوکر میدان کا رخ نہ کرے۔ تجربے سے معلوم ہوا تھا کہ بانس کے نیزے کی ہیبت دشمنوں پر خوب چھا گئی ہے۔ جس طرف رخ کرتا تھا اسے دیکھتے ہی کلمۂ فرار پڑھتے تھے۔ اس لئے فیصلہ کیا کہ ابھی کچھ عرصہ تک اس کمرہ میں رہنے دیا جائے۔ اگر کسی اِکا دُکا حریف نے رخ کرنے کی جرأت بھی کی، سربفلک نیزہ دیکھ کر الٹے پاؤں بھاگنے پر مجبور ہو جائے گا۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ سب سے پرانا گھونسلا منھ دھونے کی ٹیبل کے اوپر تھا۔ بانس اس طرح وہاں کھڑا کر دیا گیا کہ اس کا سرا ٹھیک ٹھیک گھونسلے کے دروازے کے پاس پہنچ گیا تھا۔ اب گو مستقبل اندیشوں سے خالی نہ تھا، تاہم طبیعت مطمئن تھی کہ اپنی طرف سے سروسامانِ جنگ میں کوئی کمی نہیں کی گئی۔ میر کا یہ شعر زبانوں پر چڑھ کر پامال ہو چکا ہے، تاہم موقعہ کا تقاضہ ٹالا بھی نہیں جا سکتا:

شکست و فتح نصیبوں سے ہے ولے اے میؔر
مقابلہ تو دلِ ناتواں نے خوب کیا

اب گیارہ بج رہے تھے، میں کھانے کے لئے چلا گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد واپس آیا، تو کمرے میں قدم رکھتے ہی ٹھٹک کے رہ گیا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ سارا کمرہ پھر حریف کے قبضہ میں ہے اور اس اطمینان و فراغت سے اپنے کاموں میں مشغول ہیں، جیسے کوئی حادثہ پیش آیا ہی نہیں۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ جس ہتھیار کی ہیبت پر اس درجہ بھروسہ کیا گیا تھا، وہی حریفوں کی کامجوئیوں کا ایک نیا آلہ ثابت ہوا۔ بانس کا سرا جو گھونسلے سے

باہر لگا ہوتھا، کھونسلے میں جانے کے لئے اب دہلیز کا کام دینے لگا ہے۔ تنکے چن چن کر لاتے ہیں اور اس نوتعمیر دہلیز پر بیٹھ کر بہ اطمینانِ تمام گھونسلے میں بچھاتے جاتے ہیں۔ساتھ ہی چوں چوں بھی کرتے جاتے ہیں۔عجب نہیں کہ یہ مصرعہ گنگناتے ہوں کہ ؎

عدو شود سبب خیر گر خدا خواہد

اپنی وہمی فتح مندیوں کا یہ حسرت انگیز انجام دیکھ کر بے اختیار ہمت نے جواب دے دیا۔صاف نظر آ گیا کہ چند لمحوں کے لئے حریف کو عاجز کر دینا تو آسان ہے، مگر ان کے جوشِ استقامت کا مقابلہ کرنا آسان نہیں اور اب اس میدان میں ہار مان لینے کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں رہا!

بیا کہ، ما سپر انداختیم ،اگر جنگ ست!

اب یہ فکر ہوئی کہ ایسی رسم وراہ اختیار کرنی چاہیے کہ ان ناخواندہ مہمانوں کے ساتھ ایک گھر میں گزارا ہو سکے۔سب سے پہلے چار پائی کا معاملہ سامنے آیا۔یہ بالکل نئ تعمیرات کی زد میں تھی ، پرانی عمارت کے گرنے اور نئ تعمیروں کے سروسامان سے جس قدر گرد وغبار اور کوڑا کرکٹ نکلتا، سب کا سب اِسی پر گرتا۔اس لئے اسے دیوار سے اتنا ہٹا دیا گیا کہ براہِ راست زد میں نہ رہے۔اس تبدیلی سے کمرے کی شکل ضرور بگڑ گئی لیکن اب اس کا علاج ہی کیا تھا۔جب خود اپنا گھر ہی اپنے قبضہ میں نہ رہا۔تو پھر شکل وترتیب کی آرائشوں کی کسے فکر ہو سکتی تھی۔البتہ منھ دھونے کی ٹیبل کا معاملہ اتنا آسان نہ تھا۔وہ جس گوشے میں رکھا گیا تھا،صرف وہی جگہ اس کے لئے نکل سکتی تھی ذرا بھی اِدھر اُدھر کرنے کی گنجائش نہ تھی۔ مجبوراً یہ انتظام کرنا پڑا کہ بازار سے بہت سے جھاڑن منگوا کر رکھ لیے اور ٹیبل کی ہر چیز پر ایک ایک جھاڑن ڈال دیا۔تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد انہیں اٹھا کر جھاڑ دیتا اور پھر ڈال دیتا۔ایک جھاڑن اس غرض سے رکھنا پڑا کہ ٹیبل کی سطح کی صفائی برابر ہوتی رہے۔سب سے زیادہ مشکل مسئلہ فرش کی صفائی کا تھا۔لیکن اسے بھی کسی نہ کسی طرح حل کیا گیا۔یہ بات طے کر لی گئی کہ صبح کی معمولی صفائی کے علاوہ بھی کمرہ میں بار بار جھاڑو پھر جانا چاہیے۔ایک نیا جھاڑو منگوا کر الماری کی آڑ میں چھپا دیا۔کبھی دن میں دو مرتبہ،کبھی تین مرتبہ،کبھی اس سے بھی زیادہ،اس سے کام لینے کی ضرورت پیش آتی۔یہاں ہر دو کمرے کے پیچھے ایک قیدی صفائی کے لئے دیا گیا ہے۔ظاہر ہے کہ وہ ہر وقت جھاڑو لیے کھڑا نہیں رہ سکتا تھا اور اگر رہ بھی سکتا تو اس پر اتنا بوجھ ڈالنا انصاف کے خلاف تھا۔اس لئے یہ طریقہ اختیار کرنا پڑا کہ خود ہی جھاڑو اٹھا لیا،اور ہمسایوں کی نظریں بچا کے جلد جلد دو چار ہاتھ مار دیے،دیکھیے ان ناخواندہ مہمانوں کی خاطر تو تواضع میں کنّاسی تک کرنی پڑی!

عشق از یں بسیار کرد ست و کند !

ایک دن خیال ہوا کہ جب صلح ہوگئی ،تو چاہیے کہ پوری طرح صلح ہو، یہ ٹھیک نہیں کہ رہیں ایک ہی گھر میں اور رہیں بیگانوں کی طرح ۔میں باورچی خانے سے تھوڑا سا کچا چاول منگوایا اور جس صوفے پر بیٹھا کرتا ہوں ،اس کے سامنے کی دری پر چند دانے چھٹک دیے۔پھر اس طرح سنبھل کے بیٹھ گیا، جیسے ایک شکاری دام بچھا کر بیٹھ جاتا ہے،دیکھیے عرفی کا شعر صورتِ حال پر کیسا چسپاں ہوا ہے:

فتادم دام بر کنجشک وشادم ،یادِ آں ہمت
کہ گر سیمرغ می آمد بدام آزادمی کردم

کچھ دیر تک تو مہمانوں کو توجہ نہیں ہوئی اگر ہوئی بھی تو ایک غلط انداز نظر سے معاملہ آگے نہیں بڑھا۔لیکن پھر صاف نظر آ گیا کہ معشوقانِ ستم پیشہ کے تغافل کی طرح یہ تغافل بھی نظر بازی کا ایک پردہ ہے،ورنہ نیلے رنگ کی دری پر سفید سفید اُبھرے ہوئے دانوں کی کشش ایسی نہیں کہ کام نہ کر جائے:

حور و جنت جلوہ بر زاہد دہد، در راہِ دوست

اندک اندک عشق در کار آورَد بے گانہ را

پہلے ایک چڑیا آئی اور ادھر ادھر کودنے لگی۔ بظاہر چہچہانے میں مشغول تھی مگر نظر دانوں پر تھی۔ وحشی یزدی کیا خوب کہہ گیا ہے:

چہ لطفہا کہ دریں شیوۂ نہانی نیست

عنایتے کہ تو داری بمن، بیانی نیست

پھر دوسری آئی اور پہلی کے ساتھ مل کر دری کا طواف کرنے لگی۔ پھر تیسری اور چوتھی بھی پہنچ گئی۔ کبھی دانوں پر نظر پڑی، کبھی دانہ ڈالنے والے پر کبھی ایسا محسوس ہوتا جیسے آپس میں کچھ مشورہ ہو رہا ہے اور کبھی معلوم ہوتا ہر فرد غور و فکر میں ڈوبا ہوا ہے۔ آپ نے غور کیا ہوگا کہ گوریّا جب تفتیش اور تفحص کی نگاہوں سے دیکھتی ہے تو اس کے چہرے کا کچھ عجیب سنجیدہ انداز ہو جاتا ہے۔ پہلے گردن اُٹھا کر سامنے کی طرف دیکھے گی، پھر گردن موڑ کے داہنے بائیں دیکھنے لگے گی۔ پھر کبھی گردن کو مروڑ دے کر اوپر کی طرف نظر اُٹھائے گی اور چہرے پر تفحص اور اِستفہام کا کچھ ایسا انداز چھا جائے گا، جیسے ایک آدمی ہر طرف متعجبانہ نگاہ ڈال کر اپنے آپ سے کہہ رہا ہے کہ آخر یہ معاملہ ہے کیا، اور ہو کیا رہا ہے؟ ایسی ہی متفحّص نگاہیں اس وقت بھی ہر چہرے پر اُبھر رہی تھیں:

پایم بہ پیش از سر ایں کو نمی رَود

یار اں خبر دہید کہ ایں جلوہ گاہِ کیست

پھر کچھ دیر کے بعد آہستہ آہستہ قدم بڑھنے لگے۔ لیکن براہِ راست، دانوں کی طرف نہیں۔ آڑے ترچھے ہو کر بڑھتے اور کترا کر نکل جاتے۔ گویا یہ بات دکھائی جا رہی تھی خدا نا خواستہ دانوں کی طرف نہیں بڑھ رہے ہیں۔ دروغِ راست مانند کی یہ نمائش دیکھ کر ظہوریؔ کا شعر یاد آ گیا:

بگو حدیثِ وفا، از تو باوَرُست، بگو

شوم فدائے دروغے کہ راست مانندست

آپ جانتے ہیں کہ صید سے کہیں زیادہ صیاد کو اپنی نگرانیاں کرنی پڑتی ہیں، جونہی اُن کے قدموں کا رخ دانوں کی طرف پھرا، میں نے دَم سادہ لیا، نگاہیں دوسری طرف کر لیں اور پھر سارا جسم پتھر کی طرح بے حس و حرکت بنا لیا، گویا آدمی جگہ پتھر کی ایک مورتی دھری ہے۔ کیوں کہ جانتا تھا کہ اگر نگاہِ شوق نے مضطرب ہو کر ذرا بھی جلد بازی کی تو شکار دام کے پاس آتے آتے نکل جائے گا۔ یہ گویا نازِ حسن اور نیازِ عشق کے معاملات کا پہلا مرحلہ تھا:

نہاں اَز و بہ رُخش داشتم تماشائے

نظر بہ جانبِ ما کرد و شرمسار شدم

خیر، خدا خدا کر کے اس عشوۂ تغافل نما کے ابتدائی مرحلے طے ہوئے، اور ایک بت طنّاز نے صاف صاف دانوں کی طرف رخ کیا۔ مگر یہ رخ بھی کیا قیامت کا رخ تھا۔ ہزار تغافل اس کے جلو میں چل رہے تھے۔ میں بے حس و حرکت بیٹھا دل میں کہہ رہا تھا:

بہ ہر کجا ناز سر بر آرد، نیاز ہم پائے کم ندارد

تو و خرامے و صد تغافل، من و نگاہے و صد تمنا

ایک قدم آگے بڑھتا تھا دو قدم پیچھے ہٹتے تھے۔ میں جی ہی جی میں کہہ رہا تھا کہ التفات و تغافل کا یہ ملا جلا انداز بھی خوب انداز ہے۔ کاش تھوڑی سی تبدیلی اس میں کی جا سکتی، دو قدم آگے بڑھتے، ایک قدم پیچھے ہٹتا، غالب کیا خوب کہہ گیا ہے:

وداع و وصل جدا گانہ لذتے دارد
ہزار بار برو، صد ہزار بار بیا

التفات و تغافل کی ان کی ان عشوہ گریوں کی ابھی جلوہ فروشی ہو رہی تھی کہ ناگہاں ایک تنومند چڑے نے جو قلندرانہ بے دماغی اور رندانہ جرأتوں کے لحاظ سے پورے حلقہ میں ممتاز تھا، سلسلۂ کار کی درازی سے اُکتا کر بے باکانہ قدم اُٹھا دیا، اور زبان حال سے یہ نعرۂ مستانہ لگاتا ہوا بہ یک دفع دانوں پر ٹوٹ پڑا کہ:

زدیم بر صفِ رندان و ہر چہ باد اباد!

اس ایک قدم کا اُٹھنا تھا کہ معلوم ہوا، جیسے اچانک تمام رکے ہوئے قدموں کے بندھن کھل پڑے، اب نہ کسی قدم میں جھجک تھی، نہ کسی نگاہ میں تذبذب، مجمع کا مجمع بہ یک دفعہ دانوں پر ٹوٹ پڑا، اور اگر انگریزی محاورہ کی تعبیر مستعار لی جائے، تو کہا جا سکتا ہے کہ حجاب و تأمّل کی ساری برف اچانک ٹوٹ گئی، یا یوں کہیے پگھل گئی، غور کیجیے، تو اس کارگاہِ عمل کے ہر گوشہ کی قدم رانیاں ہمیشہ اسی ایک قدم کے انتظار میں رہا کرتی ہیں۔ جب تک یہ نہیں اُٹھتا، سارے قدم زمین گڑے رہتے ہیں، یہ اٹھا، اور گویا ساری دینا اچانک اُٹھ گئی:

نا مردی و مردی قدمے فاصلہ دارد!

اس بزمِ سود و زِیاں میں کامرانی کا جام کبھی کوتاہ دستوں کے لئے نہیں بھرا گیا۔ وہ ہمیشہ انہیں کے حصے میں آیا جو خود بڑھ کر اٹھا لینے کی جرأت رکھتے تھے۔ شاد عظیم آبادی مرحوم نے ایک شعر کیا خوب کہا تھا:

یہ بزمِ مَے ہے، یاں کوتاہ دَستی میں ہے محرومی
جو بڑھ کر خود اُٹھالے ہاتھ میں، مینا اُسی کا ہے

اس چڑے کا یہ بے باکانہ اِقدام کچھ ایسا دل پسند واقع ہوا، کہ اسی وقت دل نے ٹھان لی، اس مردِ کار سے رسم و راہ بڑھانی چاہیے۔ میں نے اس کا نام قلندرؔ رکھ دیا، کیوں کہ بے دماغی اور وارستگی کی سرگرانیوں کے ساتھ ایک خاص طرح کا بانک پن بھی ملا ہوا تھا اور اُس کی وضعِ قلندرانہ کو آب و تاب دے رہا تھا۔

رہے اک بانک پن بھی بے دماغی میں تو زیبا ہے
بڑھا دو چینِ اَبر و پر اَدائے کج کلاہی کو

دو تین دن تک اِسی طرح اُن کی خاطر تواضع ہوتی رہی۔ دن میں دو تین مرتبہ دانے دری پر ڈال دیتا۔ ایک ایک کر کے آتے اور ایک ایک دانہ چن لیتے کبھی دانہ ڈالنے میں دیر ہو جاتی، تو قلندر آ کر چوں چوں کرنا شروع کر دیتا کہ وقت معہود گزر رہا ہے۔ اس صورت حال نے اطمینان دلا دیا تھا کہ پردۂ حجاب اُٹھ چکا۔ وہ وقت دور نہیں کہ رہی سہی جھجک نکل جائے۔

اور کھل جائیں گے دو چار ملاقاتوں میں

چند دنوں کے بعد میں نے اس معاملہ کا دوسرا قدم اٹھایا۔ سگرٹ کے خالی ٹین کا ایک ڈھکنا لیا۔ اس میں چاول کے دانے ڈالے اور ڈھکنا دری کے کنارے رکھ دیا۔ فوراً مہمانوں کی نظر پڑی۔ کوئی ڈھکنے پاس آ کر منھ مارنے لگا۔ کوئی ڈھکنے کے کنارے پر چڑھ کر زیادہ جمیعت خاطر کے ساتھ چگنے میں مشغول ہو گیا۔ آپس میں رقیبانہ ردّ وکد بھی ہوتی رہی۔ جب دیکھا کہ اس طریقِ ضیافت سے طبیعتیں آشنا ہو گئی ہیں، تو دوسرے دن ڈھکنا دری کے کنارے سے کچھ ہٹا کر رکھا۔ تیسرے دن کچھ اور زیادہ ہٹا دیا اور بالکل اپنے سامنے رکھ دیا۔ گویا اس طرح بتدریج بُعد سے قرب کی طرف معاملہ بڑھ رہا تھا۔ دیکھیے بُعد وقرب کے معاملہ نے علیہ بنت المہدی کا مطلع یاد دلا دیا۔

وحبب ،فان الحب داعیت الحب

وکم من بعید الدار مستوجب القرب

اتنا قرب دیکھ کر پہلے تو مہمانوں کو کچھ تامّل ہوا۔ دری کے پاس آ گئے، مگر قدموں میں جھجک تھی اور نگاہوں میں تذبذب بول رہا تھا۔ لیکن اتنے میں قلندر اپنے قلندرانہ نعرے لگتا ہوا آ پہنچا، اور اس کی رندانہ جرأتیں دیکھ کر سب کی جھجک دُور ہو گئی۔ گویا اس راہ میں سب قلندر کے ہی پیرو ہوئے۔ جہاں اس کا قدم اُٹھا۔ سب کے اُٹھ گئے۔ وہ دانوں پر چونچ مارتا، پھر سر اٹھا کے اور سینہ تان کے زبان حال سے مترنم ہوتا:

وما الدھر،الا من رواۃ قصائدی

اذا قلت شعراً،اَصبح الدھر منشدا

جب معاملہ یہاں تک پہنچ گیا، تو پھر ایک قدم اور اٹھایا گیا اور دانوں کا برتن دری سے اٹھا کر تپائی پر رکھ دیا۔ یہ تپائی میرے بائیں جانب صوفے سے لگی رہتی ہے، پوری طرح میرے ہاتھ کی زد میں ہے۔ اس تبدیلی سے خوگر ہونے میں کچھ دیر لگی اور بار بار آتے اور تپائی کے چکر لگا کے چلے جاتے۔ بالآخر یہاں بھی قلندر ہی کو پہلا قدم بڑھانا پڑا، اور اس کا بڑھنا تھا کہ یہ منزل بھی پچھلی منزلوں کی طرح سب پر کھل گئی۔ اب تپائی کبھی تو ان کی مجلس آرائیوں کا ایوانِ طرب بنتی، کبھی باہمی معرکہ آرائیوں کا اکھاڑا۔ جب اس قدر نزدیک آ جانے کے خوگر ہو گیے، تو میں نے خیال کیا، اب معاملہ کچھ اور بڑھایا جا سکتا ہے۔ ایک دن صبح یہ کیا کہ چاول کا برتن صوفے پر ٹھیک اپنی بغل میں رکھ دیا اور پھر لکھنے میں اس طرح مشغول ہو گیا، گویا اس معاملہ سے کوئی سروکار نہیں۔

دل و جانم بتو مشغول ونظر بر چپ و راست

تا نہ دانند رقیباں کہ تو منظورِ منی

تھوڑی دیر کے بعد کیا سنتا ہوں کہ زور سے چونچ مارنے کی آواز آ رہی ہے۔ کنکھیوں سے دیکھا، تو معلوم ہوا کہ ہمارا کہ ہمارا پرانا دوست قلندر پہنچ گیا ہے، اور بے تکان چونچ مار رہا ہے۔ ڈھکنا چوں کہ بالکل پاس دھرا تھا، اس لئے اس کی دم میرے گھٹنے کو چھو رہی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد دوسرے یاران تیز گام بھی پہنچ گیے اور پھر یہ حال ہو گیا کہ ہر وقت دو تین دوستوں کا حلقۂ بے تکلف میری بغل میں اچھل کود کرتا رہتا، کبھی کوئی صوفے کی پشت پر چڑھ جاتا، کبھی کوئی جست لگا کر کتابوں پر کھڑا ہو جاتا، کبھی نیچے اُتر آتا اور چوں چوں کر کے پھر واپس آ جاتا۔ بے تکلفی کی اس اچھل کود میں کئی مرتبہ ایسا بھی ہوا کہ میرے کاندھے کو درخت کی ایک جھکی ہوئی شاخ سمجھ کر اپنی جست وخیز کا نشانہ بنانا چاہا، لیکن پھر چونک کر پلٹ گیے، یا پنجوں سے اسے چھوا اور اوپر ہی نکل گئے۔ گویا ابھی معاملہ اس منزل سے آگے نہیں بڑھا تھا جس کا نقشہ وحشی یزدی نے کھینچا ہے۔

ہنوز عاشقی و دلربا یئے نہ شدہ راست
ہنوز زوری و مرد آزمایئے نہ شدہ راست
ہمیں تو اضعِ عام ست حسن را باعشق
میانِ ناز و نیاز آشنایئے نہ شدہ راست

بہر حال رفتہ رفتہ ان آہوانِ ہوائی کو یقین ہو گیا کہ یہ صورت جو ہمیشہ صوفے پر دکھائی دیتی ہے، آدمی ہونے پر بھی آدمیوں کی طرح خطرناک نہیں ہے۔ دیکھیے، محبت کا افسوں جو انسانوں کو رام نہیں کر سکتا، وحشی پرندوں کو رام کر لیتا ہے:

درسِ وفا اگر بُوَد زمزمۂ محبتے
جمعہ بمکتب آورد طفلِ گریزپاے را

بار ہا ایسا ہوا ہے کہ میں اپنے خیالات میں محو، لکھنے میں مشغول ہوں، اتنے میں کوئی دل نشین بات نوک قلم پر آ گئی، یا عبارت کی مناسبت نے اچانک کوئی پر کیف شعر یاد دلا دیا اور بے اختیار اس کی کیفیت کی خود رفتگی میں میرا سر و شانہ ہلنے لگا، یا منہ سے ''ہا'' نکل گیا، اور یکا یک زور سے پروں کے اُڑنے کی ایک پھُرسی آواز سنائی دی۔ اب جو دیکھتا ہوں تو معلوم ہوا کہ ان یارانِ بے تکلف کا ایک طائفہ میری بغل میں بیٹھا بے تامل اپنی اچھل کود میں مشغول تھا۔ اچانک انہوں نے دیکھا کہ یہ پتھر اب ہلنے لگا ہے، تو گھبرا کر اڑ گئے۔ عجب نہیں۔ اپنے جی میں کہتے ہوں یہاں صوفے پر ایک پتھر پڑا رہتا ہے لیکن کبھی کبھی آدمی بن جاتا ہے۔

06.06 چڑیا چڑے کی کہانی کا تنقیدی جائزہ

چڑیا چڑے کی کہانی میں جس قوتِ مشاہدہ تفصیلی جزیات نگاری اور منظر کشی کا سرو سامان کیا گیا ہے، وہ اردو نثر میں ایک خاصہ کی چیز ہے، چڑیوں کے منھ میں انسان کی زبان رکھ کر ان کی گفتگو سے نتائج و عبر کے دفاتر کھول دینا اور تمثیلی اندازِ نگارش میں عبرت و مواعظت کے موتی لٹا دینا مختلف زبانوں کے ادب میں جانی پہچانی چیز رہا ہے، لیکن مولانا نے قلعۂ احمد نگر کے ایک کمرے میں ان کی زندگی اور افعال کا مطالعہ کر کے زندگی کی کرشمہ سازیوں کا جو تماشہ دکھلایا ہے اور جو نتائج اخذ کیے ہیں آپ اپنی اُمثال ہیں اور صرف یہی نہیں بلکہ اپنے قلم کی تمام تر رنگینی اور نشتریت کے ساتھ ساتھ انہوں نے چڑیوں کا جو سراپا کھنچا ہے اور جس خشوع و خضوع کے ساتھ ان کے ذہن و وجدان کا مطالعہ کیا ہے اس کی مثال ہمارے ادب میں نہیں ملتی، یہ صحیح ہے کہ احمد نگر میں ان کو فراغت کے لمحات میسر تھے، اور ان کی طبیعت داستان سرائیوں سے تھکنا بالکل بھول گئی تھی، داستانیں جتنی پھیلتی تھیں، ان کا ذوقِ داستان سرائی اتنا ہی بڑھتا جاتا تھا، مگر صرف فرصت و فراغت کے لمحات ہی ایسی زندہ جاوید تصویریں بنانے کے لئے درکار نہیں ہوتے، اس کے لئے عادات و اطوار کے مطالعہ اور مشاہدہ کے ذوق کے علاوہ زبان و بیان پر اس قدرت کی ضرورت بھی پیش آتی ہے، جو ابوالکلام کے حصہ میں آئی تھی، اس کہانی میں ہم مولانا کی زندگی کا ایک ایسا رخ دیکھتے ہیں جو مخصوص فطری رجحانات اور نہایت بیدار قوتِ مشاہدہ کے بغیر پیدا ہی نہیں ہو سکتا، قاضی عبدالغفار کی یہ رائے بالکل صحیح ہے کہ ''مولانا نے چڑیا چڑے کی کہانی میں اپنے ادیبانہ افکار کو کچھ اس قدر پھیلا دیا ہے کہ اس مخروطی آئینہ کے جس پہلو کو دیکھئے زندگی کی ایک تصویر نظر آتی ہے، اس خط میں مولانا نے کرۂ ہوا کے ان سیلانیوں سے اپنی راہ و رسم پیدا کرنے کی داستان پوری تفصیل کے ساتھ سنائی ہے، آغازِ کار کی دقتوں سے لے کر ان کو مانوس بنانے تک کی تمام منزلیں درجہ بدرجہ مولانا نے بہ سن کی ہیں۔ باورچی خانہ سے کچا چاول منگوا کر وہ سامنے دری پر چھڑ کتے ہیں۔

کچھ دیر تک تو چڑیوں نے اس کی جانب توجہ نہیں کی مگر دانوں کی کشش ایسی بھی نہ تھی کہ ان کا تغافل دیر تک قائم رہتا، پہلے ایک چڑیا آئی اور ادھر اُدھر کودنے لگی، پھر دوسری اور تیسری اور چوتھی بھی پہونچ گئی کبھی دانوں پر نظر پڑتی، کبھی دانہ ڈالنے والے پر آخر کار خدا خدا کر کے اس عشوۂ تغافل نما کے ابتدائی مرحلے طے ہوئے، اور ایک بہت طناز نے صاف صاف دانوں کی طرف رخ کیا مگر یہ رخ بھی کیا قیامت کا رخ تھا، ہزار تغافل اس کے جلو میں چل رہے تھے، ایک قدم آگے بڑھتا تو دو قدم پیچھے ہٹتے تھے۔ اِلتفات و تغافل کی ان عشوۂ گریوں کی ابھی جلوہ فروشی ہو رہی تھی کہ ناگہاں ایک تنومند چڑے نے جو اپنی قلندرانہ بے دماغی اور رندانہ جرأتوں کے لحاظ سے پورے حلقہ میں ممتاز تھا، سلسلۂ کار کی درازی سے اُکتا کر بے باکانہ قدم اٹھا دیا اور زبان حال سے یہ نعرۂ مستانہ لگاتا ہوا بیک دفعہ دانوں پر ٹوٹ پڑا'' زدیم برصف رندان دہر چہ بادآباد'' اس ایک قدم کا اُٹھنا تھا کہ معلوم ہوا جیسے اَچانک رکے ہوئے قدموں کے بندھن کھل پڑے، اب نہ کسی قدم میں جھجھک تھی، نہ کسی نگاہ میں تذبذب مجمع کا مجمع بہ یک دفعہ دانوں پر ٹوٹ پڑا۔

واقعہ کے اس موڑ پر پہنچ کر مولانا یکا یک اپنے کمرے کا رخ زندگی کے ایک مخصوص پہلو کی طرف موڑ دیتے ہیں اور اس واقعہ میں قارئین کو زندگی کے عرصۂ کارزار میں ایک خاص درس لینے کی طرف متوجہ کرتے ہیں، فرماتے ہیں۔

غور کیجیے تو اس کارگاہِ عمل کے ہر گوشے کی قدم رانیاں ہمیشہ اسی ایک قدم کے انتظار میں رہا کرتی ہیں، جب تک یہ نہیں اُٹھتا، سارے قدم زمین پر گڑے رہتے ہیں، یہ اُٹھا اور گویا ساری دنیا اَچانک اٹھ گئی۔

''نامردی و مردی قدمے فاصلہ دارد'' اس بزم سود و زیاں میں کامرانی کا جام کبھی کوتاہ دستوں کے لئے نہیں بھرا گیا، وہ ہمیشہ انہیں کے حصہ میں آیا جو خود بڑھ کر اُٹھا لینے کی جرأت رکھتے تھے۔

مولانا نے اس کہانی میں اپنی داستانِ حیات کے کچھ گوشے اور اپنی ہی فکر و نظر کی کچھ چلتی پھری تصویریں پیش کی ہیں کہ ان کے نفسیاتی پس منظر کا ایک گوشہ ہماری نگاہوں کے سامنے آجاتا ہے۔

06.07 خلاصہ

مولانا ابوالکلام آزاد اردو ادب کے مایہ ناز ادیب شاعر و صحافی ہونے کے ساتھ ساتھ مجاہدِ آزادی بھی تھے۔ مولانا کے آباواَجداد کا تعلق ایک دینی گھرانے سے تھا۔ آپ کے والدِ بزرگ وار مولانا محمد خیر الدین عربی و فارسی کے مشہور عالمِ دین تھے۔ آپ نے تفسیر، حدیث، فقہ، علم کلام، منطق اور فلسفہ میں متعدد کتب تصنیف کی ہیں۔ مولانا خیر الدین کو مختلف موضوعات کی کتب جمع کرنے کا حد درجہ ذوق تھا۔

ابوالکلام کا اصل نام محی الدین اور تاریخی نام فیروز بخت تھا۔ آپ کی والدہ محترمہ امیر عرب شیخ کی صاحب زادی تھیں اس لئے مولانا کے گھر میں عربی زبان بولنے کا اچھا خاصہ چلن تھا۔ آپ کے والدِ گرامی نے گھر کے اندر عربی کے علاوہ کسی دوسری زبان کے اِستعمال کی قطعاً اجازت نہیں دی تھی۔

مولانا آزاد نے تحریک آزادی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا جس کی پاداش میں آپ انگریزی حکومت کی آنکھوں میں کھٹکنے لگے۔ مولانا نے اپنی تحریر اور تقریر کے ذریعہ علم و ادب کی بیش بہا خدمات انجام دیں۔ آپ نے مختلف موضوعات پر تقریروں اور تحریروں کے ذریعہ قوم کی نظروں میں ایک خاص مقام قائم کیا تھا۔ آپ نے سماجی و سیاسی موضوعات پر جو مضامین و خطبات دیے ہیں وہ آج بھی نوجوانوں کے لئے مشعلِ راہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔

مولانا کے تمام کارناموں میں جو مقام غبارِ خاطر کو حاصل ہے وہ کسی دوسری تخلیق کو حاصل نہ ہوسکا۔ دراصل غبارِ خاطر مولانا کے ان خطوط کا مجموعہ ہے جو انہوں نے قلعۂ احمد نگر کی نظر بندی کے دوران اپنے دوست مولانا حبیب الرحمٰن شیروانی کے نام لکھے تھے۔ مولانا نے ان کے لئے صدیق مکرم استعمال کیا ہے۔ مولانا ۱۰؍اگست ۱۹۴۲ء سے ۱۵؍جون ۱۹۴۵ء تک قید و بند میں رہے۔ شروع میں آپ کو احمد نگر کے قلعہ میں اور آخری ڈھائی مہینے احمد نگر سے بانکوڑہ جیل میں منتقل کر دیا گیا۔ مولانا نے اپنے عزیز دوست مولانا حبیب الرحمٰن خان شیروانی کے نام پہلا خط ۱۰؍اگست ۱۹۴۲ء کو اور آخری خط ۱۶؍ستمبر ۱۹۴۳ء کو لکھا تھا۔ غبارِ خاطر مولانا کی آخری کتاب ہے۔

اس میں کل چوبیس (۲۴) خطوط ہیں۔ داخلِ نصاب خط چڑیا چڑے کی کہانی کا شمار نمبر انیس (۱۹) ہے۔ غبار خاطر میں اردو کی تقریباً دو درجن سے زائد نامور شعرا کے ۱۱۰؍شعر اور مصرعے استعمال کیے گئے۔

چڑیا چڑے کی کہانی مولانا نے قلعہ احمد نگر کی قید و بند میں لکھی تھی۔ اس میں چڑیا چڑ یک کے کرداروں کا سہارا لے کر زندگی کی انتہائی دل کش عکاسی کی ہے۔ کیوں کہ آپ نے اپنی زندگی ایک بڑحصہ قید و بند کی صعوبتیں گزارتے ہوئے بسر کیا ہے جیسا کہ اس کہانی کے آغاز میں خود تحریری کرتے ہیں۔

''زندگی میں بہت سی کہانیاں بنائیں، خود زندگی ایسی گزری جیسے ایک کہانی ہو''

مولانا کی تحریر کا سب سے امتیازی پہلو منظر کشی ہے کہانی کی اِبتدا میں جو چند سطور رقم کی ہیں انہیں پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے قاری بذاتِ خود کمرے میں موجود ہو۔

''یہاں کمرے جو ہمیں رہنے کو ملے ہیں، پچھلی صدی کی تعمیرات کا نمونہ ہیں۔ چھت لکڑی کے شہتیروں کی ہے اور شہتیروں کے سہارے کے لئے محرابیں ڈال دی ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ جا بجا گھونسلا بنانے کے قدرتی گوشے نکل آئے اور گوریاؤں کی بستیاں آباد ہوگئیں۔ دن بھر ان کا ہنگامۂ تگ و دَو گرم رہتا ہے۔''

اس کے بعد مولانا نے چڑیا چڑے کو اپنے کمرے سے بگانے کی جو تراکیب و تدابیر کی ہیں بڑے ہی دل چسپ انداز میں بیان کرتے ہیں کہانی درمیان میں ایسے ایسے نکات بیان کرتے ہیں جو مولانا کے وسیع مطالعہ کا بین ثبوت ہے۔

''ان نئ تعمیروں کا ہنگامہ اور زیادہ عاجز کر دینے والا تھا۔ ان چڑیوں کو ذرا سی تو چونچ ملی ہے، اور مٹھی بھر کا بدن نہیں، لیکن طلب و سعی کا جوش اس بلا کا پایا ہے کہ چند منٹوں کے اندر بالشتُ بھر کلفات کھود کے صاف کر دیں گیں حکیم ارشمیدس (Archimedes) کا مقولہ مشہور ہے Dos moi pau sto kai ten gen kineso مجھے فضا میں کھڑا ہونے کی جگہ دے دو، میں کرۂ اَرضی کو اس کی جگہ سے ہٹا دوں گا۔''

مولانا نے دونوں کو بے گھر کرنے کی حتی الامکان کوشش کی لیکن کامیابی نہیں مل سکی جس طرح انسان کو اپنی مٹی سے اُنسیَت و محبت ہوتی ہے اور کسی آن بھی اس کے جدائی برداشت نہیں کرتا ہے اسی طرح پرند و چرند بھی اپنے آشیانوں کو کیسے چھوڑ سکتے ہیں۔ مولانا نے قلندر کے حوصلے کے سامنے تھک ہار کر صلح کرنے کی پیش کش کی اور جس طرح دو ملک معاہدہ کرتے ہیں اسی طرح دونوں نے معاہدہ کیا۔ کہانی کے آخر میں مولانا نے چڑیا چڑے کو رہنے کے لئے اپنے دل کی راہ کھول دی یا پھر یوں کہیں کہ چڑیا چڑے نے رام کر لیا۔

''بارہا ایسا ہوا ہے کہ میں اپنے خیالات میں محو، لکھنے میں مشغول ہوں، اتنے میں کوئی دل نشین بات نوک قلم پر آ گئی، یا عبارت کی مناسبت نے اچانک کوئی پر کیف شعر یاد دلا دیا اور بے اختیار اس کی کیفیت کی خود رفتگی میں میرا سر و شانہ ہلنے لگا، یا منہ سے ''ہا'' نکل گیا، اور یکا یک زور سے پروں کے اڑنے کی ایک پھریری آواز سنائی دی۔ اب جو دیکھتا ہوں تو معلوم ہوا کہ ان یاران بے تکلف کا ایک طائفہ میری بغل میں بیٹھا بے تامل اپنی اچھل کود میں مشغول تھا۔ اچانک انہوں نے دیکھا کہ یہ پتھر اب ہلنے لگا ہے، تو گھبرا کر اڑ گئے۔ عجیب نہیں۔ اپنے جی میں کہتے ہوں یہاں صوفے پر ایک پتھر پڑا رہتا ہے، لیکن کبھی کبھی آدمی بن جاتا ہے۔''

06.08 فرہنگ

آشیاں سازیاں	: گھر بنانے کا فعل	سَقف	: چھت
اِستغاثہ	: فریاد، دادخواہی	سود و زیاں	: نفع و نقصان
اِستفہام	: سوال کرنا	سیمُرغ	: ایک خیالی پرندہ
پا مَردِی	: بہادری، ہمت دکھانا	شہتیر	: بڑی کڑی، شاہ ٹیک، سپورٹ والی لکڑی
تفحّص	: تلاش، جستجو، کھوج، تحقیق	صعوبت	: پریشانی
تنومندی	: سختی، توانائی، تناوری	عِشوَہ گری	: ہاؤ بھاؤ دکھانے کی ضرورت
حریف	: مدمقابل، دشمن، رقیب	عکاسی	: کسی چیز کا نقشہ
خشوع	: عاجزی	فتح مندی	: کامیابی
خضوع	: گڑگڑانا، عاجزی	فراغت	: فرصت
خط کی جمع	: خطوط	فن کی جمع	: فنون
رِجَز	: جنگ	قوت مشاہدہ	: دیکھنے کی طاقت
رِندُ	: شرابی	قولِ فَیصَل	: فیصلہ کن بات، قطعی اور آخری بات
دست رَس	: مہارت	کتب کا واحد	: کتاب
دل جذب	: دل میں نقش ہونے والا	کرۂ اَرضی	: گلوبُ، Globe
دل کش	: دل کو خوش کرنے والا	لمحہ کی جمع	: لمحات
رجحان کی جمع	: رجحانات	مخروطی	: گاجر کی شکل کا
سبزہ	: ہریالی	مُضطَرِب	: بے چین، بے سکون
سرگزشت	: آپ بیتی، حال واحوال	میسر ہونا	: موجود ہونا، دَست یاب ہونا

06.09 نمونہ امتحانی سوالات

الف: درجِ ذیل سوالوں کے جوابات ۱۰/۱۰ سطروں میں دیجیے:

سوال نمبر ۱ خطوط کی کتنی اقسام ہیں؟ تحریر کیجیے۔

سوال نمبر ۲ غبار خاطر میں کل کتنے خطوط شامل ہیں؟

سوال نمبر ۳ غبار خاطر میں شامل خطوط کسے لکھے گئے ہیں؟

ب: درج ذیل سوالوں کے جوابات ۳۰/۳۰ سطروں میں دیجیے:

سوال نمبر ۱ چڑیا چڑے کی کہانی کا مختصر تنقیدی جائزہ لکھیے۔

سوال نمبر ۲ مولانا کی ادبی خدمات پر ایک مختصر مضمون لکھیے۔

سوال نمبر ۳ مولانا ابوالکلام آزاد کے مختصر حالات زندگی تحریر کیجیے۔

معروضی سوالات

سوال نمبر ۱ : غبار خاطر کس کی تصنیف ہے؟

(الف) محمد حسین آزاد (ب) ابوالکلام آزاد (ج) محمود شیرانی (د) سید سلیمان ندوی

سوال نمبر ۲ : غبار خاطر میں کل کتنے خطوط ہیں؟

(الف) ۲۰ (ب) ۲۱ (ج) ۲۳ (د) ۲۴

سوال نمبر ۳ : چڑیا چڑے کی کہانی کون سے نمبر کا خط ہے؟

(الف) ۱۷ (ب) ۱۸ (ج) ۱۹ (د) ۲۰

سوال نمبر ۴ : خط کی جمع کیا ہے؟

(الف) خط (ب) خطوط (ج) خطائط (د) خطوطیں

سوال نمبر ۵ : ابوالکلام کا تاریخی نام کیا تھا؟

(الف) آزاد بخت (ب) خوش بخت (ج) دل افروز بخت (د) فیروز بخت

سوال نمبر ٦ : مولانا کی پیدائش کس شہر میں ہوئی تھی؟

(الف) بغداد (ب) مدینہ شریف (ج) مکہ شریف (د) بیت المقدس

سوال نمبر ۷ : مولانا آزاد کے والد گرامی کا کیا نام تھا؟

(الف) مولانا شمس الدین (ب) مولانا خیر الدین (ج) مولانا رفیع الدین (د) مولانا محی الدین

معروضی سوالات کے جوابات

جواب نمبر۱	: (ب) ابوالکلام آزاد	جواب نمبر۵	: (د) فیروز بخت
جواب نمبر۲	: (د) ۲۴	جواب نمبر۶	: (ج) مکہ شریف
جواب نمبر۳	: (ج) ۱۹	جواب نمبر۷	: (ب) مولانا خیرالدین
جواب نمبر۴	: (ب) خطوط		

06.10 حوالہ جاتی کتب

۱۔ آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی　از　مولانا ابوالکلام آزاد

۲۔ الہلال　از　مولانا ابوالکلام آزاد

۳۔ تذکرہ　از　مولانا ابوالکلام آزاد

۴۔ خطبات آزاد　از　مولانا ابوالکلام آزاد

۵۔ غبار خاطر　از　مولانا ابوالکلام آزاد

۶۔ غبار خاطر کا تنقیدی مطالعہ　از　ملک زادہ منظور احمد

بلاک نمبر 02

اکائی	07	طنز ومزاح اور اس کی اقسام	ڈاکٹر شہپر شریف
اکائی	08	اُردو نثر میں طنز ومزاح کی روایت	ڈاکٹر مسرّت جہاں
اکائی	09	طنز ومزاح کی سماجی اہمیت	ڈاکٹر شہپر شریف
اکائی	10	اکبر الہ آبادی کی طنزیہ ومزاحیہ شاعری	غلام جیلانی
اکائی	11	شیخ پیرو : رشید احمد صدیقی	ڈاکٹر محمد طاہر
اکائی	12	یادش بخیریا : مشتاق احمد یوسفی	ڈاکٹر شریف احمد قریشی

اکائی 07 طنز و مزاح اور اس کی اقسام

ساخت

07.01 : اغراض و مقاصد

07.02 : تمہید

07.03 : طنز و مزاح میں فرق

07.04 : طنز کی تعریف

07.05 : طنز کی اقسام

07.06 : مزاح کی تعریف

07.07 : مزاح کی اقسام

07.08 : خلاصہ

07.09 : فرہنگ

07.10 : نمونہ امتحانی سوالات

07.11 : حوالہ جاتی کتب

07.12 : اپنے مطالعے کی جانچ کے جوابات

07.01 اغراض و مقاصد

زبان کسی بھی معاشرت کی تہذیبی، فکری، اور ثقافتی ترقی کی عکاسی کرتی ہے اور جیسے جیسے زبان میں نکھار اور ترقی آتی ہے اس زبان کو بولنے والے افراد کی ذہنی سطح اور فکری وسعت میں بھی نمایاں اضافہ ہوتا ہے۔ زبان کا ارتقا نہ صرف اس کے الفاظ اور اسلوب میں وسعت پیدا کرتا ہے بلکہ اس کے ادبی سرمایہ میں بھی گہرائی اور بالیدگی لے آتا ہے۔ خاص طور پر طنز و مزاح جیسے اہم ادبی اصناف زبان کے فکری اور تہذیبی رجحانات کو اجاگر کرنے کا ذریعہ بنتے ہیں۔ طنز و مزاح کسی زبان کی فکری و تخلیقی صلاحیتوں کے عروج کی علامت ہوتے ہیں۔ یہ ادب نہ صرف معاشرتی مسائل کی نشان دہی کرتا ہے بلکہ ان کے حل کی طرف اشارہ بھی کرتا ہے۔ کسی زبان میں طنزیہ و مزاحیہ ادب کی موجودگی اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ زبان اپنے معاشرتی حقائق کو سمجھنے، ان پر تنقید کرنے اور ان کے ذریعے اصلاح کا عمل جاری رکھنے کی اہلیت رکھتی ہے۔ اس طرح کا ادب اس زبان کے بولنے والوں کے ذوق، مزاج، اور فکری گہرائی کا آئینہ دار ہوتا ہے اور اس کا مطالعہ قارئین کو نہ صرف لطف اندوز کرتا ہے بلکہ انہیں زندگی کے مسائل کو ایک منفرد انداز سے دیکھنے اور سمجھنے کا موقع بھی فراہم کرتا ہے۔

طنز ومزاح انسانی زندگی میں نہایت اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ خاص طور پر جب بات معاشرتی مسائل، انسانی کمزوریوں اور زمانے کی تلخیوں سے نمٹنے کی ہو۔ یہ دونوں اصناف ادب نہ صرف ان مسائل کو اجاگر کرتی ہیں بلکہ ان کے ذریعے اصلاح کا راستہ بھی دکھاتی ہیں۔ انسانی زندگی میں مشکلات اور تلخ حقیقتوں سے نبرد آزما ہونے کے لئے طنز ومزاح ایک مؤثر ہتھیار کے طور پر کام کرتے ہیں کیوں کہ یہ معاشرتی ناہمواریوں، ناانصافیوں اور دیگر برائیوں کی نشان دہی کرتے ہیں اور قاری کو ان کے بارے میں سوچنے پر مجبور کرتے ہیں۔ جیسے جیسے دنیا ترقی کی منازل طے کر رہی ہے اور زندگی کے مسائل پیچیدہ ہوتے جا رہے ہیں، طنز ومزاح پر مبنی ادب کی اہمیت بھی روز بروز بڑھتی جا رہی ہے۔ فکاہی ادب نہ صرف قارئین کے لئے تفریح کا ذریعہ بنتا ہے بلکہ ان کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت کو بھی جلا بخشتا ہے۔ آج کے دور میں طنز ومزاح کی تحریریں اور تخلیقات زیادہ مقبول ہو رہی ہیں کیوں کہ ان کے ذریعے لوگ نہ صرف زندگی کی سختیوں کو ہلکا محسوس کرتے ہیں بلکہ ان میں چھپے پیغامات سے زندگی کو بہتر بنانے کے گُر بھی سیکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اُردو زبان کے ہر طالب علم کے لئے ضروری ہے کہ وہ طنز ومزاح کے فن کو گہرائی سے سمجھے اور اس کے مختلف پہلوؤں کا مطالعہ کرے۔ طنز ومزاح کا مطالعہ نہ صرف ان کے ادبی ذوق کو بہتر بناتا ہے بلکہ انہیں معاشرتی مسائل کے بارے میں ایک وسیع تر نقطۂ نظر فراہم کرتا ہے۔ اس سے طالب علم کو نہ صرف فکاہی ادب کی پیچیدگیوں کو سمجھنے کا موقع ملتا ہے بلکہ وہ ان تحریروں کے ذریعے اپنی تخلیقی اور تنقیدی صلاحیتوں کو بھی نکھار سکتا ہے۔

مطالعہ کو آسان اور مؤثر بنانے کے لئے اس اِکائی کو مختلف ذیلی عنوانات میں تقسیم کیا گیا ہے جن میں طنز ومزاح میں فرق، طنز کی تعریف، طنز کی اقسام، مزاح کی تعریف اور مزاح کی اقسام شامل ہیں۔ اگر آپ اس اِکائی کو سنجیدگی سے پڑھیں گے تو نہ صرف آپ طنز ومزاح کے فن کو بہتر طور پر سمجھ سکیں گے بلکہ اس موضوع کے لئے آپ کی دل چسپی اور شوق میں بھی اضافہ ہوگا۔

07.02 تمہید

انسانی زندگی میں خوشی اور غم دو بنیادی پہلو ہیں جو انسانی وجود کے تجربات کا حصّہ ہیں۔ ہر انسان یہ خواہش رکھتا ہے کہ اس کی زندگی خوشیوں سے بھرپور ہو اور غموں کا سایہ اس سے دوٗر رہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ زندگی کی راہیں ہمیشہ ہموار نہیں ہوتیں۔ اکثر حالات، مشکلات، اور اُلجھنیں انسان کو مسرت سے محروم کر دیتی ہیں اور اس کے دل ودماغ پر ایک بوجھ سا ڈال دیتی ہیں۔ تاہم جب انسان ان مسائل پر قابو پا لیتا ہے یا مشکلات سے نکلنے کا کوئی راستہ ڈھونڈ لیتا ہے تو اس کے دل میں ایک غیر معمولی خوشی پیدا ہوتی ہے جو اس کے وجود کے ہر گوشے میں سرایت کر جاتی ہے۔

یہ خوشی عموماً انسان کے چہرے پر ایک مسکراہٹ کی صورت میں جھلکتی ہے یا پھر ہنسی اور قہقہوں کے ذریعے ظاہر ہوتی ہے۔ انسان کو ''ہنسنے والا جانور'' کہا گیا ہے کیوں کہ دیگر جان دار اس خوشی اور اس کے اظہار کی صلاحیت سے محروم ہیں۔ انسان کی یہ صلاحیت اسے دیگر مخلوقات سے ممتاز بناتی ہے۔ کچھ لوگ مسرت کے اس اظہار کو دبانے کی کوشش کرتے ہیں اور خود کو سنجیدہ یا خشک مزاج ظاہر کرتے ہیں۔ ایسے افراد کے خیال میں زور سے ہنسنا یا قہقہہ لگانا بدتمیزی یا غیر مہذب رویے کی علامت ہے، اس لئے وہ اپنی مسکراہٹ یا خوشی کو بھی حد میں رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن چاہے وہ کتنی ہی کوشش کریں، ان کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ ضرور نمودار ہو جاتی ہے جو ان کے اندرونی احساسات کو ظاہر کرتی ہے۔

دوسری طرف ایک عام انسان جب شدید خوشی محسوس کرتا ہے تو وہ اپنی مسرت کا اظہار بھرپور انداز میں کرتا ہے۔ یہ اظہار ہنسی اور قہقہوں کے ذریعے ہوتا ہے جو نہ صرف اس کے دل کو سکون پہنچاتے ہیں بلکہ دوسروں کو بھی اپنی خوشی میں شریک کر لیتے ہیں۔خوشی کا یہ اظہار انسان کی فطرت کا حصّہ ہے اور اس کے جذبات کے بہاؤ کو ظاہر کرتا ہے۔اس لئے خوشی اور اس کے اظہار کو انسان کی زندگی کا ایک اہم پہلو سمجھا جا سکتا ہے جو نہ صرف اس کی ذاتی مسرت کا ذریعہ ہے بلکہ دوسروں کے ساتھ اس کے تعلقات کو بھی خوشگوار بناتا ہے۔

07.03 طنز و مزاح میں فرق

طنز و مزاح نگاری کا فن تہذیبی اور معاشرتی زندگی کے لئے نہایت اہمیت کا حامل ہے جو اپنی مخصوص آزادیوں اور لازمی پابندیوں کے باوجود فکری اور ادبی سرمایہ کی حیثیت رکھتا ہے۔اس فن کے ذریعے نہ صرف افراد اور سماج کا مذاق اڑایا جاتا ہے بلکہ حالات اور واقعات پر طنز و تضحیک سے بھرپور تبصرے بھی کیے جاتے ہیں۔ایک مزاح نگار کی صلاحیت یہ ہوتی ہے کہ وہ سماج میں موجود خامیوں اور خرابیوں کو اُجاگر کرے، نہ صرف ان کی نشان دہی کرے بلکہ ان کے ذریعے افراد اور سماج کی اصلاح کی راہ بھی ہموار کرے۔اس طرح مزاح نگار نہ صرف مسائل کو اجاگر کرتا ہے بلکہ رہنمائی کا کردار بھی ادا کرتا ہے۔ادب کی مختلف اصناف میں کسی نہ کسی سطح پر طنز و مزاح کی جھلک محسوس کی جا سکتی ہے خواہ وہ نثر ہو یا نظم لیکن طنز و مزاح نگاری ایک مخصوص فن ہے جو دیگر ادبی اصناف سے مختلف اور امتیازی خصوصیات رکھتا ہے۔اس فن کے محرکات اور اسالیب عام تحریروں سے نمایاں طور پر مختلف ہوتے ہیں اور یہ اپنی جداگانہ نوعیت کے اندازِ بیان کی بنا پر منفرد حیثیت رکھتا ہے۔ طنز و مزاح کی تخلیق میں ظرافت کو بنیادی اہمیت حاصل ہے جو اس فن کی روح ہے۔تاہم یہ بات بھی اہم ہے کہ طنز اور مزاح اپنی نوعیت اور اہمیت میں ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ان دونوں کے محرکات اور تخلیقی اسباب بھی ایک دوسرے سے جدا اور کئی پہلوؤں سے متضاد ہیں۔طنز کا مقصد معاشرتی ناہمواریوں، ظلم اور برائیوں کو سخت لہجے میں تنقید کا نشانہ بنانا ہوتا ہے، جب کہ مزاح اپنے نرم اور خوشگوار انداز کے ذریعے لوگوں کو مسکرانے یا ہنسنے پر مجبور کرتا ہے اور اسی عمل میں مسائل کی طرف اشارہ بھی کرتا ہے۔اس طرح طنز و مزاح کا فن ادب میں نہ صرف دلچسپی پیدا کرتا ہے بلکہ قارئین کو سوچنے اور معاشرتی اصلاح کی طرف مائل کرنے کا ذریعہ بھی بنتا ہے۔

طنز انسانی ذہانت اور ذکاوت کا وہ منفرد اظہار ہے جو حساسیت کے باعث پیدا ہوتا ہے۔یہ ایک ایسا ردِعمل ہے جو کسی ناپسندیدہ صورتِ حال، انسان یا سماجی عوامل کے خلاف غم و غصے اور ناگواری کے جذبات کو بیان کرتا ہے۔طنز کا بنیادی مقصد سماج اور انسان کی خامیوں، کمزوریوں، بدسلیقگی، بدنمائی، پھوہڑ پن، بے ڈھنگی حرکات اور دیگر منفی پہلوؤں کو ایک استہزائیہ اور تیکھے انداز میں اجاگر کرنا ہوتا ہے۔اس کے ذریعے ان عوامل کے مضر اور نقصان دہ اثرات کا احساس دلانے کی کوشش کی جاتی ہے تا کہ سماج ان مسائل کی اصلاح کی طرف مائل ہو۔ طنز کی جڑیں سماج، زندگی اور ماحول کے ساتھ موجود برہمی اور عدم اطمینان میں ہوتی ہیں اور اس میں شدت اور نشتریت کا عنصر نمایاں ہوتا ہے۔ طنز نگار نہ صرف موجودہ صورت حال پر تنقید کرتا ہے بلکہ اس کا مقصد ان عوامل کو بہتر بنانا اور ان میں مثبت تبدیلی لانا بھی ہوتا ہے۔طنز نگاری کا فن درحقیقت ایک ذمہ دارانہ طرزِ عمل ہے جو اس بات کی عکاسی کرتا ہے کہ لکھنے والا سماجی برائیوں یا انسان کی خامیوں کو ناپسند کرتا ہے اور ان کی اصلاح کی خواہش رکھتا ہے۔طنز نگار کی تحریریں قاری کو یہ باور کراتی ہیں کہ سماج کے یہ مسائل کس حد تک اہم ہیں اور ان کے منفی اثرات سے بچنے کے لئے اصلاح ناگزیر ہے۔یوں طنز نہ صرف ایک ادبی اندازِ بیان ہے بلکہ ایک اصلاحی تحریک بھی ہے جو طنز نگار کی فکری بصیرت اور سماجی ذمہ داری کو اجاگر کرتی ہے۔

طنز ایک ایسا مؤثر ادبی ہتھیار ہے جو معاشرتی، سماجی، سیاسی اور اقتصادی حالات سمیت دیگر ناپسندیدہ عوامل میں تبدیلی لانے کی ایک شعوری کوشش کرتا ہے۔طنز نگار اپنی تحریروں کے ذریعے ان مسائل کو نہ صرف اجاگر کرتا ہے بلکہ ان کے مضر اثرات کا احساس بھی دلانے کی کوشش کرتا ہے تاکہ افراد اور سماج ان پر غور کریں اور اصلاح کی طرف مائل ہوں۔طنز کا اثر انسان اور سماج دونوں پر گہرے انداز میں ہوتا ہے۔ یہ افراد کو ان کی غلطیوں، کمزوریوں اور برائیوں کے خلاف نہ صرف جھنجھوڑتا ہے بلکہ انہیں ندامت، سبق اور عبرت کا احساس بھی دلاتا ہے۔ یہ عمل انہیں غور وفکر پر مجبور کرتا ہے اور ان کے اندر شعور وآگاہی کو بیدار کرتا ہے۔ درحقیقت طنز کی روح مقصدیت ہے۔ یہ ایک اصلاحی انداز ہے جو اپنے دائرۂ کار میں مقصد کے بغیر بے سود ہو جاتا ہے۔طنز میں شدت، تلخی اور تیزی وہ اہم عناصر ہیں جو اسے مؤثر بناتے ہیں۔ اگر طنز کا وار ایسا ہو کہ اس کا شکار اس وار میں ایک طرح کی لطافت یا مزاح محسوس کرے اور اس کی رگِ ظرافت پھڑک اٹھے تو ایسے طنز کو بہترین اور کامیاب طنز شمار کیا جاتا ہے۔بہترین طنز وہ ہے جو نہ صرف اپنے زمانے کے سماجی اور انسانی حالات کی عکاسی کرے بلکہ اپنے دَور کے مسائل پر گہرے اور مستقل اثرات چھوڑے۔ یہ تعمیری طنز آنے والی نسلوں کے لئے بھی ایک رہنما بن سکتا ہے کیوں کہ اس کا پیغام وقت کے ساتھ بھی قابلِ عمل اور متعلقہ رہتا ہے۔ یوں طنز محض ایک ادبی صنف نہیں بلکہ ایک ایسی مؤثر تحریک ہے جو اصلاح اور شعور کی تشکیل میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔

طنز ومزاح کی دنیا میں زود حسی اور ظریفانہ مزاج کو بنیادی اہمیت حاصل ہے اور یہ مزاح طنز کے برعکس خوشگوار ذہنی رویّوں اور شگفتہ و شائستہ فکری رجحانات کا مرہونِ منت ہوتا ہے۔جس طرح طنز نگار زندگی اور سماج کے مسائل اور مضحکہ خیز پہلوؤں سے متاثر ہوتا ہے، اسی طرح مزاح نگار بھی معاشرت کے ناہموَار حالات، غیر متناسب مظاہر اور مضحکہ خیز حرکات سے متاثر ہوتا ہے۔ تاہم مزاح کی تحریک، باوجود اس کے کہ زندگی اور سماج کی انہی ناہموَاریوں اور بے ڈھنگے پن سے جڑی ہوتی ہے، اپنے ردِعمل میں طنز اور ہجو سے مختلف ہے۔ جہاں طنز نگار کی تحریروں میں برہمی، غصہ اور نیش زنی کی جھلک ہوتی ہے اور ہجو میں نفرت وتحقیر کا عنصر غالب ہوتا ہے وہیں مزاح نگار کے رویے میں ہم دَردی، دل آویزی اور انبساط کی کیفیت نمایاں رہتی ہے۔ مزاح نگار کے قلم سے ابھرنے والی تحریریں نہ تو ضرر پہنچانے کا ارادہ رکھتی ہیں اور نہ ہی اصلاح کا۔ اس کا اصل مقصد قارئین کو خوشی، مسرت اور انبساط کا سامان فراہم کرنا ہوتا ہے۔ مزاح کی تحریک زندگی کے بے ہنگم، غیر متناسب، اور بے جوڑ مظاہر کو نمایاں کرنے سے پیدا ہوتی ہے۔ مزاح نگار ان پہلوؤں کو نہ صرف خود ایک دل چسپ نظارے کے طور پر دیکھتا ہے بلکہ اپنے قارئین کو بھی ان کا عکس دکھاتا ہے۔ وہ دوسروں کی خود بینی، خود نمائی اور غیر آہنگ حرکات کو ایک ہلکے پھلکے اور ظریفانہ انداز میں پیش کرتا ہے تاکہ قارئین کو ان حالات سے انبساط حاصل ہو اور وہ زندگی کی مشکلات کو بھی خوشگوار انداز میں سمجھ سکیں۔ مزاح نگار کی تحریریں انسانی رویوں اور سماجی معاملات کی چھپی ہوئی مضحکہ خیزیوں کو اس مہارت سے نمایاں کرتی ہیں کہ قاری نہ صرف ان پر مسکرائے بلکہ ان کی حقیقت کو ایک نیا زاویہ دے کر دیکھنے کی کوشش کرے۔ مزاح کی یہ کیفیت زندگی کی تلخیوں کے درمیان ایک روشن لمحے کا سا احساس پیدا کرتی ہے اور قاری کے دل ودماغ کو نہایت شگفتگی کے ساتھ متاثر کرتی ہے۔

رونالڈ کاکس کا ماننا ہے کہ طنز نگار اور مزاح نگار اپنی تخلیقات میں مختلف انداز اپناتے ہیں۔ ان کے مطابق مزاح نگار ہرن کے ساتھ دوستی اور خوش مزاجی کے ساتھ دوڑتا ہے جب کہ طنز نگار کتّوں کے ساتھ مل کر شکار کا کھیل کھیلتا ہے۔ یہ تشبیہ طنز اور مزاح کے بنیادی رویوں اور ان کے اثرات کو واضح کرتی ہے۔

پروفیسر سید احتشام حسین طنز و مزاح کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ''طنز و مزاح میں تفریق آسان نہیں لیکن معلوم ہوتا ہے کہ ظرافت کا مقصد تفریح ہے اور طنز کا مقصد افراط و تفریط کی اصلاح۔''

طنز و مزاح کے مختصر جائزے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ان دونوں کے پیدا ہونے کے عوامل اور اسباب میں ایک حد تک مماثلت پائی جاتی ہے لیکن ان کے اظہار کے ردِ عمل میں نمایاں فرق موجود ہے۔ طنز عام طور پر انسان کے غصّے، برہمی اور ناپسندیدگی کے نتیجے میں وجود میں آتا ہے۔ یہ ردِّ عمل سماج یا زندگی میں پائی جانے والی بے ترتیبی، بدعنوانی، اور کمزوریوں کو نشانہ بناتا ہے۔ دوسری جانب، مزاح انسان کی خوش دلی، مسرت، اور شگفتہ مزاجی کے اثرات سے نمودار ہوتا ہے۔ یہ زندگی کے مضحکہ خیز پہلوؤں کو اُجاگر کر کے تفریح اور خوشی فراہم کرنے کا ذریعہ بنتا ہے۔ اس طرح دونوں کے جذباتی اثرات اور مقاصد کے اعتبار سے نمایاں فرق محسوس کیا جا سکتا ہے، اگرچہ ان کے ظہور کے اسباب میں مماثلت موجود ہے۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:۔

﴿۱﴾ طنز و مزاح کا بنیادی مقصد کیا ہے؟

﴿۲﴾ مزاح کا اثر کیسے مختلف ہوتا ہے؟

﴿۳﴾ طنز کا بنیادی مقصد کیا ہوتا ہے؟

﴿۴﴾ ظرافت طنز و مزاح میں کیوں ضروری ہے؟

﴿۵﴾ مزاح نگار کی تحریریں کس مقصد سے تحریر کی جاتی ہیں؟

﴿۶﴾ طنز کا اثر کس پر ہوتا ہے؟

﴿۷﴾ طنز کا انداز بیان کیسا ہوتا ہے؟

﴿۸﴾ طنز اور مزاح کے اسباب میں کیا مماثلت پائی جاتی ہے؟

﴿۹﴾ طنز و مزاح نگاری کو ایک ذمہ دارانہ طرزِ عمل کیوں کہا جاتا ہے؟

07.04 طنز کی تعریف

طنز کو انگریزی میں ''سیٹائر'' (Satire) کہا جاتا ہے جس کی اصل لاطینی زبان کے لفظ ''سیٹورا'' (Satura) میں موجود ہے۔ اس اصطلاح کا بنیادی مقصد لوگوں کو حقیقت کی طرف مائل کرنا اور اس کا شعور دلانا ہے۔ خاص طور پر ایسی تلخ حقائق جو براہ راست بیان کرنے سے ممکن ہے غیر مؤثر یا ناخوش گوار بن جائیں انہیں ایک مخصوص ادبی انداز میں پیش کیا جاتا ہے۔ طنز کا انداز بیان اس قدر فن کارانہ اور خوب صورت ہوتا ہے کہ یہ براہ راست تنقید یا نصیحت کے بجائے غیر محسوس طریقے سے انسانی سوچ اور رویوں میں مثبت تبدیلی کا باعث بنتا ہے۔ اس میں سماجی برائیوں، انسانی خامیوں اور ناپسندیدہ رویوں کو نمایاں کیا جاتا ہے تاکہ قاری یا سامع بغیر کسی زبردستی کے ان پہلوؤں پر غور کرے اور اپنی اصلاح کی طرف مائل ہو۔ یوں طنز ایک اہم ادبی وسیلہ بن کر سماج کی ترقی اور انسانی کردار کی اصلاح میں اپنا کردار ادا کرتا ہے۔

طنز انسانی زندگی، معاشرتی معاملات اور ماحول کی ناگوار حرکات واعمال سے پیدا ہونے والا ایک خاص طرزِ اظہار ہے۔ یہ وہ انداز ہے جو افراد کے غیر اخلاقی رویوں، نا قابل قبول اعمال اور معاشرتی وسماجی برائیوں کو نشانہ بناتا ہے۔ طنز نگار ان خامیوں اور کمزوریوں کو منظر عام پر لا کر ان میں تبدیلی کا خواہاں ہوتا ہے۔ تاہم وہ اپنی ناپسندیدگی یا نفرت کو براہِ راست بیان کرنے کے بجائے ایسے چبھتے ہوئے اور باریک بینی سے تراشے ہوئے جملے استعمال کرتا ہے جو تلخی کے ساتھ ساتھ ایک خاص لطافت اور شگفتگی کا احساس بھی پیدا کرتے ہیں۔ طنز نگار کا کام محض برائیوں کو اجاگر کرنا نہیں بلکہ اپنے ادبی اسلوب کے ذریعے قارئین یا سامعین کو ان برائیوں پر غور کرنے اور انہیں بدلنے کی ترغیب دینا ہے۔ مختلف دانش وَروں اور ناقدین نے طنز کے اس منفرد فن پر اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے اور اس کی گہری تعریفیں کی ہیں جن کی روشنی میں طنز کے فن کو مزید گہرائی سے سمجھا جا سکتا ہے۔ یہ تعریفیں ہمیں بتاتی ہیں کہ طنز نہ صرف زندگی کی ناہموَاریوں پر تنقید کا ایک مؤثر ذریعہ ہے بلکہ یہ ایک ایسا وسیلہ بھی ہے جو زندگی اور سماج کے مختلف پہلوؤں پر ہمیں غور وفکر کرنے کی دعوت دیتا ہے۔ یوں طنز اپنی پیچیدگی، اثر انگیزی اور ادبی اہمیت کے باعث ہمیشہ ایک منفرد اور قابل قدر صنفِ ادب کے طور پر تسلیم کیا جاتا رہا ہے۔

ولیم ہیزلٹ نے طنز کی خصوصیت بیان کرتے ہوئے کہا ہے کہ:

''زندگی کی تضاد اُس کی زیادتیاں اور بے انصافیاں ہم کو صرف آنسو نہیں بلکہ زہرِ خند بھی عطا کرتی ہیں۔ طنز نگار کی آنکھیں بڑے ضبط اور وقار سے آنسوؤں کو حلقۂ چشم میں چھپا کر مسکراتی ہیں۔''

طنز کے بارے میں جیمس سدرلینڈ رقم طراز ہیں:

''طنز نگار کُرسیِ انصاف پر متمکن منصف کی طرح ہوتا ہے جو مہذّب سماج کے قاعدے قانون کی دیکھ بھال اور مردوں اور عورتوں کی جانچ پڑتال، اخلاقی، دماغی، معاشرتی دیگر معیاروں کے مطابق کرتا ہے۔''

وزیر آغا کے مطابق:

''طنز بنیادی طور پر ایک ایسے باشعور، حسّاس اور درمند انسان کے ذہنی ردِعمل کا نتیجہ ہے جس کے ماحول کی ناہموَاریوں اور بے اعتدالیوں نے تختۂ مشق بنالیا ہو۔''

رشید احمد صدیقی نے طنز (ہجا) کی تعریف اس انداز میں کی ہے کہ:

''ہجا کا عام مفہوم تو یہ ہے کہ کسی شخص، شے یا واقعہ کی برائی پیش کی جائے خواہ وہ جائز ہو یا ناجائز، صحیح ہو یا غلط۔ اس کی مختلف نوعیتیں ہیں اور اس میں طعن وطنز، ہنسی ٹھٹھول، نوک جھونک، پھکّڑ پن اور مغلظات سب آجاتے ہیں۔''

رشید احمد صدیقی نے طنز کے دائرۂ کار کو بھی واضح کیا ہے جو مندرج ہے:

''بہترین طنز کی اساسی شرط یہ ہے کہ وہ ذاتی عناد اور تعصّب سے پاک ہو اور ذہن وفکر کی بے لوث برہمی یا شگفتگی کا نتیجہ ہو۔''

ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی نے طنز کو اس انداز میں بیان کیا ہے کہ:

''سیٹائر (Satire) کے لئے اُردو میں طنز، ہجو، تعریض، لعن طعن اور مذمّت وغیرہ الفاظ کا استعمال کیا جاتا ہے مگر طنز لفظ کا استعمال اُسی سیٹائر کے لئے کیا گیا ہے جس کا مقصد کسی بے ہنگام یا مضحکہ خیز واقعہ یا حالت پر ہمارے جذبۂ تفریح کو تحریک ہو۔ بشرطے کہ اُس میں ظرافت یا خوش طبعی کا عنصر نمایاں ہو اور اُسے ادبی حیثیت بھی حاصل ہو۔ اگر ان حیثیتوں کا فقدان ہوا تو پھر یہ محض گالی گلوج یا دہقانیوں کی طرح مُنہ چڑانا ہوگا۔''

کلیم الدین احمد طنز کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار اس طرح کرتے ہیں کہ:

''ہجو میں ذاتی عنصر کا وجود ناگزیر ہے۔ اساسی شرط یہ ہے کہ شاعر اپنے جذبے کو عالم گیری عطا کر سکے یعنی وہ اپنی شخصیت کو علاحدہ کر کے اپنے جذبۂ نفرت وغضب کو عام انسانی نقائص کے خلاف برانگیختہ کر سکے۔ بہترین طنز کی شرط یہ ہے کہ ذاتی جذبہ محض ذاتی نہ رہے بلکہ عالم گیری ہو جائے۔''

ڈاکٹر شانتا رانی نے طنز کی تعریف اس طرح کی ہے:

''طنز کسی ادارہ، سماج، فرد یا کسی گروہ کی کمزوریوں اور برائیوں کو منظرِ عام پر لا کر اُن پر وار کرتا ہے۔''

ڈاکٹر شوکت سبزواری طنز کی تعریف یوں کرتے ہیں کہ:

''طنز ظرافت سے بالکل الگ چیز ہے۔ یہ ایک طرح کی تنقید، ایک قسم کا عملِ جرّاحی ہے۔ طنز میں چیز کے بُرے پہلو نمایاں کر کے دکھائے جاتے ہیں۔ طنز میں شدّت اور تیزی ضروری شے ہے۔ یہ اچھّے اور بڑے مقصد کے لئے ہوتی ہے۔ ادب میں طنز کی اہمیت مقصدیت کی وجہ سے ہے۔ یہی مقصدیت ہے جس کی وجہ سے طنز کی تلخی گوارہ کر لی جاتی ہے۔''

مندرجہ بالا تعریفوں کی روشنی میں طنز کو اس طرح بیان کیا جا سکتا ہے کہ یہ ایک ایسا اظہار ہے جو طنز نگار کے جذبات اور ماحول کا عکاس ہوتا ہے جس میں فرد یا معاشرتی خامیوں اور ناہمواریوں کو درست کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اس کا مقصد صرف کڑوی باتیں یا سخت تنقید نہیں بلکہ ادبی اور مزاحیہ انداز میں ان مسائل کی اصلاح بھی ہوتا ہے۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:۔

﴿۱۰﴾ طنز کیوں ایک منفرد صنفِ ادب سمجھی جاتی ہے؟

﴿۱۱﴾ طنز کا مقصد برائیوں کو اجاگر کرنے کے علاوہ کیا ہوتا ہے؟

﴿۱۲﴾ کلیم الدین احمد کے مطابق ہجو میں کیا عنصر ضروری ہے؟

﴿۱۳﴾ جیمس سدرلینڈ طنز نگار کو کس کے ساتھ موازنہ کرتے ہیں؟

﴿۱۴﴾ وزیر آغا کے مطابق طنز کا ردِ عمل کس کا ہوتا ہے؟

﴿۱۵﴾ رشید احمد صدیقی کے مطابق بہترین طنز کی اساسی شرط کیا ہے؟

﴿۱۶﴾ ڈاکٹر شانتا رانی کے مطابق طنز کس چیز پر وار کرتا ہے؟

07.05 طنز کی اقسام

طنز کا مقصد زندگی کی درستی اور بہتری کی طرف رہنمائی فراہم کرنا ہے۔اس رہنمائی کو ایک مخصوص ادبی انداز میں پیش کیا جاتا ہے جس کے ذریعے سماج اور فرد کی غیر شعوری اصلاح کی کوشش کی جاتی ہے۔طنز ایک نرمی سے کی جانے والی تنقید ہوتی ہے جو لوگوں کو اپنی کمزوریوں اور غلطیوں کا احساس دلاتی ہے تاکہ وہ اپنی اصلاح کر سکیں۔یہ اصلاحات بذریعہ طنز اس طرح کی جاتی ہیں کہ لوگ اس سے براہِ راست متاثر ہو کر اپنے رویوں میں تبدیلی لائیں۔طنز کی مختلف اقسام ہیں جن میں سے کچھ اہم اقسام کا یہاں مختصراً ذکر کیا جارہا ہے :

استہزا : چبھتے ہوئے فقروں سے کسی کی تضحیک وتذلیل کرنے کو استہزا کہتے ہیں۔اس قسم کے طنز میں دلائل سے اصلاح نہ ہونے پر خردمندانہ وار کیے جاتے ہیں۔اس کا مقصد کسی کی دل آزادی کرنا اور چوٹ پہنچانا ہوتا ہے جیسے انشاء اللہ خاں انشاؔء نے شیخ پر اس طرح طنز کیا ہے۔

آئینے کی گر سیر کرے شیخ تو دیکھے سر خر کا ہے، مُنہ خوک کا، لنگور کی صورت

رمز و کنایہ : رمز و کنایہ کے ذریعہ کیے جانے والے طنز میں عام طور پر ذاتی بغض وعناد کا دخل نہیں ہوتا ہے لیکن کچھ نہ کچھ کدورت ضرور ہوتی ہے اور بذلہ سنجی کی آڑ میں اصل بات کو چھپا کر وار کیا جاتا ہے۔اسے نوک جھونک بھی کہتے ہیں۔انگریزی میں نوک جھونک کے لئے آئیرنی (Irony) کی اصطلاح رائج ہے۔اشارے اشارے میں ایسی بات کہی جاتی ہے جسے متعلّقہ شخص یا اشخاص تو سمجھ لیتے ہیں لیکن دیگر افراد کی سمجھ سے بالاتر ہوتی ہے۔کبھی دلائل،نظریات اور طریقِ استدلال کو بظاہر تسلیم کر کے اس طرح بیان کیا جاتا ہے کہ اُس کے کمزور پہلو نمایاں ہو جاتے ہیں اور کبھی مبالغہ آمیز ایسی بات کہی جاتی ہے جس سے تمام باتیں رد ہو جاتی ہیں جیسے غالبؔ کا یہ شعر۔

بنا ہے شہ کا مصاحب، پھرے ہیں اِتراتا وگرنہ شہر میں غالبؔ کی آبرو کیا ہے

ضلع جگت : کسی کو مبحث قرار دے کر جو باتیں کہی جائیں وہ ضلع یعنی تلازمِ کلام کے زمرے میں آتی ہیں۔جگت کے معنی دانائی یا عقل مندی کے ہیں۔اس لئے رعایتِ لفظی سے کام لے کر کوئی پہلو دار یا ذو معنی بات اس طرح کہنا کہ قاری لفظ کے دونوں معانی کی طرف متوجہ ہو جائے اور اُسے طنز کا احساس بھی ہو تو اُسے ضلع جگت کہتے ہیں جیسے جانؔ صاحب کا یہ شعر ضلع جگت کا بہترین نمونہ ہے۔

آرزو بندی کی ہے خالق سے، اک دن میری سَوت کھائے پھل تلوار کا اور پھول سونگھے ڈھال کا

رعایتِ لفظی : رعایتِ لفظی کو انگریزی میں پَن (Pun) کہتے ہیں۔بہ اعتبارِ معنی بالکل مختلف اور بہ اعتبارِ تلفّظ یکساں اور مشابہ الفاظ کے استعمال سے طنز پیدا کرنے کو رعایتِ لفظی کہتے ہیں۔ایسے الفاظ کے اُلٹ پھیر اور ذومعنویت کے ذریعہ مزاح کے پیرایے میں طنز کیا جاتا ہے۔جیسا کہ درج ذیل شعر سے ظاہر ہے۔

اگر پہنچی، وہ پہنچی کیا جو پہونچے تک نہیں پہنچی ہمارے ہاتھ کی پہنچی سجن جو آپ نے بھیجی

تحریف : تحریف کو انگریزی میں پیروڈی (Parody) کہتے ہیں۔ کسی نگارشات کے الفاظ اور مصنف یا شاعر کے خیالات کو اس طرح تبدیل کر دیا جائے کہ مزاحیہ انداز میں تنقید کا پہلو نمایاں ہو جائے تو اُسے تحریف یا تحریفِ مضحک کہتے ہیں۔ تحریف یعنی پیروڈی کا مفہوم 'اُلٹا نغمہ' ہوتا ہے۔ اسی لئے الفاظ کے اُلٹ پھیر، ردّ و بدل کی بیشی سے نئے معانی و مطالب مُراد ہوتے ہیں جیسے غالبؔ کے مصرع 'سینۂ شمشیر سے باہر ہے دم شمشیر کا' کی تحریف یا پیروڈی 'سینۂ ہمشیر سے باہر ہے دم ہمشیر کا' مفہوم بالکل مختلف ہے۔

نغز : ایسی حاضر جوابی یا برمحل ایسا فقرہ چُست کرنے کو نغز کہتے ہیں جس میں کسی کی ہنسی اُڑانے یا تضحیک کرنے کا نکتہ نمایاں ہو جیسے کسی مشاعرے میں ایک شاعر نے جیسے ہی یہ مصرع پڑھا: ''اب مری شادی کرا دیجے مری ہمشیر سے'' تو سامعین میں سے کسی نے فوراً مرحبا کے بجائے بہ آوازِ بُلند یہ فقرہ چُست کیا 'مر بے حیا'۔

واسوخت : طنز کی ایک قسم واسوخت بھی ہے جس کے معنی ہیں مخاطب کو جلانا یا رشک میں مُبتلا کرنا۔ ایسا شعر یا ایسی بات کرنا جس میں شکوہ شکایت بھی ہو، رنجش کا اظہار بھی ہو اور دھمکی بھی ہو تو اُسے واسوخت کہتے ہیں۔ واسوخت عاشقانہ شاعری کی دل چسپ صنف ہے جس کے ذریعہ مایوس اور برگشتہ عاشق اپنے معشوق کو باور کراتا ہے کہ وہ اُس کی بے التفاتیوں سے مجبور ہو کر کسی اور سے دل لگالے گا۔ درج ذیل شعر واسوخت کا بہترین نمونہ ہے ؎

دنیا میں وضع دار حسیں اور بھی تو ہیں   معشوق اک تمہی تو نہیں اور بھی تو ہیں

مقابلہ : مقابلہ کو انگریزی میں کنٹراسٹ (Contrast) کہتے ہیں۔ مقابلہ بھی طنز کا ایک حربہ ہے۔ اس کے ذریعہ موازنہ یا تقابلی مطالعہ کرتے ہوئے کسی کی ناہموَاریوں یا خامیوں کو طنز کے پیرایے میں اُجاگر کیا جاتا ہے جیسے کسی نحیف و لاغر شخص کی ظاہری شکل و صورت کو کسی دیوقامت پہلوان کے مشابہ قرار دی جائے یا کسی کیم شحیم یا فربہ انداز عورت کو نازک بدن یا انارکلی کہہ کر مخاطب کیا جائے۔

ہجو : ہجو کو ہجا بھی کہا جاتا ہے۔ اس کے لئے انگریزی میں پنچ (Punch) کی اصطلاح مروّج ہے۔ ہجو کے مظاہر تنقید، طعن، تشنیع، نوک جھونک، ملامت، پھبتی، تنقیص، تضحیک اور استہزا ہیں۔ طنز و ظرافت کی جملہ اقسام میں ہجو سب سے زیادہ سخت گیر اور چبھتی ہوئی قسم ہے۔ اس کے ذریعہ نہایت تلخ اور نشتر جیسے کاٹ والے الفاظ میں فرد کی کمزوریوں، سماج کی ناہمواریوں اور معاشرت کی بدنظمی کا تجزیہ کیا جاتا ہے۔ جس شخص کی ہجو مقصود ہوتی ہے اُس پر فقرہ چُست کیا جاتا ہے، اُس کا تمسخر اُڑایا جاتا ہے، اُس کی تضحیک کی جاتی ہے۔ اگر ہجو میں بے باک تنقید اور اصلاح کا پہلو مضمر ہو تو اُسے ہجو ملیح کہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بیک نظر مدح اور توصیف کا شبہ ہوتا ہے لیکن اس کے مفہوم میں تضحیک کا پہلو ضرور ہوتا ہے۔ مرزا محمد رفیع سودا نے قصیدہ 'شہر آشوب' میں سماج کے مختلف طبقوں کا مضحکہ اُڑایا ہے اور اُن پر فقرے چُست کیے ہیں۔ بطورِ مثال درج ہیں چند اشعار ؎

مُلّائی اگر کی جے تو مُلّا کی ہے یہ قدر   ہوں دو رُوپے اُس کے جو کوئی مثنوی خواں ہے
اور ماحضر آخوند کا اب کیا مَیں بتاؤں   اک کاسۂ دالِ عدس و جَو کی دو ناں ہے

طعن : طعن بھی ہجو کی ایک قسم ہے جس کا مقصد بھی کسی کی ہنسی اُڑانا یا کسی کو کمزور یا ذلیل سمجھنا۔ طنز کے پیرایے میں براہِ راست تلخ اور سخت الفاظ میں وار کرنے کو طعن کہتے ہیں۔ انگریزی میں اس کے لئے سرکازم (Sarcasm) کی اصطلاح رائج ہے جس کے لغوی معنیٰ 'چیرنا' یا 'چاک کرنا' کے ہیں۔

ہزل : ہزل میں ذاتیات کو ہدف بنایا جاتا ہے۔ اس کے مظاہر عامیانہ مذاق، پھکّڑپن، فحاشی اور ریختی ہیں۔ تہذیب کے باوجود کلام کا مذاق سلیم سے گر جانا اور مبالغہ ہزل کی خصوصیت ہے جس کے ذریعہ طنز کے تیر چلائے جاتے ہیں جیسے ۔

جا پڑی بنتِ عنب پر جو نظر ساقی کی   رال داڑھی پہ گری، مُنہ میں بھر آیا پانی

فقرہ بازی : انگریزی میں فقرہ بازی کو ر یپیٹ (Repate) کہتے ہیں۔ کسی عمدہ بات کی اہمیت کو کم کر کے اس طرح پیش کیا جائے کہ موضوعِ بحث اور کہنے والے ہر دو کی تضحیک ہو اور کہنے والا نظر سے گر جائے۔ اکثر فقرہ بازی ایک دو جملوں اور بعض اوقات چند الفاظ پر تمام ہو جاتی ہے جیسے کسی مشاعرے میں ایک شاعر نے شعر پڑھنے سے پہلے داد طلب کرنے کے لئے کہا: حضرات! خالص زبان کا شعر ملاحظہ فرمایئے تو برجستہ کسی سامع نے فقرہ بازی اس طرح کی: واقعی آپ کے مُنہ میں ایک بھی دانت نہیں ہے۔ واضح ہو کہ شاعر موصوف ضعیف العمر تھے اور اُن کے تمام دانت گر گئے تھے۔

ہنسی ٹھٹول : ہنسی ٹھٹول کا مقصد ہلکا پھلکا مذاق اور ظرافت کے پیرایے میں طنز کرنا ہے۔ اس کے ذریعہ کسی کی حماقت اور شیخی مارنے پر اُس کی باتوں کو اُلجھاوے میں ڈال کر ندامت کا احساس کرایا جاتا ہے، جیسا کہ اس شعر سے ظاہر ہے ۔

ہوتا نہیں کچھ کام بھی اُس پردہ نشیں سے   آیا نہیں جاتا تو بُلایا نہیں جاتا

تعریض وتنقیص : کسی خاص قباحت یا عام رجحان کے باعث مذاق یا ٹھٹّہ کیا جائے تو اُسے تعریض وتنقیص کہتے ہیں۔ اس قسم کے طنز میں بظاہر تہذیب وسنجیدگی کی جلوہ گری ہوتی ہے۔ اسے طنزیہ ظرافت بھی کہا جاسکتا ہے۔ عام طور پر طنز نگار بظاہر خود کو طنز کا نشانہ بناتا ہے لیکن اصل وار کسی اور پر ہوتا ہے جیسے غالبؔ کا یہ شعر ۔

غالبؔ وظیفہ خوار ہو ، دو شاہ کو دعا   وہ دن گئے کہ کہتے تھے نوکر نہیں ہوں مَیں

نظیرؔ اکبرآبادی کے کلام میں بھی تعریض وتنقیص کے اچھے نمونے پائے جاتے ہیں۔ بطورِ مثال پیش ہے اُن کی ایک نظم کا درج ذیل بند ۔

مُلاّ جو دینے فاتحہ گھر گھر میں جاتے ہیں   حلوا کہیں، کہیں وہ چپاتی اُڑاتے ہیں

مُفلس کوئی بلاوے تو مُنہ کو چھپاتے ہیں   شکّر کا حلوا سُنتے ہی بس دوڑے جاتے ہیں

کہتے ہوئے یہ دل میں اَہاہا ری شبِ برات

پھبتی : کسی کی معصومیت، پارسائی، سیدھے پن، نیکی وغیرہ کا مذاق اُڑانے کے فن کو پھبتی کہتے ہیں۔ اس کے ذریعہ کسی کی خامی کو نمایاں کرنے کے لئے نہایت چبھتی ہوئی تشبیہ کا استعمال کیا جاتا ہے۔ فرد کی کمزوریوں اور ناہمواریوں کو اُجاگر کرنے کے لئے طعنہ زنی کرتے ہوئے آوازے کسنے اور تلخ جملے استعمال کرنے کو پھبتی کہتے ہیں جیسے ۔

زاغ کی چونچ میں انگور خدا کی قدرت پہلوئے حور میں لنگور خدا کی قدرت
اور تو میں کیا کہوں بن آئے ہو لنگور سے داڑھی منڈواؤ، میں باز آئی خدا کے نور سے

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:۔

﴿۱۷﴾ رمز و کنایہ کا کیا مطلب ہے؟
﴿۱۸﴾ رعایتِ لفظی کا کیا مفہوم ہے؟
﴿۱۹﴾ تحریف کا کیا مطلب ہے؟
﴿۲۰﴾ طعن کیا ہے؟
﴿۲۱﴾ ہزل کا کیا مطلب ہے؟
﴿۲۲﴾ فقرہ بازی کا کیا مفہوم ہے؟
﴿۲۳﴾ ہنسی ٹھٹول کا مقصد کیا ہوتا ہے؟
﴿۲۴﴾ پھبتی کس کو کہا جاتا ہے؟
﴿۲۵﴾ نغز کی مثال کیا ہو سکتی ہے؟

07.06 مزاح کی تعریف

انگریزی میں مزاح کو ''ہیومر'' (Humour) کہا جاتا ہے اور اس کا مقصد صرف لوگوں کو محظوظ کرنا یا ہنسی پیدا کرنا نہیں ہے بلکہ اس میں ایک گہری حقیقت چھپی ہوتی ہے جو قہقہوں کے پسِ پردہ ہوتی ہے۔ مزاح کا مقصد وہ تلخ حقائق پیش کرنا ہوتا ہے جو روزمرہ زندگی میں عام طور پر نظر انداز کیے جاتے ہیں اور ان کو اس انداز میں پیش کرنا کہ وہ لوگوں کو سوچنے پر مجبور کریں۔ یہ ایک فن ہے جس میں زندگی کے سخت اور کٹھن حقائق کو خوش مزاجی اور ہنسی کے قالب میں ڈھال دیا جاتا ہے تاکہ لوگ ان سے بچنے یا ان پر افسوس کرنے کے بجائے ان کا سامنا کر سکیں۔ مزاح نگار کے لئے زندگی کے مثبت پہلو اور خوشی کا احساس بہت اہم ہوتا ہے۔ وہ نہ صرف لوگوں کو ہنسانا چاہتا ہے بلکہ ان کو افسردگی اور مایوسی سے باہر نکال کر خوشی اور سُرور کے احساسات سے آشنا کرتا ہے۔ مزاح نگار زندگی میں خوش رہنے کے اصولوں پر یقین رکھتا ہے اور اس کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ وہ دوسروں کو بھی اسی راہ پر چلنے کی ترغیب دے۔ وہ مایوسی، محرومی اور قنوطیت کو منفی سمجھتا ہے اور ان کے خلاف ہے کیوں کہ وہ سمجھتا ہے کہ یہ سب انسان کی فطری خوشی کے راستے میں رکاوٹ ہیں۔ مزاح نگار کا یہ مقصد نہیں ہوتا کہ وہ زندگی کے مشکلات سے بھاگنے کا طریقہ بتائے بلکہ وہ تو انسانوں کو زندگی کی مشکلات کا سامنا کرنے کے لئے خوش دلی سے تیار کرتا ہے اور انہیں یہ سکھاتا ہے کہ زندگی کے مسائل کا مقابلہ مسکراہٹ کے ساتھ کیا جا سکتا ہے۔ مزاح کی اہمیت انسانی زندگی اور معاشرتی نظام میں بہت زیادہ ہے کیوں کہ یہ لوگوں کو ان کے مسائل اور مشکلات کا سامنا کرنے کی ہمت دیتا ہے اور ان کی زندگی میں خوشی کے رنگ بھرتا ہے۔ مختلف ناقدین اور دانش وَروں نے مزاح کے فن پر اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے اور اس کی اہمیت پر روشنی ڈالی ہے۔ ان کی تعریفوں اور خیالات کی روشنی میں ہم مزاح کو بہتر طور پر سمجھ سکتے ہیں اور اس کے فن کا عمیق تجزیہ کر سکتے ہیں۔

مزاح کی تعریف اسٹیفن لی کاک نے اس طرح کی ہے :

''مزاح زندگی کی ناہم وَاریوں کے اُس ہم دَردانہ شعور کا نام ہے جن کا اظہار فن کارانہ طور پر کیا گیا ہو۔''

جے. پی. پریسٹلے نے مزاح کی تعریف کچھ اس طرح کی ہے :

''مزاح کی سب سے اچھّی تعریف یہ کی جاتی رہی ہے کہ یہ ہم دَردی اور ظرافت سے بھرپور غور وفکر اوراحساس ہے۔''

مزاح سے متعلّق شیلے کا قول ہے کہ :

''ہمارے بےفکرے آزاد قہقہوں میں بھی غم کی آمیزش پائی جاتی ہے۔ ہمارے سب سے زیادہ دل کش اور میٹھے راگ وہ ہیں جو کسی نہ کسی تلخ اور ناگوار حقیقت کا پتہ دیں۔''

مزاحیہ ادب کے بارے میں پروفیسر محمد حسن لکھتے ہیں :

''مزاحیہ ادب صرف تبسّم ہی نہیں غور وفکر کی بھی دعوت دیتا ہے۔اس لئے اچھے مزاح نگار کا رُخ محض اعصاب کی طرف نہیں ہوتا بلکہ پوری شخصیت کی طرف ہوتا ہے۔اس کے علاوہ اچھا مزاحیہ ادب، ادب پہلے ہوتا ہے مزاحیہ بعد میں۔اس لئے اچھے ادب کی سی سخت کوشی اور شائستگی چاہتا ہے۔اس کا انداز ادبی اور پیرایۂ اظہار جمال آفریں ہونا لازمی ہے۔''

مزاح سے متعلّق ڈاکٹر یوسف سرمست کا نظریہ ہے کہ :

''مزاح پھکڑّ بازی سے شروع ہوکر حاضر جوابی اور شوخی کو اپنے دائرہ میں لیتا ہوا ایک انبساطی کیفیت تک پہنچ جاتا ہے۔........ یہ زندگی کی حقیقت نہیں، زندگی سے فرار کا راستہ ہے۔مزاح نگار خود قہقہہ لگاتا ہے اور دوسروں کے لئے بھی قہقہہ کا سامان فراہم کرتا ہے۔ وہ مختلف چیزوں کی مضحکہ خیزی کو نمایاں کر کے اُن کی ہنسی اُڑاتا ہے۔ یہ ہنسنا ہنسانا اصل میں احتجاج ہوتا ہے۔''

وزیر آغا نے مزاح کی تعریف اس طرح کی ہے :

''مزاح زندگی کی ناہم وَاریوں کے ہم دَردانہ شعور کا نام ہے جس کا فن کارانہ اظہار ہوجائے۔مزاح کی یہ توضیح دراصل مزاح کی تخلیق سے متعلّق ہے۔ یہ اس بات کا انکشاف کرتی ہے کہ مزاح نگار اپنی نگاہِ دوربین سے زندگی کی اُن ناہم وَاریوں اور مضحک کیفیتوں کو دیکھ لیتا ہے جو ایک عام انسان کی نگاہوں سے اوجھل رہتی ہیں۔''

مزاح سے متعلّق کشن پرشاد کنول کی رائے ہے کہ :

''ظرافت میں طنز مضمر ہوتی ہے۔طنز میں ظرافت کا دخل نہیں ہونا چاہیے۔میرے نزدیک ظرافت طنز سے مشکل فن ہے۔ظرافت کے لئے خوش دلی اور مرحمت درکار ہوتی ہے۔طنز میں جوش، رنج، غصّہ اور بیزاری کی کارفرمائی ہوتی ہے۔''

ڈاکٹر ظہیر احمد صدّیقی نے مزاح سے متعلّق اپنے خیالات کا اظہار اس طرح کیا ہے :

''ہیومر (Humour) کو مزاح، ظرافت، زندہ دلی اور شگفتہ مزاجی کہا جا سکتا ہے۔ یہ کسی ایک بات یا فقرہ میں چھپا نہیں ہوتا بلکہ کسی بیان کے مضحک و دل چسپ پہلو کے احساس کا نتیجہ ہوتا ہے۔ قاری یا سامع کو ہنسی تو ضرور آتی ہے مگر ہم دَردی کا جذبہ بھی پیدا ہو جاتا ہے۔ اس کا تعلّق نہ تو ذہن سے ہوتا ہے اور نہ قہقہہ سے۔ اس میں ظرافت نگار کو فنّی جذبہ کے ساتھ خیال کی بھی وضاحت کرنی پڑتی ہے۔''

ڈاکٹر ساوتری سنہا نے مزاح کی تعریف کچھ اس طرح کی ہے :

''کسی واقعہ، عمل، ماحول، تحریر یا خیالات کے اظہار میں پوشیدہ وہ جذبہ ہے جو اُن کے غیر متعلّقہ بے ڈھنگے پن وغیرہ کی وجہ سے انسان کے دل میں ایک خاص طرح کی خوشی یا لطف پیدا کرے، مزاح یا ہیومر ہے۔''

طنز اور مزاح کے فرق کو سلیمان اطہر جاوید نے اس طرح واضح کیا ہے :

''طنز اور مزاح کی جداگانہ اہمیت کے باوجود وہ باہم دگر مربوط ہوتے ہیں۔ ایک طنز نگار اُس وقت تک کامیاب طنز نگار کہلایا نہیں جا سکتا آں کہ اُس نے مزاح سے اپنے فن کو تب و تاب نہ دی ہو۔ اسی طرح طنز کے سہارے کے بغیر مزاح کی چاشنی برقرار نہیں رہ سکتی۔ طنز محض گالی بن جاتا ہے اور صرف مزاح پھکّڑ پن۔ کیفیت و کمیت میں فرق ہوتا ہے لیکن ایسے فن کار بہت کم ہوں گے جنھوں نے محض طنز یا محض مزاح سے کام لیا ہے اور اگر ایسے ہوں بھی تو ادبی اور معاشرتی اعتبار سے ایسے فن کاروں کا وجود اور عدم موجودگی مساوی ہے۔''

مندرجہ بالا مزاح کی تمام تعریفوں کے پیشِ نظر، مزاح کو اس طرح بیان کیا جا سکتا ہے کہ:

''یہ انسان کی ناپسندیدہ حرکتوں یا معاشرتی کمزوریوں اور خامیوں کو اصلاحی جذبے کے ساتھ، ہم دَردی اور فن کارانہ طریقے سے ظاہر کرنے اور سنجیدہ ماحول کو خوشگوار بنانے کا عمل ہے۔''

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:۔

﴿۲۶﴾ مزاح کا بنیادی مقصد کیا ہے؟

﴿۲۷﴾ اچھے مزاح نگار کی خصوصیات کیا ہیں؟

﴿۲۸﴾ پروفیسر محمد حسن کے مطابق مزاحیہ ادب کیا کرتا ہے؟

﴿۲۹﴾ ڈاکٹر ساوتری سنہا کے مطابق مزاح کیا ہے؟

07.07 مزاح کی اقسام

مزاح ایک ایسا بہترین وسیلہ ہے جس کے ذریعے انسان سرور اور خوشی کا تجربہ حاصل کرتا ہے لیکن اس کا اصل مقصد صرف تفریح فراہم کرنا نہیں ہوتا بلکہ اس میں فرد اور معاشرتی برائیوں کو ظرافت کے انداز میں پیش کر کے لوگوں کو ان برائیوں سے دُور رکھنے کی کوشش بھی کی جاتی ہے۔ مزاح کے ذریعے سماج کی خامیوں، تضادات اور ناپسندیدہ پہلوؤں کو اس طرح پیش کیا جاتا ہے کہ نہ صرف ان کا مذاق اُڑایا جاتا ہے، بلکہ ان سے چھٹکارا پانے کی خواہش بھی پیدا کی جاتی ہے۔ دراصل وہ باتیں جو مزاح کے پیرایے میں کہی جاتی ہیں، وہ سنجیدہ نصیحت سے کہیں زیادہ اثر ڈالتی ہیں کیوں کہ مزاح میں ہنسی اور شوخی کی صورت میں پوشیدہ پیغام زیادہ مؤثر ثابت ہوتا ہے۔

مزاح میں غم، غصہ، تلخی یا طیش کا کوئی گزر نہیں ہوتا بلکہ یہ انسان کو مسرّت اور خوشی کے احساسات سے بھر دیتا ہے۔ مزاح کا مقصد کسی کی خامی، بدصورتی یا بے تکے پن پر خوش دلی سے ہنسنا ہوتا ہے اور اس میں کسی کو تکلیف پہنچانے یا توہین کرنے کا عنصر شامل نہیں ہوتا۔ خالص مزاح ہمیشہ بے ضرر اور ہنسی کے رنگ میں ڈوبا ہوتا ہے جو لوگوں کے دلوں میں خوشی پیدا کرتا ہے۔ مزاح کی مختلف اقسام ہیں جن میں سے کچھ اہم اقسام کا یہاں مختصراً ذکر کیا جا رہا ہے تا کہ ہم ان کے مختلف پہلوؤں اور اثرات کو بہتر طور پر سمجھ سکیں۔

ذاتی مزاح : جب کوئی شخص کسی دوسرے شخص کے بجائے خود اپنی ہی ذات پر ہنسے تو اُسے ذاتی مزاح کہتے ہیں۔

غیر ذاتی مزاح : جب کوئی شخص کسی دوسرے فرد پر ہنسے اور اُسے بھی ہنسائے تو اُسے غیر ذاتی مزاح کہا جاتا ہے۔

شعوری مزاح : قصداً یا سوچ سمجھ کر ہنسنے یا کسی کے ہنسانے کے عمل کو شعوری مزاح کہتے ہیں۔ شعوری مزاح میں بعض اوقات مزاح نگار خود بھی ہنستا ہے اور دوسروں کو بھی ہنساتا ہے۔

غیر شعوری مزاح : جب ہنسانے والا اپنی بے وقوفی یا نازیبا حرکات سے لاعلم ہو اور لوگ اُس کی بے وقوفی یا نازیبا حرکات پر ہنسنے کے لئے مجبور ہو جائیں تو اُسے غیر شعوری مزاح کہتے ہیں۔

تحریری اشکال میں مزاحیہ شاعری اور مزاحیہ تحریر کو مزاح نگاری کہا جاتا ہے۔ مزاح نگاری باقاعدہ ایک فن ہے۔ جب مزاحیہ شاعری یا مزاحیہ تحریر پڑھ یا سُن کر کوئی شخص مسکرائے، ہنسے، قہقہے لگائے یا زیرِ لب خندہ زن ہو تو اُسے جسمانی حرکات کی بنیاد پر مزاح کہا جاتا ہے۔ دراصل تبسّم، ہنسی، قہقہہ، مسکراہٹ اور تبسّمِ زیرِ لب کا اظہار مختلف محرکات کی وجہ سے ہوتا ہے۔ ان اشکال سے کبھی تندی اور کبھی نرمی ظاہر ہوتی ہے۔ جسمانی حرکات کی بنیاد پر مزاح کی کئی اقسام ہیں جن میں سے درج ذیل نہایت اہم ہیں :

مزاحِ خفیف : جب ہنستے وقت انسان کا چہرہ اور آنکھیں روشن ہوں اور دانت برائے نام نظر آئیں تو اُسے مزاحِ خفیف کہتے ہیں۔

تبسّمِ زیرِ لب : جب کسی تحریر کو پڑھ کر یا کسی بات کو سُن کر ہونٹوں کے نچلے حصّہ پر ہلکا سا تبسّم نمودار ہو، دانت نظر نہ آئیں اور پلکیں قدرے کھلی ہوئی محسوس ہوں تو اُسے تبسّمِ زیرِ لب کہتے ہیں۔

شگفتہ مزاح : جب کسی تحریر کو پڑھ کر یا کسی بات کو سُن کر آنکھیں اور ہونٹ قدرے سکڑ جائیں اور ہلکی ہنسی کے ساتھ چہرے پر سُرخی بھی نمودار ہو جائے تو اُسے شگفتہ مزاح کہتے ہیں۔

قہقہہ : قہقہے کئی طرح کے ہوتے ہیں۔ احساسِ کمتری میں مبتلا شخص اپنی کمی یا کمزوری کو چھپانے کے لئے بدتمیزی سے قہقہہ لگاتا ہے۔ احساسِ برتری میں مبتلا شخص دوسروں کی تضحیک کے لئے بلند آواز میں قہقہہ لگاتا ہے۔ نرم دل اور مہذّب شخص کا قہقہہ خوش مذاقی کی علامت ہوتا ہے۔ قہقہہ دار مزاح سے نظروں میں تیزی یا چمک آجاتی ہے، آنکھوں سے آنسو نکلنے لگتے ہیں اور زوردار آواز ہوتی ہے۔ بعض اوقات ہاتھوں سے بغلوں کو دبا لیا جاتا ہے۔ دراصل قہقہہ ذہین دماغ اور خوش طبعی کی علامت ہے۔

دیوارِ قہقہہ : حددرجہ خوشی کا اظہار کرنے یا کسی ہنسی اُڑانے کے لئے مسلسل فلک شگاف قہقہے لگانے کو دیوارِ قہقہہ کہا جاتا ہے۔

مزاحِ خوش طبع : جب ہنسنے والی کی ناک قدرے پھول جائے، نظر میں تیزی یا چمک معلوم ہو اور کندھے سُکڑے ہوئے محسوس ہوں تو اس طرح کے مزاح کو مزاحِ خوش طبع کہتے ہیں۔

گلوگیر ہنسی : جب پورا مُنہ کھول کر ہنسا بھی نہ جائے اور ہنسی کی شدّت کو روکنا بھی ممکن نہ ہو تو ایسی ہنسی کو گلوگیر ہنسی کہتے ہیں۔ قہقہہ کو دبانے کی ناکام کوشش سے ایسی آوازیں نکلتی ہیں جسے دوسرے افراد بہ آسانی محسوس کرلیتے ہیں۔ اس طرح کے مزاح سے خوداعتمادی کے فقدان اور بدتہذیبی کا اظہار ہوتا ہے۔

خندہ استہزا : تضحیک کی نیت سے دبی ہنسی کو خندہ استہزا کہتے ہیں۔ یہ جھنجھلاہٹ یا کھسیانے پن کی علامت ہے۔ ہلکی اور دبی مسکراہٹ، چھپی ہنسی اور آنکھوں کے اشارے سے ایسا تاثر پیدا کیا جاتا ہے جس کا مقصد زیادہ تر تضحیک ہوتا ہے۔

کِلکاری : عام طور پر بچّوں کی بے اختیار اور بلند آواز ہنسی کو کِلکاری کہا جاتا ہے لیکن جب بڑوں کی زوردار ہنسی میں بھونڈا پن، بے اختیاری اور جہل کا عنصر ہو تو ایسی ہنسی کو بھی کِلکاری کہا جاتا ہے۔

بذلہ سنجی : جب اچانک ہنسنے کے سبب سَر اور کندھے ہلنے لگے تو ایسے مزاح کو بذلہ سنجی کہتے ہیں۔ اس قسم کی ہنسی میں کبھی کبھی آنسو بھی نکلنے لگتے ہیں۔

چکلّس : ہلکی اور بے ہنگم ہنسی کو چکلّس ہنسی کہتے ہیں۔ یہ قہقہہ سے کمتر درجہ کی ہوتی ہے۔ اس کی اُٹھان ایسی ہوتی ہے کہ موقع ملنے پر بھی قہقہہ نہیں بن پاتی۔ بعض اوقات کسی بات کا جواب نہ دیتے ہوئے خوش طبعی سے ٹالنے یا نظرانداز کرنے کے لئے بھی اس طرح کی ہنسی کی آواز نکالی جاتی ہے۔

قُلقُل : جب ہنسنے کی طرف طبیعت مائل نہ ہو اور زبردستی یا بے دلی سے بناوٹی ہنسی کی آوازیں نکالی جائیں تو اُسے قُلقُل ہنسی یا قُلقُل مزاح کہا جاتا ہے۔ صراحی سے پانی نکالتے وقت جس طرح کی خاص آواز نکلتی ہے اُسی طرح کی آواز قُلقُل ہنسی کے دَوران نکلتی ہے۔

جگ ہنسائی : دوسروں کو ذلیل اور کمتر سمجھتے ہوئے تضحیک کی نیت سے غیر مہذّبانہ انداز میں ہنسنے کو جگ ہنسائی کہا جاتا ہے۔ جن افراد کو عزّت و ناموس اور شرم و حیا کا لحاظ ہوتا ہے وہ جگ ہنسائی سے بچنے کی بھرپور کوشش کرتے ہیں کیوں کہ اُن کے نزدیک اس سے بڑی ذلّت اور کوئی نہیں ہوسکتی۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:۔

﴿۳۰﴾ مزاح کیا ہے؟

﴿۳۱﴾ مزاح کا اصل مقصد کیا ہوتا ہے؟

﴿۳۲﴾ مزاح میں غم، غصہ یا تلخی کی کیا حیثیت ہے؟

﴿۳۳﴾ خالص مزاح کی کیا خصوصیت ہے؟

﴿۳۴﴾ ذاتی مزاح کسے کہتے ہیں؟

﴿۳۵﴾ غیر ذاتی مزاح کیا ہے؟

﴿۳۶﴾ شعوری مزاح کسے کہتے ہیں؟

﴿۳۷﴾ غیر شعوری مزاح کیا ہوتا ہے؟

﴿۳۸﴾ تبسمِ زیرِ لب کیا ہے؟

﴿۳۹﴾ شگفتہ مزاح کی کیا علامت ہے؟

﴿۴۰﴾ قہقہہ کی کتنی اقسام ہیں؟

﴿۴۱﴾ دیوارِ قہقہہ کیا ہے؟

﴿۴۲﴾ ہنسی کے اظہار کی کون سی شکل سب سے خطرناک ہوسکتی ہے؟

﴿۴۳﴾ گلوگیر ہنسی کس کیفیت کو ظاہر کرتی ہے؟

﴿۴۴﴾ خندہ استہزا کیا ہے؟

﴿۴۵﴾ کلکاری کس قسم کی ہنسی ہے؟

﴿۴۶﴾ بذلہ سنجی کسے کہتے ہیں؟

﴿۴۷﴾ چکلس ہنسی کیا ہے؟

﴿۴۸﴾ قلقل ہنسی کیا ہوتی ہے؟

﴿۴۹﴾ جگ ہنسائی کا مطلب کیا ہے؟

﴿۵۰﴾ قہقہہ دار مزاح کس کی علامت ہے؟

07.08 خلاصہ

انسانی زندگی میں خوشی اور غم دو بنیادی پہلو ہیں۔ ہر کوئی خوشی چاہتا ہے لیکن مشکلات اور مسائل اکثر غم کا سبب بنتے ہیں۔ خوشی کا اظہار ہنسی یا مسکراہٹ کے ذریعے ہوتا ہے جو انسان کو دیگر مخلوقات سے ممتاز کرتا ہے۔ بعض لوگ اپنی خوشی چھپاتے ہیں لیکن عام انسان بھرپور انداز میں خوشی مناتا ہے جو دوسروں کو بھی متاثر کرتی ہے۔

طنز کو انگریزی میں سیٹائر (Satire) اور مزاح کو ہیومر (Humour) کہتے ہیں۔ طنز و مزاح ادب کی اہم اصناف ہیں۔ طنز کا مقصد سماج کی برائیوں کو تیکھے انداز میں اجاگر کرنا اور اصلاح کی ترغیب دینا ہے جب کہ مزاح نرم لہجے میں خوشی اور تفریح فراہم کرتا ہے۔ طنز ناپسندیدہ رویوں پر تنقید کرتا ہے جب کہ مزاح زندگی کی مضحکہ خیزیوں سے مسکراہٹ پیدا کرتا ہے۔ دونوں کا مقصد مختلف ہے لیکن ان کی بنیاد انسانی رویوں اور سماجی مسائل میں مشترک ہے۔

طنز (Satire) ایک ادبی انداز ہے جو سماجی برائیوں، انسانی خامیوں، اور ناپسندیدہ رویوں کو خوب صورتی سے اُجاگر کرتا ہے تاکہ لوگوں کو ان کی اصلاح کی طرف مائل کیا جا سکے۔ یہ براہِ راست تنقید کے بجائے شگفتگی اور لطافت کے ذریعے قاری یا سامع کو غور و فکر پر آمادہ کرتا ہے۔ طنز نگار معاشرتی اور اخلاقی کمزوریوں کو باریک بینی سے نشانہ بناتا ہے اور اپنے تخلیقی اُسلوب سے اصلاح کی تحریک دیتا ہے۔ یہ صنف ادب نہ صرف تنقید بلکہ شعور اور مثبت تبدیلی کا ایک مؤثر ذریعہ بھی ہے جو سماج کی ترقی اور انسانی کردار کی بہتری میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔

طنز (Humour) کا مقصد زندگی اور سماج کی اصلاح ہے جو فن کارانہ انداز میں فرد کی کمزوریوں اور غلطیوں کی نشان دہی کرتے ہوئے انہیں غیر محسوس طور پر بہتری کی طرف راغب کرتا ہے۔ یہ نرم تنقید لوگوں کو اپنی اصلاح پر آمادہ کرنے کا مؤثر ذریعہ ہے۔

مزاح کا مقصد صرف تفریح نہیں بلکہ زندگی کے تلخ حقائق کو خوش مزاجی کے ساتھ پیش کرنا ہے تاکہ لوگ ان پر غور کریں اور خوش دلی سے مشکلات کا سامنا کر سکیں۔ مزاح نگار مایوسی کے خلاف ہوتا ہے اور زندگی میں خوشی اور مثبت رویے کو فروغ دیتا ہے، لوگوں کو مشکلات کا سامنا مسکراہٹ کے ساتھ کرنے کی ترغیب دیتا ہے۔

مزاح انسان کو خوشی اور مسرت کا احساس دیتا ہے لیکن اس کا مقصد صرف تفریح نہیں بلکہ ظرافت کے ذریعے فرد اور سماج کی خامیوں کو اُجاگر کرنا ہے۔ یہ خامیوں کو خوش دلی سے پیش کر کے ان سے چھٹکارا پانے کی ترغیب دیتا ہے۔ خالص مزاح بے ضرر ہوتا ہے، غم یا تلخی سے پاک اور سنجیدہ نصیحت کے بجائے ہنسی کے ذریعے زیادہ مؤثر پیغام پہنچاتا ہے۔

07.09 فرہنگ

احساسِ کمتری	: مرتبے یا دولت وغیرہ اپنے پست ہونے کا تصور جو بالاتر کے بالمقابل اپنے ذہن کی جودت کو دبائے رکھتا ہے۔	زہرِ خند	: وہ ہنسی جو غصّے، ناگواری یا شرمندگی کے سبب ہو۔
اسالیب	: طور طریقے۔ آداب۔	سرایت	: ایک چیز کی دوسری شے میں گھل مل جانے، جذب ہونے اثر انداز ہونے یا سما جانے کا عمل۔
استہزائیہ	: طنزیہ۔	صلاحیت	: لیاقت۔ قابلیت۔
اعصاب	: ایک قسم کی سفید باریک یا موٹی ٹھوس نسیں جو دماغ سے نکل کر تمام جسم میں پھیلی ہوئی اور حس و حرکت کا موجب ہیں۔	عکاسی	: تصویر کشی۔ کسی حالت یا کیفیت کا ہو بہو اظہار۔
		عناد	: دشمنی۔ مخالفت۔
		عنصر	: جزو۔ حصّہ۔

افراط وتفریط : کمی بیشی۔تھوڑا بہت۔
افسردگی : طبیعت کا مُرجھانا۔بے رونقی۔
انبساط : خوشی۔شادمانی۔
انکشاف : اظہار۔
بالیدگی : نشوونما۔
برہمی : بے ترتیب۔الٹ پلٹ۔
بذلہ سنجی : خوش طبعی۔لطیفہ گوئی۔
بصیرت : شعور۔سمجھ۔واقفیت۔
بے ہنگم : بے ڈول۔بھونڈا۔
پسِ پردہ : پردے کی آڑ میں۔نگاہوں سے اوجھل۔
تختۂ مشق : مشق کرنے کی تختی۔وہ چیز جس پر بار بار تجزیہ کیا جائے۔
تذلیل : رسوائی۔ذلّت۔
ترغیب : شوق دلانا۔خواہش پیدا کرنا۔
تشکیل : شکل دینا۔خاکہ تیار کرنا۔
تضحیک : مضحکہ۔ہنسی اُڑانا۔
تعصّب : طرف داری۔بے جا حمایت۔
تلازمِ : باہم لازم ہونا۔وابستگی۔
تناسب : مناسبت۔مطابقت۔
تنقیص : نقص۔کمی۔
توضیح : وضاحت۔صراحت کے ساتھ بیان کرنا۔ تشریح۔
ثقافتی : تہذیب۔
حسّاس : تیز فہم۔جس کی قوّتِ حس بہت تیز ہو۔

عوامل : اسباب۔وجوہات۔
غیر متناسب : جس میں کوئی تناسب نہ ہو۔تناسب سے خالی۔
فُکاہی : ظریفانہ۔مزاحیہ۔
قارئین : مطالعہ کرنے والے۔
قالب : سانچہ۔وہ آلہ جس میں کوئی چیز ڈھالیں۔
قنوطیت : ہر شے صرف بُرے یا تاریک پہلو دیکھنا۔
کدورت : گدلاپن۔غبار آلودہ ہونا۔
لحیم شحیم : نہایت موٹا تازہ۔جسیم۔پُر گوشت۔
مبحث : موضوعِ بحث۔
متمکن : قائم۔مقیم۔
مثبت : تعمیری۔ٹھوس۔
محرکات : وجوہات۔اسباب۔
مخصوص : خاص۔خصوصی۔جداگانہ۔
مرحمت : رحم وکرم۔نوازش۔
مرہونِ منت : احسان مند۔شکر گزار۔
مضحکہ خیز : ہنسی لانے والی بات۔قابل تمسخر۔
مضر : غیر مفید۔نقصان پہنچانے والا۔
معاشرت : اجتمائی زندگی گزارنے کا عمل۔مل جل کر زندگی بسر کرنا۔
مغلظات : بہت فحش باتیں۔موٹی موٹی گالیاں۔
مماثلت : ملتا جلتا ہونا۔مشابہت۔
منفرد : بے مثل
نحیف ولاغر : کمزور۔دبلا پتلا۔ناتواں (جسمانی طور پر)
نوعیت : خصوصی فرق۔

حلقۂ چشم	:	آنکھوں کے آس پاس سیاہ یا گہرے رنگ کا گھیرا۔	نیش زنی	:	طنز کا نشانہ بنانا۔ تکلیف پہنچانا۔
			وسیلہ	:	ذریعہ۔
ذکاوت	:	ذہن کی تیزی۔ تیز فہمی۔	ہم وَار	:	مسطح۔ جس میں نشیب و فراز نہ ہو۔

07.10 نمونہ امتحانی سوالات

الف: درجِ ذیل سوالوں کے جوابات ۱۰/۱۰ سطروں میں دیجیے:

سوال نمبر۱ : طنز اور مزاح میں بنیادی فرق کیا ہے؟

سوال نمبر۲ : مزاح کس طرح لوگوں کو متاثر کرتا ہے؟

سوال نمبر۳ : مزاحِ خوش طبع کیا ہے؟

سوال نمبر۴ : ہیومر (Humour) کیا ہے؟

سوال نمبر۵ : اسٹیفن لی کاک نے مزاح کی کیا تعریف کی ہے؟

سوال نمبر۶ : سلیمان اطہر جاوید کے مطابق طنز اور مزاح کا تعلق کیا ہے؟

سوال نمبر۷ : جے پی پریسٹلے کے مطابق مزاح کیا ہے؟

سوال نمبر۸ : نغز کیا ہے؟

سوال نمبر۹ : رشید احمد صدیقی کے مطابق بہترین طنز کی اساسی شرط کیا ہے؟

سوال نمبر۱۰ : استہزا کی تعریف کیا ہے؟

سوال نمبر۱۱ : رعایتِ لفظی اور تحریف میں کیا فرق ہے؟

سوال نمبر۱۲ : پروفیسر سید احتشام حسین کے مطابق طنز و مزاح میں تفریق کیا ہے؟

سوال نمبر۱۳ : ہجو کی تعریف کیا ہے؟

سوال نمبر۱۴ : رونالڈ ناکس کے مطابق طنز نگار اور مزاح نگار میں کیا فرق ہے؟

سوال نمبر۱۵ : ڈاکٹر یوسف سرمست کے مطابق مزاح کیا ہے؟

سوال نمبر۱۶ : واسوخت کیا ہے؟

سوال نمبر۱۷ : ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی کے مطابق طنز کی تعریف کیا ہے؟

سوال نمبر۱۸ : استہزا اور ہجو میں کیا فرق ہے؟

سوال نمبر۱۹ : ولیم ہیزلٹ کے مطابق طنز کی خصوصیت کیا ہے؟

سوال نمبر۲۰ : پھبتی اور طعن میں کیا فرق ہے؟

سوال نمبر۲۱ : مزاحِ خفیف کسے کہتے ہیں؟

سوال نمبر۲۲ : رشید احمد صدیقی نے ہجا کی تعریف کس طرح کی؟

سوال نمبر۲۳ : ضلع جگت کس قسم کے طنز کی قسم ہے؟

سوال نمبر۲۴ : شیلے کا مزاح کے بارے میں کیا کہنا ہے؟

سوال نمبر۲۵ : کشن پرشاد کنول کے مطابق ظرافت اور طنز میں کیا فرق ہے؟

ب: درج ذیل سوالوں کے جوابات ۳۰/۳۰ سطروں میں دیجیے:

سوال نمبر۱ : طنز کا بنیادی مقصد کیا ہے؟

سوال نمبر۲ : مزاح کی خصوصیت کیا ہے؟

سوال نمبر۳ : طنز و مزاح ادب میں کیوں اہمیت رکھتا ہے؟

سوال نمبر۴ : ڈاکٹر شوکت سبزواری کے مطابق طنز اور ظرافت میں کیا فرق ہے؟

سوال نمبر۵ : مزاح نگاری کیا ہے؟

سوال نمبر۶ : رمز و کنایہ اور ضلع جگت میں کیا فرق ہے؟

سوال نمبر۷ : تعریض و تنقیص میں کس طرح طنز کیا جاتا ہے؟

معروضی سوالات

سوال نمبر۱ : طنز و مزاح کی بنیادی خصوصیت کیا ہے؟

(الف) صرف تفریح فراہم کرنا (ج) معاشرتی برائیوں کی نشان دہی اور اصلاح

(ب) صرف تنقید کرنا (د) صرف خوشی اور ہنسی مذاق

سوال نمبر۲ : مزاح کا اصل مقصد کیا ہوتا ہے؟

(الف) لوگوں کو غمگین کرنا (ج) صرف طنزیہ جملے لکھنا

(ب) سنجیدہ مسائل پر بحث کرنا (د) خوشی، مسرت اور تفریح فراہم کرنا

سوال نمبر۳ : طنز و مزاح کی دنیا میں ظرافت کا کیا مقام ہے؟

(الف) ظرافت طنز کا اہم حصہ ہے (ج) ظرافت اور طنز میں کوئی تعلق نہیں

(ب) ظرافت صرف مزاح میں استعمال ہوتی ہے (د) ظرافت کا تعلق صرف سنجیدہ تحریروں سے ہے

سوال نمبر۴ : طنز کی ایک قسم ''تحریف'' کو انگریزی میں کیا کہا جاتا ہے؟

(الف) Parody (ج) Pun

(ب) Satire (د) Irony

سوال نمبر۵ : طنز کا بنیادی مقصد کیا ہوتا ہے؟

(الف) لوگوں کو محظوظ کرنا (ج) مزاحیہ کہانیاں لکھنا

(ب) سخت لہجے میں معاشرتی ناہمواریوں کی نشان دہی کرنا (د) صرف ہنسی مذاق پیدا کرنا

سوال نمبر۶ : کسی شخص کا خود اپنی ذات پر ہنسنا کس قسم کا مزاح کہلاتا ہے؟

(الف) غیر ذاتی مزاح (ج) شعوری مزاح

(ب) ذاتی مزاح (د) شعوری مزاح

سوال نمبر۷ : پروفیسر محمد حسن کے مطابق اچھا مزاحیہ ادب کیا ہوتا ہے؟

(الف) مزاح پہلے ہوتا ہے، ادب بعد میں (ج) صرف تفریح فراہم کرنا

(ب) صرف قہقہوں پر مبنی ہوتا ہے (د) کسی بھی قسم کی سنجیدگی نہیں رکھتا

سوال نمبر۸ : طنز کی کون سی قسم مبالغہ آمیز الفاظ کے ذریعے کسی نظریے کو کمزور کرنے کے لئے استعمال کی جاتی ہے؟

(الف) رعایتِ لفظی (ج) رمز و کنایہ

(ب) ضلع جگت (د) واسوخت

سوال نمبر۹ : طنز کی کون سی قسم رمز و کنایہ سے تعلق رکھتی ہے؟

(الف) تحریف (ج) استہزا

(ب) نوک جھونک (د) رعایتِ لفظی

سوال نمبر۱۰ : طنز میں عام طور پر کن چیزوں کو نمایاں کیا جاتا ہے؟

(الف) شاعری اور ادب (ج) تاریخی واقعات

(ب) سائنسی ترقی (د) سماجی برائیاں، انسانی خامیاں اور ناپسندیدہ رویے

معروضی سوالات کے جوابات

جواب نمبر۱ : (ج) معاشرتی برائیوں کی نشان دہی اور جواب نمبر۶ : (ب) ذاتی مزاح

اصلاح

جواب نمبر۲ : (د) خوشی، مسرت اور تفریح فراہم کرنا جواب نمبر۷ : (الف) مزاح پہلے ہوتا ہے، ادب بعد میں

جواب نمبر۳ : (الف) ظرافت طنز کا اہم حصہ ہے جواب نمبر۸ : (ج) رمز و کنایہ

جواب نمبر۴ : (الف) Parody جواب نمبر۹ : (ب) نوک جھونک

جواب نمبر۵ : (ب) سخت لہجے میں معاشرتی ناہمواریوں کی نشان دہی کرنا جواب نمبر۱۰ : (د) سماجی برائیاں، انسانی خامیاں اور ناپسندیدہ رویے

07.11 حوالہ جاتی کتب

۱۔	اُردو ادب میں طنز و مزاح کی روایت	از	ڈاکٹر خالد محمود
۲۔	اُردو ادب میں طنز و مزاح	از	غلام احمد کا کوروی
۳۔	اُردو ادب میں طنز و مزاح	از	ڈاکٹر وزیر آغا
۴۔	طنز و مزاح: تاریخ و تنقید	از	طاہر تونسوی
۵۔	فرہنگ فسانۂ آزاد اور اُس کا عمرانی لسانیاتی مطالعہ	از	ڈاکٹر شریف احمد قریشی
۶۔	اُردو نثر کا فنّی اِرتقا	از	فرمان فتح پوری
۷۔	طنز و مزاح کا تنقیدی جائزہ	از	خواجہ عبدالغفور
۸۔	اُردو ادب کی تنقیدی تاریخ	از	سیّد احتشام حُسین
۹۔	ظرافت اور تنقید	از	احمد جمال پاشا

07.12 اپنے مطالعے کی جانچ کے جوابات

﴿۱﴾ افراد اور سماج کی خامیوں کو اجاگر کر کے اصلاح کی راہ ہم وَار کرنا۔

﴿۲﴾ یہ خوشگوار انداز میں ہنساتے ہوئے مسائل کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

﴿۳﴾ سماجی برائیوں اور انسانی خامیوں کو نمایاں کرنا اور ان کی اصلاح کی ترغیب دینا۔

﴿۴﴾ ظرافت طنز و مزاح کی روح ہے اور اسے مؤثر بناتی ہے۔

﴿۵﴾ لوگوں کو خوشی، مسرت، اور انبساط فراہم کرنا۔

﴿۶﴾ انسان اور سماج دونوں پر گہرے اثرات مرتب کرتا ہے۔

﴿۷﴾ فن کارانہ، خوب صورت، اور غیر محسوس طریقے سے تبدیلی لانے والا۔

﴿۸﴾ دونوں کی تحریک زندگی اور سماج کے مسائل سے جڑی ہوتی ہے، مگر ردِ عمل مختلف ہوتا ہے۔

﴿۹﴾ کیوں کہ اس کا مقصد معاشرتی برائیوں کی نشان دہی اور اصلاح ہے۔

﴿۱۰﴾ کیوں کہ یہ پیچیدگی، اثر انگیزی اور ادبی اہمیت رکھتی ہے۔

﴿۱۱﴾ برائیوں پر غور کرنے اور انہیں بدلنے کی ترغیب دینا۔

﴿۱۲﴾ ہجو میں ذاتی عنصر کا وجود ضروری ہے۔

﴿۱۳﴾ طنز نگار کو انصاف کے کرسی پر بیٹھے منصف کے ساتھ موازنہ کرتے ہیں۔

﴿۱۴﴾ طنز ایک باشعور، حساس اور درمند انسان کے ذہنی ردِ عمل کا نتیجہ ہوتا ہے۔

﴿۱۵﴾ بہترین طنز ذاتی عناد اور تعصب سے پاک ہو اور ذہن و فکر کی بے لوث برہمی کا نتیجہ ہو۔

﴿۱۶﴾ طنز ادارہ، سماج، فرد یا گروہ کی کمزوریوں اور برائیوں پر وار کرتا ہے۔

﴿۱۷﴾ رمز و کنایہ میں کسی بات کو اشاروں میں کہہ کر طنز کیا جاتا ہے۔

﴿۱۸﴾ رعایتِ لفظی میں ایک ہی لفظ کے مختلف معانی استعمال کر کے طنز پیدا کیا جاتا ہے۔

﴿۱۹﴾ تحریف میں کسی مصنف یا شاعر کے الفاظ کو تبدیل کر کے مزاحیہ انداز میں تنقید کی جاتی ہے۔

﴿۲۰﴾ طعن میں تلخ اور سخت الفاظ میں کسی کو کمزور یا ذلیل سمجھ کر طنز کیا جاتا ہے۔

﴿۲۱﴾ ہزل میں ذاتیات پر مذاق کیا جاتا ہے اور اس میں عامیانہ مذاق، پھکڑ پن اور فحاشی شامل ہوتی ہے۔

﴿۲۲﴾ فقرہ بازی میں عمدہ بات کی اہمیت کم کر کے تضحیک کی جاتی ہے۔

﴿۲۳﴾ ہنسی ٹھٹول کا مقصد ہلکے مذاق کے ذریعے کسی کی حماقت یا شیخی کا مذاق اُڑانا ہوتا ہے۔

﴿۲۴﴾ پھبتی میں کسی کی معصومیت یا نیکی کا مذاق اُڑایا جاتا ہے۔

﴿۲۵﴾ نغز کی مثال وہ فقرہ ہے جو کسی کی ہنسی اُڑانے یا تضحیک کرنے کے لئے برمحل کہا جائے۔

﴿۲۶﴾ لوگوں کو صرف ہنسانا نہیں بلکہ انہیں سوچنے پر مجبور کرنا اور تلخ حقائق سے آگاہ کرنا ہے۔

﴿۲۷﴾ وہ خوش دلی، گہرے مشاہدے، اور معاشرتی ناہمواریوں کے ادراک کا حامل ہوتا ہے۔

﴿۲۸﴾ یہ نہ صرف مسکراتا ہے بلکہ غور و فکر کی دعوت بھی دیتا ہے۔

﴿۲۹﴾ یہ کسی واقعے، ماحول یا تحریر میں پوشیدہ وہ جذبہ ہے جو خوشی یا لطف پیدا کرے۔

﴿۳۰﴾ مزاح ایک ایسا وسیلہ ہے جو خوشی فراہم کرتا ہے اور سماجی برائیوں کو ہنسی مذاق کے ذریعے بے نقاب کرتا۔

﴿۳۱﴾ لوگوں کو تفریح فراہم کرنا اور سماجی برائیوں کی نشان دہی کر کے ان سے چھٹکارا پانے کی ترغیب دینا۔

﴿۳۲﴾ مزاح میں غم، غصہ، تلخی یا طیش کا کوئی گزر نہیں ہوتا، بلکہ یہ خوشی اور مسرت بخشتا ہے۔

﴿۳۳﴾ خالص مزاح بے ضرر ہوتا ہے اور کسی کی توہین یا تکلیف کا باعث نہیں بنتا۔

﴿۳۴﴾ جب کوئی شخص خود اپنی ذات پر ہنستا ہے تو اسے ذاتی مزاح کہتے ہیں۔

﴿۳۵﴾ جب کوئی شخص کسی دوسرے فرد پر ہنسے اور اسے بھی ہنسائے تو اسے غیر ذاتی مزاح کہا جاتا ہے۔

﴿۳۶﴾ جب کوئی شخص قصداً یا سوچ سمجھ کر ہنسنے یا ہنسانے کا عمل کرے تو اسے شعوری مزاح کہتے ہیں۔

﴿۳۷﴾ جب ہنسانے والا اپنی بے وقوفی یا نازیبا حرکات سے لاعلم ہو اور لوگ اس پر ہنسیں تو یہ غیر شعوری مزاح ہوتا ہے۔

﴿۳۸﴾ جب کسی بات پر ہونٹوں کے نچلے حصے پر ہلکی سی مسکراہٹ ابھرے اور دانت نظر نہ آئیں تو اسے تبسمِ زیرِ لب کہتے ہیں۔

﴿۳۹﴾ جب ہنسی کے ساتھ چہرے پر سرخی نمودار ہو اور آنکھیں اور ہونٹ قدرے سکڑ جائیں تو اسے شگفتہ مزاح کہتے ہیں۔

﴿۴۰﴾ قہقہے کئی طرح کے ہوتے ہیں، جیسے خوش مذاقی، تضحیک، احساسِ برتری یا احساسِ کمتری کے قہقہے۔

﴿۴۱﴾ جب کوئی مسلسل بلند آواز میں قہقہے لگائے تو اسے دیوار قہقہہ کہا جاتا ہے۔

﴿۴۲﴾ خندہ استہزا اور جگ ہنسائی، کیوں کہ یہ دوسروں کی تضحیک اور بے عزتی کا سبب بنتی ہیں۔

﴿۴۳﴾ جب ہنسی کو روکنا ممکن نہ ہو مگر پورا منہ کھول کر نہ ہنسا جائے تو اسے گلوگیر ہنسی کہتے ہیں۔

﴿۴۴﴾ تضحیک کی نیت سے دبی دبی ہنسی کو خندہ استہزا کہتے ہیں۔

﴿۴۵﴾ بے اختیار، بلند آواز اور بھونڈی ہنسی کو کلکاری کہتے ہیں، جو اکثر بچوں کی ہوتی ہے۔

﴿۴۶﴾ جب اچانک ہنسنے سے سر اور کندھے ہلنے لگیں اور کبھی کبھی آنسو نکل آئیں تو اسے بذلہ سنجی کہتے ہیں۔

﴿۴۷﴾ ہلکی اور بے ہنگم ہنسی، جو قہقہے سے کم تر ہو، چکلس ہنسی کہلاتی ہے۔

﴿۴۸﴾ زبردستی یا بے دلی سے نکالی گئی مصنوعی ہنسی کو قلقل ہنسی کہا جاتا ہے۔

﴿۴۹﴾ دوسروں کو ذلیل کرنے یا کمتر سمجھ کر ہنسنے کو جگ ہنسائی کہتے ہیں۔

﴿۵۰﴾ قہقہہ دار مزاح ذہانت اور خوش طبعی کی علامت ہوتا ہے۔

✲

اکائی 08 اُردو نثر میں طنز و مزاح کی روایت

ساخت

08.01 : اغراض و مقاصد
08.02 : تمہید
08.03 : طنز کیا ہے؟
08.04 : مزاح کیا ہے؟
08.05 : طنز و مزاح کے رشتے، اقسام
08.06 : طنز و مزاح کی روایت
08.07 : اردو کے چند اہم طنز و مزاح نگار
08.08 : خلاصہ
08.09 : فرہنگ
08.10 : نمونہ امتحانی سوالات
08.11 : حوالہ جاتی کتب
08.12 : اپنے مطالعے کی جانچ کے جوابات

08.01 اغراض و مقاصد

اس اکائی میں آپ طنز و مزاح کے بارے میں تفصیلی معلومات حاصل کریں گے۔ اس ضمن میں طنز کیا ہے؟ مزاح کیا ہے؟ دونوں کے رشتے کیا ہیں؟ ان کے اقسام، اس کا آغاز اور بتدریج اس کے اِرتقا پر روشنی ڈالتے ہوئے اردو ادب کے سرمایہ ناز طنز و مزاح نگاروں کی بنیادی خصوصیات سے آپ کو واقف کرایا گیا ہے۔ آپ کے ذہن میں یہ واضح ہو جائے گا کہ طنز محض نکتہ چینی اور مزاح محض ہنسنے ہنسانے کا کام نہیں ہے بلکہ اسے فرد و سماج کی بہتری کے لئے بھی استعمال کیا جا سکتا ہے اور اس سے افادی پہلو پر بھی زور دیا جا سکتا ہے۔ آپ ان باریکیوں کو بھی سمجھ جائیں گے اور طنز و مزاح کے تئیں آپ کی دل چسپی مزید بڑھ جائے گی۔

08.02 تمہید

خوشی اور غم، طنز و مزاح ایک فطری عمل ہے جس کے بغیر انسانی زندگی کا تصور ممکن نہیں۔ اس کا رشتہ سماج، فرد اور شب و روز میں ہونے والے واقعات و حادثات سے وابستہ ہے۔ انسان جب مغموم ہوتا ہے تو اس کا اظہار اس کے چہرے سے عیاں ہوتا ہے اور جب خوش ہوتا ہے تو غیر ارادی طور پر اس کا اظہار بھی ہوتا ہے۔ خوشی اور غم کا یہ اظہار جملے، لطیفے اور فقرے سے بھی ہوتا ہے۔ جس میں طنز و مزاح کا عنصر غائب ہوتا ہے۔ اردو ادب میں طنز و مزاح کے ابتدائی نقوش دکن میں ملتے ہیں۔ اردو کی پہلی نثری داستان ''سب رَس'' میں مزاح کے اشارے موجود ہیں۔ اس کے بعد بتدریج اس کی روایت چل پڑی۔ طنز و مزاح اردو نثر اور شاعری دونوں میں خوب خوب برتا گیا ہے۔

08.03 طنز کیا ہے؟

طنز عربی زبان کا لفظ ہے جو انگریزی میں لفظ Satire کا اہم معنی ہے۔ اس کے لغوی معنی طعنہ رمز کے ساتھ بات کرنا، کے ہیں۔ اصطلاحی معنوں میں طنز نشتریت اور چبھن کا دوسرا نام ہے۔ ایک ایسا اظہارِ خیال جس میں طنز نگار فرد اور سماج کی بے شمار کمزوریوں، اس کے بے تکے پن پر چبھتے ہوئے انداز اور تلخ لب و لہجے میں نکتہ چینی کرتا ہے۔ طنز یہ انداز کے بنا پر اکثر دل آزاری ہوتی ہے لیکن اس کا مقصد محض دل آزاری نہیں ہوتا بلکہ بعض دفعہ اس توسط سے غور فکر کی دعوت بھی ملتی ہے اور اس کی کمی و کوتاہی کی نشان دہی مشعلِ راہ کا کام کرتی ہے۔ افلاطون نے کہا کہ جب ہم کسی پر طنز کرتے ہیں، کسی کا مزاق اُڑاتے ہیں تو غیر شعوری طور پر یہ سوچ لیتے ہیں کہ ہمیں یہ نہیں کرنا چاہیے۔ طنز محض تفنّنِ طبع کی چیز نہیں بلکہ اصلاح کا ذریعہ بھی ہے۔ کمی کوتاہی یکسر نظر آتی ہے۔ طنز ہی اسے منظرِ عام پر لاتا ہے اور اس کی اصلاح کرتا ہے۔ جس طرح مالی جب ہرے بھرے باغ میں جاتا ہے اور کانٹ چھانٹ شروع کرتا ہے تو اس وقت یہ احساس نہیں ہوتا کہ آیا یہ اس کی بہتری کے لئے ہے جب کہ یہ تراش خراش اس کے حُسن میں اضافے کا باعث بنتی ہے مختلف دانش وَروں نے طنز کی تعریف اس طرح کی ہے:

> ''طنز شعری یا نثری وہ تخلیق ہے جس میں روز مرّہ کی کمزوریوں یا بے وقوفیوں کا بھی کبھی کچھ حقیقتوں کے ساتھ مذاق اُڑایا جاتا ہے۔ اس کا مقصد کسی فرد خاص یا افراد کے گروہوں کا مضحکہ اُڑانا ہوتا ہے۔''
>
> (آکسفورڈ ڈکشنری، جلد ۱۱ ص ۱۱۹)

> ''اگر آپ کسی مضحک شئے کا اتنا زیادہ مذاق اُڑاتے ہیں کہ اس مذاق میں جذبۂ ہمدری سرے سے ہی ختم ہو جائے تو آپ طنز کی سرحدوں میں داخل ہو جاتے ہیں۔''
>
> (آئیڈیا آف کامیڈی ص ٧٦)

وزیر آغا ''اردو ادب میں طنز و مزاح'' میں فرماتے ہیں کہ:

> ''طنز بنیادی طور پر ایک ایسے باشعور حساس اور درد مند انسان کے ذہنی رَدّعمل کا نتیجہ ہے جس کے ماحول کو ناہم وَاریوں اور بے اعتدالیوں نے تختۂ مشق بنالیا ہو۔''

دراصل طنز جب ذاتی پسند اور ناپسند سے بلند ہو کر غیر جانب دارانہ انداز سے کیا جاتا ہے تو اس طنز میں افادی پہلو موجود ہوتے ہیں۔ ایسا طنز قابلِ تحسین ہوتا ہے جس سے کچھ اچھے نتائج اُبھر کر سامنے آتے ہیں لیکن اگر طنز کا مقصد محض کسی کو ہدف بنا کر اسے چوٹ پہنچانا ہے تو اس سے صرف منفی اثرات ہی مرتب ہوں گے۔ اس لئے طنز نگار کا مطالعہ وسیع اور انداز ہم دَردانہ ہونا چاہیے جو معائب کا پتہ لگائے اور صحیح تجزیہ کر سکے۔

طنزیات اور مضحکات میں رشید احمد صدیقی لکھتے ہیں:

> ''بہترین طنز کی اساسی شرط یہ ہے کہ وہ عناد و تعصّب سے پاک اور ذہن و فکر کی بے لوث برہمی یا شگفتگی کا نتیجہ ہو۔''

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:۔

۱۔ طنز کس زبان کا لفظ ہے؟

۲۔ اردو ادب میں طنز و مزاح'' کے مصنف کون ہیں؟

08.04 مزاح کیا ہے؟

مزاح (Humour) عربی زبان کا لفظ ہے جس کے لغوی معنی ظرافت، مذاق کے ہیں۔ یہ ایک ایسا اظہارِ خیال ہے جو فطری ہے اور اس کی بنیاد خوش دلی اور خوش طبعی پر ہے۔ انسان جب کامیاب ہوتا ہے تو اس کا چہرا، اس کی آنکھیں، اس کے لب، اس کے جذبے کی عکاسی کرتے ہیں اور اس کے چہرے سے خوشیاں جھلکنے لگتی ہیں۔ یہ احساسِ خوشی اسے زندگی کا لطف عطا کرتا ہے اور یہیں سے مزاح کی ابتدا ہوتی ہے۔ مزاح تناؤ کے ماحول کو یکسر بدل دیتا ہے۔ اسے خوش گوار بنا دیتا ہے اور زندگی کے مسائل کا سامنا کرنے کی قوت عطا کرتا ہے۔ اس کا رشتہ طبیعت کی تازگی اور زندہ دِلی سے مربوط ہے۔ مزاح انسان کے افسردہ دل کو نہ صرف مسرّت و شادمانی بخشتا ہے بلکہ ذہن کو بیدار کرکے مشکل راہیں بھی ہم وَار کرتا ہے۔ غرضیکہ فرد سے لے کر قوم کی ترقی تک میں مزاح کا عمل دخل ہوتا ہے۔ مختلف نقّادوں نے مزاح کی تعریف کچھ اس طرح کی ہے:

''صرف صورت واقعہ یا انسانی کمزوریاں ہنسی کا محرک نہیں ہوتی ہیں بلکہ ہم دَردی یا دل خوش کن باتیں، بیان میں گھلاوٹ یا زبان میں لچک اس کے منبع ہیں۔ سمجھ بوجھ، فہم وذکا اور احساسِ دل، صحیح احتساب اور سلامت اس کے اجزائے ترکیبی ہیں۔''

(خواجہ عبدالغفور۔ طنز و مزاح کا تنقیدی جائزہ، ص ۲۹)

''مزاح جب تک مجلس کا دل خوش کرنے کے لئے کیا جائے، ایک ٹھنڈی ہوا کا جھونکا، ایک سہانی خوشبو کی لپٹ جس سے تمام پژمردہ دل باغ باغ ہو جاتے ہیں، ایسا مزاح فلاسفر اور حکماء بلکہ اولیاء وانبیاء نے بھی کیا ہے۔ اس سے مَرے ہوئے دل زندہ ہو جاتے ہیں اور تھوڑی دیر کے لئے تمام پژمردہ کرنے والے غم غلط ہو جاتے ہیں۔ اس سے جودت اور ذہن کو تیزی حاصل ہوتی ہے۔''

(مقالات حالیؔ، ص ۱۴۹)

سید عابد حسین کہتے ہیں:

''وہ مذاق جو پستی کی طرف جھکنے کے بجائے بلندی کی طرف اُبھرتا ہے جس میں نفاست، ندرت، ستھر اپن پایا جاتا ہے اسے ظرافت (مزاح) کہتے ہیں۔''

مزاح میں اعتدال و توازن کا ہونا ضروری ہے۔ ایسا مزاح جو تکلیف کا باعث بنے خواہ وہ جملے اور فقرے کی شکل میں ہو یا محض چند الفاظ پر مشتمل ہو، قابلِ تحسین نہیں ہوسکتا۔ مزاح میں احتیاط لازمی ہے۔ اگر اس کا مقصد کسی فرد کو ذلیل کرنا ہے یا اس میں نچلے سفلے درجے کی باتیں شامل ہوں تو وہ استہزا، ہجو، پھبتی، تنقیص، پھکڑ پن اور تمسخر بن کر رہ جائے گا۔ ڈاکٹر محمد حسن مزاح کو ''شائستگی کا تحفہ'' قرار دیتے ہیں۔ انسان کبھی کبھی خود پر بھی ہنستا ہے۔ جب اسے کسی بات سے شدّت سے تکلیف پہنچتی ہے تو وہ اپنا مزاق اُڑانے سے بھی باز نہیں آتا۔ غالب کے خطوط میں اس کی عمدہ مثالیں موجود ہیں۔ حالیؔ نے غالبؔ کو ''حیوانِ ظریف'' کہا ہے۔ اردو ادب کے بے شمار شاعروں اور ادیبوں کی شاعری، لطیفوں اور خطوط میں مزاح کی چاشنی اور دیگر اصناف میں نثر مزاحیہ کردار موجود ہیں۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:۔

﴿۳﴾ حالؔی نے غالبؔ کو کیا کہا ہے؟

﴿۴﴾ مزاح کی لغوی معنی کیا ہیں؟

08.05 طنز ومزاح کے رشتے، اقسام

ادب سے طنز ومزاح کا رشتہ بڑا گہرا ہے۔ طنز کے بغیر مزاح اور مزاح کے بغیر طنز کا تصوّر ادھورا ہے۔ صرف مزاح وقتی طور پر ہنسی کے ساتھ ہی ختم ہوجاتا ہے اور خالص طنز کا دائرہ محض چوٹ پہچانے تک محدود ہوجاتا ہے۔ البتہ دونوں کی ہم آہنگی سے خاطرخواہ نتائج سامنے آتے ہیں بشرطیکہ کے طنز ومزاح نگار کے جو اُصول وفرائض ہیں ان کا خاطرخواہ خیال رکھا جائے۔

ابتدائی دنوں میں طنز ومزاح کی بنا پر محض تفریح کا سامان مہیا کیا جاتا تھا اور اس میں نوک جھونک، لعن طعن تک بات تھی لیکن اٹھارہ ویں صدی میں دبستان لکھنؤ کی شاعری میں نچلے سفلے درجے کی باتیں کی جانے لگیں۔ رنگینؔ، انشاؔء، جراتؔ، جان صاحب کی شاعری میں ابتذال نمایاں طور پر نظر آتا ہے۔ یہ درباداری زمانہ تھا جس میں شعرا بادشاہِ وقت کو خوش کرنے کے لئے اور انعام واکرام حاصل کرنے کے لئے طرح طرح کے حربے اپناتے تھے۔ ایک دوسرے پر سبقت حاصل کرنے کے لئے انہیں طنز کا نشانہ بھی بناتے تھے۔ اسی زمانے میں صنف ریختی کو بھی خوب مقبولیت ملی جس میں شاعر عورتوں کی زبان میں شاعری کرتے تھے۔ اتنا ہی نہیں بعض دفعہ تو وہ عورتوں کے لباس زیبِ تن کر کے اسی ناز وادا سے نشست وبرخاست کے طریقے بھی اپناتے تھے۔ ایسے ماحول میں شاعری تفنّنِ طبع کی چیز بن گئی تھی۔ دوسری طرف طنز کے نمونے بھی ہمیں ہجویہ قصائد میں ملتے ہیں۔ سوداؔ کا قصیدہ ''قصیدہ درشہرِ آشوب'' اس کا بہترین نمونہ ہے۔ سوداؔ نے اپنے اس قصیدے میں مختلف پیشے اور مختلف طبقے سے تعلق رکھنے والے افراد مثلاً ماسٹر، حافظ، مولوی، ملا، حکیم وغیرہ کی بدحالی کا ذکر کیا ہے۔ دراصل یہ اس وقت کے نظام پر کڑی تنقید ہے۔ رفتہ رفتہ طنز ومزاح کی نوعیت بھی بدل گئی۔ شاعر وادیب کے خطوط اور ان کے کلام میں جا بجا اس کی جھلکیاں ملتی ہیں غالبؔ کے خطوط سے تہذیبی وتمدّنی، معاشرتی، سماجی، سیاسی، اقتصادی اور ثقافتی حالات کو سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے۔ اکبرالہ آبادی کی شاعری میں طنز و ظرافت کے عمدہ نمونے موجود ہیں۔ انہوں نے اپنی شاعری کی ذریعے انگریزی تہذیب کی مخالفت اور نئی نسل کو تنبیہ کی ہے۔

﴿اقسام﴾

طنز ومزاح کی کئی قسمیں ہیں جیسے لعن طعن، فقرہ بازی، تعریض، تنقیص، پھکڑ پن، استہزا، پیروڈی اور آئیرنی وغیرہ۔

فقرہ بازی: اسے پھبتی بھی کہتے ہیں اور یہ تمام زبانوں میں موجود ہے۔ ایسے فقرے کو ادا کرنا جس کا مقصد اور انداز بھی طنزیہ ہو۔

تنقیص: تنقیص، نقص سے بنا ہے۔ یعنی کسی کی کمی کو اُجاگر کرنا، جب صرف خامیوں، کمیوں اور کوتاہیوں کی طرف اشارہ کیا جائے تو اسے تنقیص کہا جاتا ہے۔

پھکڑ پن: جب مذاق حد سے گزر جائے اور اس میں لحاظ واخلاص باقی نہ رہ جائے۔ ذاتی پسند کی بنا پر کسی کو نشانہ بنایا جائے جس میں فحاشی، عریانی یا یہاں تک کہ گالی گلوج بھی شامل ہوجائے تو اسے پھکّڑ پن یا ہزل گوئی کہتے ہیں۔

استہزا: کسی فرد واحد پر اس طرح کے جملے یا فقرے کسنا جس کا مقصد اسے تکلیف پہنچانا ہو یا اسے ذلیل کرنا ہو۔

پیروڈی: اشعار میں لفظ بدل کر مزاح پیدا کرنا۔

کامیڈی: اسے اردو میں طربیہ کہتے ہیں۔ یہ ظرافت کی قسم ہے۔ ارسطو کے مطابق ''کامیڈی کسی ایسی کمزوری، کمی یا بدصورتی کی تصویر کاری ہوتی ہے جو نقصان دہ نہیں ہوتی۔''

08.06 طنز و مزاح کی روایت

اُردو ادب میں طنز و مزاح فارسی کے توسّط سے آیا ہے۔ ہجو یہ شاعری یا تحریف نگاری فارسی کی ہی دین ہے۔ اس کے ابتدائی نقوش داستانوں اور ناولوں میں ملتے ہیں۔ سرورؔ کی ''فسانۂ عجائب''، سراجؔ کی ''بوستانِ خیال'' حیدر بخش حیدریؔ کی ''طوطا کہانی''، مجہولؔ کی ''نورتن'' اور انشاؔ کی ''رانی کیتکی کی کہانی'' میں طنز و ظرافت کی عناصر موجود ہیں۔ ان داستانوں میں نوک جھونک، لعن طعن مسخرے پن کے نمونے ملتے ہیں۔ کہیں ظریفانہ انداز ہے تو کہیں لطیفے موجود ہیں لیکن یہ ساری چیزیں معیاری طنز و ظرافت کے ذیل میں نہیں آتیں۔ غالبؔ کے خطوط نے اسے اعلیٰ مقام عطا کیا ہے۔ غالبؔ نہ صرف ایک عظیم شاعر ہیں بلکہ نثر نگاری میں بھی منفرد طرز کے مالک ہیں۔ یہ عظمت ان کے مکاتیب کی وجہ سے ہے۔ ان کے خطوط سادگی، صفائی، شوخی و دل کشی اور اُسلوبِ اظہار کی وجہ سے ممتاز ہیں۔ غالبؔ نے خطوط کے روایتی انداز سے انحراف کر کے آسان، سادہ اور سلیس زبان پر زور دیا۔ لمبے لمبے جملوں اور فقروں سے احتراز کیا اور وہ اندازِ تحریر ایجاد کیا کہ بقول خود ''مراسلے کو مکالمہ بنا دیا'' غالبؔ کسی کا خط آنے کو خود اس کا آنا تصوّر کرتے تھے اور خط کے لکھنے پڑھنے کو آپسی گفتگو کہتے تھے۔ مزاح غالبؔ کے مزاج کا خاصہ ہے جس کی مثالیں ان کے لطیفوں اور خطوط میں جا بجا بکھری پڑی ہیں۔ ان کی زندگی ناکامیوں اور محرومیوں سے پُر ہے لیکن اس کے باوجود غالبؔ نہ دنیا سے متنفّر ہے اور نہ ہی قنوطی شاعر ہوئے بلکہ زندگی کے آخری دنوں تک مکمل قوّتِ ارادی کے ساتھ زندہ رہے، دراصل مزاح غالب کے مزاج کا خاصہ ہے۔ یہ دوسروں پر کم اور اپنے آپ پر زیادہ ہنستے ہیں۔ غالبؔ کے انتقال ۱۸۶۹ء کے بعد ڈپٹی نذیر احمد کا نام آتا ہے۔ انہیں اردو کا پہلا ناول نگار ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ انہوں نے اپنے ناولوں میں روبہ زوال معاشرہ اور اس معاشرے کی مٹتی ہوئی تہذیب کی عکاسی بڑی خوبی سے کی ہے۔ مشرقی و مغربی تہذیب کے امتزاج کی وجہ سے اس عہد میں طنز و مزاح نگاروں کا موضوع سرسید تحریک اور خود سرسید بھی تھے لیکن اردو نثر میں طنز و مزاح، خطوطِ غالبؔ کے بعد، اودھ پنچ، میں باقاعدہ طور پر ملتا ہے۔ وزیر آغا نے ''اردو ادب میں طنز و مزاح'' میں چکبست کے حوالے سے لکھا ہے ''اودھ پنچ، کے ظریفوں کی شوخ و طرح دار طبیعت کا رنگ غالبؔ سے کہیں مختلف ہے اور ان کے قلم سے پھبتیاں ایسی نکلتی ہیں جیسے کمان سے تیر۔'' یہ اخبار لکھنؤ سے ۱۸۷۷ء میں جاری ہوا۔ اس کے ایڈیٹر منشی سجاد حسین تھے۔ اس وقت یہ شمالی ہندوستان کا سب سے مقبول رسالہ تھا۔ اودھ پنچ کے ذریعے متعدّد طنز و مزاح نگار متعارف ہوئے مثلاً مرزا محبوب بیگ ستم ظریف، منشی احمد علی شوقؔ، پنڈت تربھون ناتھ ہجرؔ، نواب سید محمد آزادؔ، منشی جوالا پرشاد برقؔ، منشی احمد علی کسمنڈی، اکبر حسین اکبرؔ الہ آبادی، پنڈت رتن ناتھ سرشارؔ اور خود اس کے اڈیٹر منشی سجاد حسین۔

سجاد حسین اعلیٰ درجے کے ادیب تھے۔ اودھ پنچ کی مقبولیت میں ان کا بہت اہم رول تھا۔ اودھ پنچ میں ''لوکل'' اور موافقت زمانہ'' کے عنوان سے مضامین، اداریے، شذرات لکھتے تھے۔ یہ کانگریس پارٹی کے رکن تھے۔ زمانے کے اعتبار سے ان کے مضامین کے موضوع سیاسی ہوا کرتے تھے اور انگریزی سرکاران کا نشانہ ہوتی تھی۔ ان کی تحریروں کی خوبی جدّت و ندرت تھی اور طنز سے زیادہ مزاح کا رنگ غالب تھا۔ پنڈت رتن ناتھ سرشارؔ، اردو دنیا میں سرشارؔ کے نام سے مقبول ہوئے۔ ۱۸۴۸ء میں لکھنؤ میں آنکھیں کھولیں۔ یہ دَور لکھنؤ کا زوال آمادہ

دَور تھا۔ ماحول اور طبیعت کی فطری افتاد نے بچپن سے ہی لااُبالی اور آزاد خیال بنا دیا تھا۔ ابتدائی دنوں میں ''اودھ پنچ'' (۱۸۷۷ء) سے وابستہ رہے، بعد میں ۱۸۷۸ء کے آخر میں ''اودھ اخبار'' کے مدیر بنے اور تقریباً ۱۱ر سال تک یہ خدمات انجام دیتے رہے۔ ان کا شاہ کارناول ''فسانۂ آزاد'' دسمبر ۱۸۷۸ء سے دسمبر ۱۸۷۹ء تک قسط وار شائع ہوا۔ اسی ناول کا لافانی کردار میاں خوجی ہے جو لکھنؤ کے مٹتی ہوئی تہذیب کا نمائندہ ہے۔ خوجی احساسِ کمتری کا شکار ہے اور اپنے وجود کا احساس کرانے کے لئے مضحکہ خیز حرکتیں کرتا ہے۔ جس سے بے ساختہ ہنسی آتی ہے۔

سرشارؔ نے لکھنؤ کے مٹتی ہوئی تہذیب اور اس تہذیب میں سانس لیتے ہوئے ہر طبقے سے تعلق رکھنے والے، نواب، دربان، مصاحب، ....بہروپئے، اوہام پرست، ....غرض ان سب کا نقشہ کھینچا ہے جن کے نام سے لکھنؤ میں رونق اور زندگی تھی۔ پنڈت برج کشن گنو کہتے ہیں ''سرشارؔ جب راہ گلی چلتے تو آنکھ اور کان کھول کر چلتے تھے۔'' ''اودھ پنچ'' سے وابستہ دوسرے ادیبوں میں تربھون ناتھ ہجرؔ بھی تھے۔ یہ سرشارؔ سے کافی متاثر تھے۔ لہٰذا ان کے موضوعات بھی آزادؔ ہی کی طرح معاشرہ کے انحطاط سے متعلق ہوا کرتے تھے لیکن ان میں سرشارؔ کی طرح روانی نہیں تھی۔ جوالا پرشاد برقؔ نے قومی مسائل کے لئے قلم اُٹھائے جب کہ احمد علی کسمنڈوی نے اودھ کی کھوکھلی تہذیب و معاشرہ کو اپنے طنز کا نشانہ بنایا ہے۔ اس کے علاوہ اور دوسرے ادیب مثلاً منشی محفوظ علی کا کوروی بھی اس سے وابستہ ہوئے لیکن اب حالات بدل چکے تھے اور اودھ پنچ کا پہلا دَور ۱۹۱۲ء تک کہا جاتا ہے۔ یوسف ناظم ہندوستانی مزاح نمبر شگوفہ میں لکھتے ہیں'' ۱۸۷۷ء میں منشی صاحب نے اودھ پنچ نکالنا شروع کیا جو ۱۹۱۲ء تک نکلتا رہا۔ اس کے بعد بھی اسی نام سے منشی ممتاز حسین نے یہ اخبار جاری کیا لیکن اسے پہلے جیسی مقبولیت نہیں مل سکی۔'' دراصل یہ وہ زمانہ تھا جب حالات مکمل طور پر بدل چکے تھے۔ مغربی اثرات کی بنا پر نئے خیالات، نئے انداز سر اُبھارنے لگے تھے موضوعات میں بتدریج تبدیلیاں ہو رہی تھیں۔ غرض یہ کہ بیسویں صدی کے آغاز کے ساتھ ہی اودھ پنچ کی چمک ماند پڑ گئی۔ اسی زمانے میں سجاد حیدر یلدرم، مہدی افادی، محفوظ علی بدایوانی، شوکت تھانوی، خواجہ حسن نظامی، سلطان حیدر جوش، مرزا فرحت اللہ بیگ، رشید احمد صدیقی، پطرس بخاری، قاضی عبدالغفار، کنہیا لال کپور، شفیق الرحمٰن اور ابراہیم جلیس کے نام اُبھرے ہیں۔

(ان میں نمائندہ طنز و مزاح نگاروں کی تفصیل ہم آگے بتائیں گے)

ان طنز و مزاح نگاروں نے الگ الگ حربے استعمال کرتے ہوئے مختلف موضوعات پر قلم اُٹھایا ہے جس کی وجہ سے طنز و ظرافت کے رجحان کو فروغ حاصل ہوا۔ ادب میں حقیقت پسندی کی داغ بیل پڑ چکی تھی۔ اگر چہ طنز و مزاح پر ان کا کوئی خاص اثر نہیں پڑا ہے۔ تاہم کرشن چندر، کنہیا لال کپور اور ابراہیم جلیس نے طنز و مزاح سے اس کے رشتے کو ہموار کیا ہے۔ (جامن کا پیڑ، گدھے کی سرگزشت وغیرہ) اس وقت کے سماجی مسائل بالکل الگ نوعیت کے تھے۔ انگریزوں کا تسلط ہونے کے ساتھ ساتھ ساہوکاروں، مہاجنوں کا ظلم، مزدوروں کی بے بسی، ان کا استحصال اور حق تلفی الگ زاویے سے بحث کا موضوع بنے ہوئے تھے۔ یہ موضوعات عام طور پر آزادی سے قبل کے ہیں۔ ۱۹۴۷ء کے بعد آزادی کی جدوجہد ختم ہوگئی۔ سیاسی نظام میں تبدیلی آگئی۔ فرقہ وارانہ فسادات، تقسیم ہند کا المیہ، ہجرت کے مسائل، طبقاتی و لسانی فسادات جیسے مسائل سامنے آئے۔ غرض یہ کہ انسانی زندگی اور اسے گزارنے کا طرز و طریق یکسر بدل گیا۔ اس لحاظ سے موضوعات میں بھی کافی وسعت پائی جانے لگی۔ گھریلو موضوعات کے ساتھ ساتھ قومی اور بین الاقوامی حادثات و واقعات بھی قلم بند ہونے لگے۔

کرشن چندر کی تصنیف ''گدھے کی سرگزشت'' اور افسانے ''جامن کا پیڑ، عورتوں کا عطر، گڈھا'' وغیرہ قابل ذکر اضافے ہیں جن پر طنزیہ اثرات غالب ہیں۔ رشید احمد صدیقی، احمد جمال پاشاہ، یوسف ناظم، فکرتونسوی اور مشتاق احمد یوسفی وغیرہ نے آزادی کے بعد خوب لکھا۔ طنزومزاح کی ترقی وترویج کی تاریخ میں زندہ دلانِ حیدرآباد کا ذکر بھی ضروری ہے۔ اسے ابتدا میں ''فائن آرٹس اکیڈمی'' حیدرآباد کے ادبی شعبے کی حیثیت سے تشکیل دیا گیا تھا۔ اس ادبی شعبے میں کل ہند کانفرنس اور مشاعرے منعقد کیے جاتے تھے۔ اس ضمن میں ''شگوفہ'' رسالے کا ذکر ضروری ہے۔ اس کے ایڈیٹر ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال ہیں۔ ۱۹۶۸ء سے شائع ہونے والے رسالے کو زندہ دلان حیدرآباد کے ترجمان کی حیثیت دی گئی۔ ابتدائی دنوں میں یہ رسالہ ڈیڑھ ماہی تھا۔ ۱۹۷۳ء سے یہ ماہ نامہ کر دیا گیا۔ کئی نام وَر ادیب مثلاً رشید احمد صدیقی، کرشن چندر، سلمیٰ صدیقی، کنہیا لال کپور، فکرتونسوی، نریندر لوتھر، مجتبیٰ حسین، عابد معز وغیرہ اس کے لکھنے والوں میں سے ہیں۔ گزشتہ ۳۷ برس سے پابندی سے شائع ہونے والے اس رسالے کی کئی یادگار نمبر بھی نکالے جا چکے ہیں۔ آزادی کے بعد ہندوستان کے اہم مزاح نگاروں میں مجتبیٰ حسین، مسیح انجم، پرویز ید اللہ مہدی، ڈاکٹر عابد معز، فیاض احمد فیضی وغیرہ ہیں جب کہ خواتین مزاح نگاروں میں شفیقہ فرحت، حبیب ضیا، زینت ساجدہ اور بانو سرتاج شامل ہیں۔

08.07 اردو کے چند اہم طنزومزاح نگار

اُردو طنزومزاح میں رشید احمد صدیقی، کنہیا لال کپور، پطرس بخاری، مشتاق احمد یوسفی، مرزا فرحت اللہ بیگ اور مجتبیٰ حسین کی خدمات ناقابلِ فراموش ہیں۔ آیئے ان کی شخصیت اور ان کے کارناموں کا جائزہ لیں۔

﴿۱﴾ **رشید احمد صدیقی (۱۸۹۲ء تا ۱۹۷۷ء)**: رشید احمد صدیقی یوپی میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم جون پور میں اور اعلیٰ تعلیم علی گڑھ میں حاصل کی۔ ادبی زندگی کا آغاز کیا، ملازمت کی اور ساری زندگی یہیں کے ہو کر رہ گئے۔ انہیں علی گڑھ سے قلبی لگاؤ تھا۔ طالب علمی کے زمانے سے ہی مزاحیہ مضامین لکھتے تھے۔ ان کے مضامین میں اعلیٰ طنز و ظرافت کے نمونے ملتے ہیں۔ موضوعات میں تنوّع اور تحریروں میں نادر تشبیہات واستعارات، جدّت وندرت کی خصوصیت پائی جاتی ہے۔ بعض دفعہ ان ہی خصوصیات کی بنیاد پر عبارت بوجھل رنگخلک معلوم ہوتی ہے۔ ان کی ادبی خدمات کی اعتراف میں ساہتیہ اکیڈمی اور پدم شری ایوارڈ سے نوازا جا چکا ہے۔ ''مضامینِ رشید، گنج ہائے گراں مایہ، ہم نفسانِ رفتہ، خنداں، جدید غزل اور آشفتہ بیانی میری'' اہم تصانیف ہیں۔

﴿۲﴾ **پطرس بخاری (۱۸۹۸ء تا ۱۹۵۸ء)**: احمد شاہ بخاری اور پطرس قلمی نام ہے۔ ان کا شمار اردو کے اہم مزاح نگاروں میں کیا جاتا ہے۔ انہوں نے کم لکھا لیکن قابلِ قدر لکھا۔ شوخی، شگفتگی اور برجستگی ان کی تحریروں کی خصوصیت ہے۔ روزمرّہ کی چھوٹی چھوٹی باتوں سے مزاح پیدا کرنا، لفظوں کے اُلٹ پھیر سے جملے کو چست اور قابل توجہ بنانا اور بعض دفعہ خود کا بھی مذاق اُڑانا ان کا مشغلہ رہا ہے۔ یہ انگریزی کے استاد تھے لہٰذا ان کی تحریروں پر اس کا اثر بھی نمایاں ہے۔

﴿۳﴾ **مرزا فرحت اللہ بیگ (۱۸۸۸ء تا ۱۹۴۷ء)**: مرزا فرحت اللہ بیگ ۱۸۸۶ء میں دہلی کے معزز خاندان میں پیدا ہوئے۔ بی.اے. کرنے کے بعد ملازمت کے سلسلے میں حیدرآباد چلے آئے۔ حیدرآباد کے ادبی محفلوں نے ان کے فن کو جلا بخشی۔ پھول والوں کی سیر، دہلی کی آخری شمع، ایک وصیت کی تعمیل، دلّی کا ایک یادگار

مشاعرہ ان کے یادگار مضامین ہیں۔فرحت اللہ بیگ کو مزاحیہ خاکوں کا بانی کہا جاتا ہے۔نذیر احمد اور وحید الدین سلیم پر ان کے مزاحیہ خاکے، دل کش طرزِ نگارش اور دل چسپ اندازِ بیان کی وجہ سے قاری کی دل چسپی کے حامل بن گئے ہیں۔ان کی تحریروں میں شگفتگی، بے ساختگی اور روانی پائی جاتی ہے۔فرحت اللہ بیگ دہلی کے ٹکسالی زبان اور محاوروں کے استعمال پر قدرت رکھتے ہیں۔ان کے قلمی خاکے طنزیہ و مزاحیہ ادب کا بیش بہا سرمایہ ہیں۔ان کے مضامین کے پانچ مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔

﴿۴﴾ **کنہیالال کپور (۱۹۱۰ء تا ۱۹۸۰ء):** کنہیا لال کپور پنجاب میں پیدا ہوئے۔لاہور سے انگریزی میں ایم.اے کیا اور درس و تدریس کے پیشے سے وابستہ ہو گئے۔کنہیا لال کپور انتہائی ذہین انسان تھے۔ہزاروں اشعار زبانی یاد تھے ان کے تحریریں سادہ، سلیس اور رواں ہیں۔موضوعات میں غیر معمولی تنوّع پایا جاتا ہے جس پر طنز کا رنگ گہرا ہے۔یہ سماجی کوتاہیوں کو بے جھجک نشانہ بناتے ہیں۔انہوں نے مختلف طبقے سے تعلق رکھنے والے افراد کی بے راہ رَوی کا مزے لے لے کر مزاق اُڑایا ہے۔سنگ وخشت، شیشہ و تیشہ، چنگ ورُباب، بال و پر، نرم گرم ان کے مشہور مجموعوں کے نام ہیں۔غالب انسٹی ٹیوٹ نے انہیں غالب ایوارڈ سے نوازا۔انہیں پطرس بخاری کے شاگرد ہونے کا اعزاز بھی حاصل ہے۔

﴿۵﴾ **مشتاق احمد یوسفی (۱۹۲۳ء تا ۱۹۸۰ء):** مشتاق احمد یوسفی کی ولادت راجستھان کے ٹونک میں ۴/اگست ۱۹۲۳ء کو ہوئی۔ابتدائی تعلیم ٹونک راجستھان میں ہوئی۔آگرہ یونیورسٹی سے بی.اے علی گڑھ یونیورسٹی سے ایل.ایل. بی اور فلسفہ میں ایم.اے.کیا۔مستقل مزاجی، محنت اور لیاقت کی بنا پر ابتدا میں پروفیشنل سول سروس (PCS) اور مسلم کمرشیل بینک کراچی میں ملازمت حاصل کی۔بین الاقوامی بینکوں سے بھی وابستہ رہے۔اپنے ان تجربات کو اپنی خود نوشت سوانح عمری ''زرگذشت'' میں دل چسپ انداز میں بیان کرتے ہیں۔

یوسفی اردو طنز و مزاح کی تاریخ میں ایک خاص مقام رکھتے ہیں۔اردو ادب میں طنز و مزاح کو ایک بلند معیار عطا کرنے میں انہوں نے ایک اہم رول ادا کیا۔شگفتگی، شعریت، دل کش اُسلوب اور انوکھا اندازِ بیان ان کے فن کو انفرادیت عطا کرتے ہیں۔ان کی تصانیف میں'' چراغ تلے، خاکم بدہن، زرگشت اور آبِ گم'' ہیں۔ان میں یوسفی کا فن بتدریج فن کے معراج کمال کو پہنچا ہوا دکھائی دیتا ہے۔

﴿۶﴾ **مجتبیٰ حسین (۱۹۳۶ء تا ۲۰۲۰ء):** مجتبیٰ حسین ۱۵/جولائی ۱۹۳۶ء کو کرناٹک میں ضلع گلبرگہ کے ایک تعلقہ چنچولی میں پیدا ہوئے۔ابتدائی تعلیم گلبرگہ میں ہوئی۔عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد سے بی.اے کیا۔کچھ عرصہ محکمۂ مال حکومت آندھرا پردیش میں ملازمت کی ۱۹۶۲ء میں محکمۂ اطلاعات و تعلقاتِ عامہ کے شعبۂ اردو سے وابستہ ہوئے ۱۹۷۱ء میں گجرال کمیٹی کے شعبۂ تحقیق میں اور ۱۹۷۴ء میں نیشنل کونسل آف ایجوکیشن ریسرچ اینڈ ٹریننگ (NCERT) میں ایڈیٹر مقرر ہوئے۔ ۱۹۹۳ء میں سبک دوش ہوئے۔

مجتبیٰ حسین کی تحریروں میں طنز کے نشتر اور مزاح کی چاشنی کا حسین امتزاج ہے۔اب تک ان کی قریب ۱۴/کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ جن میں قطع کلام، قصہ مختصر، بہر حال، بالآخر، الغرض اور آخر کار قابلِ ذکر ہیں۔مجتبیٰ حسین ادبی صحافت سے بھی وابستہ رہے ہیں۔کالم نگاری، خاکہ نگاری میں اپنا ایک خاص مقام رکھتے ہیں۔ان کی خدمات کے پیشِ نظر مختلف انعامات و اعزازات سے نوازا گیا۔جس میں'' پدم شری'' جیسا باوقار اعزاز بھی شامل ہے۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:۔

﴿۵﴾ ''اودھ پنچ'' کب اور کہاں سے جاری ہوا؟

﴿۶﴾ اودھ پنچ سے متعارف ہونے والے کن ہی دو طنز و مزاح نگاروں کے نام لکھیے ۔

﴿۷﴾ میاں خوجی کس ناول کا کردار ہے؟

﴿۸﴾ ''چراغ تلے'' کے مصنف کون ہیں؟۔

﴿۹﴾ کیا کنہیا لال کپور، پطرس بخاری کے شاگرد تھے؟

﴿۱۰﴾ ''شگوفہ'' کے ایڈیٹر کا نام بتائیے۔

08.08 خلاصہ

سرشار نے لکھنؤ کے مٹتی ہوئی تہذیب اور اس تہذیب میں سانس لیتے ہوئے ہر طبقے سے تعلق رکھنے والے کرداروں کی جیتی جاگتی اور حقیقی تصویریں پیش کی ہیں ۔سرشار کے علاوہ اودھ پنچ سے وابستہ ادیبوں میں تر بھون ناتھ ہجر بھی تھے۔ جوالا پرشاد برق نے بھی معاشرتی مسائل کو ہی موضوع بنایا۔بیسویں صدی کے آغاز کے ساتھ ہی ادھ پنچ کی چمک ماند پڑ گئی ۔اس زمانے میں سجاد حیدر یلدرم ،مہدی افادی، محفوظ علی بدایونی،شوکت تھانوی ،فرحت اللہ بیگ وغیرہ نے طنز ومزاح کو ایک نئی سمت دی ۔ادب میں حقیقت پسندی کا بھی یہی دَور تھا۔ادبی حقیقت نگاری نے طنز ومزاح کے عناصر سے بھی کام لیا۔کرشن چندر کا 'جامن کا پیڑ' اور ''ایک گدھے کی سرگزشت'' وغیرہ اسی سلسلہ کی کڑیاں ہیں ۔طنز ومزاح کی ترقی وترویج میں زندہ دلان حیدرآباد اوران کے نمائندہ رسالے ''شگوفہ'' کا بھی بڑا ہاتھ رہا ہے۔ یہ رسالہ ۱۹۶۸ء سے شائع ہونا شروع ہوا اور آج بھی جاری ہے۔طنز ومزاح کو ایک نئی سمت دینے میں رشید احمد صدیقی کا نام بے حد اہم ہے۔طنزیات ومضحکات ان کے طنزیہ مضامین کا اہم مجموعہ ہے۔اس کا طنز گہری مصنوعیت کا حامل ہوتا ہے ۔اسی لئے عوام سے زیادہ خواص کی چیز ہے۔کنہیا لال کپور، پطرس بخاری، مشتاق احمد یوسفی ،فرحت اللہ بیگ اور مجتبیٰ حسین جیسے مزاح نگاروں نے گہری فنی بصیرت اور پختہ سماجی شعور کو بروئے کار لاتے ہوئے اُردو ادب کے طنزیہ ومزاحیہ ادب میں قابلِ قدر اضافہ کیا ہے۔

08.09 فرہنگ

احتراز	:	پرہیز،علاحدگی	ظرافت	:	دل لگی،خوش طبعی
احتساب	:	جانچ ، پڑتال	ظریف	:	لطیفہ گو،بذلہ سنج
امتزاج	:	ملاوٹ،علاحدگی	عناد	:	دشمنی ، عداوت
انحراف	:	انکار	قنوطی	:	مایوس،ناامید
پژمردہ	:	افسردہ ، مرجھایا ہوا	متنفر	:	نفرت کرنے والا
تفنن طبع	:	تفریحی مشغلہ	مجہول	:	نامعلوم،سست،نکما
تمسخر	:	مذاق،ٹھٹول	مراسلہ	:	خط

تنقیص	:	نقص نکالنا	مربوط	:	بندھا ہوا، وابستہ
توسط	:	ذریعہ، وسیلہ	مضحکہ	:	ہنسی، جس کا مزاق اڑائیں
جودت	:	ذہانت، لیاقت	منبع	:	چشمہ، سوتا، پانی نکلنے کی جگہ
رمز	:	اشارہ، آنکھوں بھنوؤں یا ہونٹوں کا اشارہ	ندرت	:	عمدگی ، انوکھاپن
شعور	:	سلیقہ	ہدف	:	نشانہ، زد

08.10 نمونہ امتحانی سوالات

الف: درجِ ذیل سوالوں کے جوابات ۱۰/۱۰ سطروں میں دیجیے:

سوال نمبر۱ مزاح کیا ہے؟ اس کی تعریف کیجیے۔

سوال نمبر۲ طنز کسے کہتے ہیں اور یہ کس طرح اصلاح کا کام کرتا ہے؟

سوال نمبر۳ اردو طنز و مزاح کی فروغ میں اودھ پنچ کی خدمات کا جائزہ لیجیے۔

ب: درج ذیل سوالوں کے جوابات ۳۰/۳۰ سطروں میں دیجیے:

سوال نمبر۱ طنز و مزاح کے آغاز و ارتقا پر روشنی ڈالیے۔

سوال نمبر۲ بیسویں صدی کے طنز و مزاح نگاروں کا تعارف پیش کیجیے۔

سوال نمبر۳ طنز و مزاح کی تعریف کرتے ہوئے اس کے رشتے اور اقسام پر روشنی ڈالیے۔

08.11 حوالہ جاتی کتب

۱۔	آج کا اردو ادب	از	ڈاکٹر ابواللیث صدیقی
۲۔	اُردو ادب میں طنز و مزاح	از	وزیر آغا
۳۔	اُردو شاعری میں طنز و مزاح	از	محمد یونس فہمی
۴۔	طنزیات و مضحکات	از	رشید احمد صیدیقی

08.12 اپنے مطالعے کی جانچ: جوابات

﴿۱﴾ عربی

﴿۲﴾ وزیر آغا

﴿۳﴾ حیوانِ ظریف

﴿۴﴾ مزاح کے لغوی معنی ظرافت، مذاق کے ہیں

﴿۵﴾ ۱۸۷۷ء میں لکھنؤ سے جاری ہوا۔

﴿۶﴾ پنڈت تربھون ناتھ ہجرؔ، منشی سجاد حسین

﴿۷﴾ فسانۂ آزاد

﴿۸﴾ مشتاق احمد یوسفی

﴿۹﴾ ہاں

﴿۱۰﴾ ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال

اکائی 09 طنز ومزاح کی سماجی اہمیت

ساخت

09.01 : اغراض ومقاصد

09.02 : تمہید

09.03 : طنز ومزاح کا ابتدائی زمانہ

09.04 : اُردو طنز ومزاح کے فروغ میں ''اودھ اخبار'' کا حصّہ

09.05 : اُردو طنز ومزاح کے فروغ میں ''اودھ پنچ'' کا حصّہ

09.06 : ''اودھ پنچ'' کے بعد اُردو طنز ومزاح

09.07 : خلاصہ

09.08 : فرہنگ

09.09 نمونہ امتحانی سوالات

09.10 : حوالہ جاتی کتب

09.11 : اپنے مطالعے کی جانچ کے جوابات

09.01 اغراض ومقاصد

طنز ومزاح نگاری ادب کی ایک ایسی صنف ہے جس میں زندگی کی ناہمواریوں، تضادات اور مضحکہ خیز صورت حال کو دل چسپ اور پرلطف انداز میں پیش کیا جاتا ہے۔ یہ اسلوب عام طور پر قاری کو تفریح فراہم کرنے کے ساتھ ساتھ اسے معاشرتی مسائل پر غور وفکر کرنے پر بھی آمادہ کرتا ہے۔ جہاں طنز زندگی کی تلخ حقیقتوں کو بے نقاب کرنے کے لئے استعمال کیا جاتا ہیو ہیں مزاح کا مقصد ان پہلوؤں کو ہمدردانہ اور نرم روی سے اُجاگر کرنا ہوتا ہے۔ خالص مزاح نگار کی تحریروں میں وہ چیزیں نمایاں ہوتی ہیں جو انسان کی روزمرہ زندگی میں اسے ہنسنے پر مجبور کرتی ہیں لیکن ان کا انداز عموماً نرم، شگفتہ اور ہمدردی پر مبنی ہوتا ہے۔ اس طرزِ نگارش کا مقصد نہ صرف قاری کو مسکراہٹ دینا ہے بلکہ اسے زندگی کی پیچیدگیوں کو نئے زاویے سے دیکھنے کا موقع فراہم کرنا بھی ہوتا ہے۔ طنز ومزاح نگاری میں یہی انفرادیت اسے دیگر ادبی اسالیب سے ممتاز کرتی ہے۔ اگر آپ اس اکائی کو غور وفکر کے ساتھ مطالعہ کریں گے تو نہ صرف طنز ومزاح کی سماجی اہمیت کو گہرائی سے سمجھنے میں مدد ملے گی بلکہ اس موضوع کے لئے آپ کی دل چسپی اور شوق میں بھی نمایاں اضافہ ہوگا۔

09.02 تمہید

طنز اور مزاح کے درمیان ایک گہرا اور اہم تعلق پایا جاتا ہے جو دونوں کے اثرات کو متوازن اور موثر بنانے میں مدد دیتا ہے۔طنز کی شدّت کو کم کرنے کے لئے اکثر اس میں مزاح کی آمیزش کی جاتی ہے تاکہ اس کی تلخی نرم ہو جائے اور اس کا پیغام قاری کے لئے قابلِ قبول بن سکے۔ جب کسی تحریر میں صرف طنز موجود ہو تو اس کے غیر دل چسپ یا ناگوار ہونے کا خدشہ رہتا ہے کیوں کہ قاری کے لئے تلخ حقائق کو براہ راست قبول کرنا مشکل ہو سکتا ہے۔اسی طرح اگر کوئی تحریر محض مزاح پر مبنی ہو تو اس میں گہرائی اور مقصدیت کا فقدان ہو سکتا ہے جس کے نتیجے میں وہ محض تفریح کا ذریعہ بن کر رہ جاتی ہے اور قاری پر دیرپا اثر ڈالنے سے قاصر رہتی ہے۔یہی وجہ ہے کہ ادبی تخلیق کار چاہے وہ نثر میں ہوں یا نظم میں طنز اور مزاح کو ملا کر ایک ایسا امتزاج تخلیق کرتے ہیں جو نہ صرف دل چسپ اور پر کشش ہو بلکہ قاری کو سوچنے پر بھی مجبور کرے۔اس آمیزش کے ذریعے وہ اپنی تحریر کو مزید موثر، بامقصد اور قاری کے لئے یادگار بنانے میں کامیاب ہوتے ہیں۔

طنز و مزاح تخلیقی ادب کی وہ دل کش جہت ہے جو اپنے لطیف اور گہرے اشاروں کی بدولت قارئین کو نہ صرف محظوظ کرتی ہے بلکہ ان کے دل و دماغ پر دیرپا اثر بھی چھوڑتی ہے۔ یہ اس مخصوص سماجی ماحول اور تہذیبی پس منظر کی عکاسی کرتا ہے جس میں یہ تخلیق پایا جاتا ہے۔کسی بھی ادبی تحریر میں طنز و مزاح کے عناصر کا مناسب اور موزوں استعمال نہ صرف اس تحریر کو دل کش اور پر کشش بناتا ہے بلکہ اس کے اثر کو بھی کئی گنا بڑھا دیتا ہے۔ ہمارے ادب میں اس کی بہترین مثالیں کثرت سے موجود ہیں جہاں ادیبوں اور مصنفین نے طنز و مزاح کو نہایت مہارت اور خوب صورتی کے ساتھ استعمال کرتے ہوئے اپنی بات کو نہایت موثر اور وزن دار بنایا ہے۔ان کی تخلیقات نہ صرف قاری کو مسکراہٹ سے ہم کنار کرتی ہیں بلکہ اسے گہرے سماجی اور اخلاقی پیغامات کے بارے میں غور و فکر کرنے پر بھی مجبور کرتی ہیں۔

09.03 طنز و مزاح کا ابتدائی زمانہ

طنز و مزاح کا بنیادی مقصد قارئین کو محض محظوظ کرنا نہیں بلکہ ان کی سوچ میں تبدیلی لا کر معاشرتی اصلاح کا عمل شروع کرنا بھی ہے۔ اُردو ادب میں طنز و مزاح کی روایت ہمیں اس کے ابتدائی دَور ہی سے ملنے لگتی ہے جہاں ادیبوں اور شاعروں نے اپنے زمانے کے حالات کو نہایت باریکی سے سمجھتے ہوئے ان پر روشنی ڈالی۔ اُردو کے شاعروں اور ادیبوں نے ابتدا ہی سے سماجی رویوں کی کھوکھلی بنیادوں، مختلف تضادات، معاشرتی اور سیاسی برائیوں، توہم پرستی اور فرسودہ روایات کو اپنے طنزیہ و مزاحیہ انداز میں نشانہ بنایا ہے۔

اگر ہم طنز و مزاح کے ادب کی ابتدا کے نقوش کا جائزہ لیں تو ہمیں اس کی پہلی جھلکیاں امیر خسرؔو کی تخلیقات میں ملتی ہیں جیسے کہ ان کی کہہ مکرنیاں، دو سخنے اور انمل میں ہی نظر آتے ہیں جہاں مزاح کے عناصر بے ربط اور بے جوڑ الفاظ کے ذریعے سامنے آتے ہیں۔امیر خسرؔو نے اس طریقے سے الفاظ کا استعمال کیا کہ ان میں ہنسی مذاق اور چٹکیاں پیدا ہوتی ہیں جن سے ایک نیا تخلیقی رنگ ابھرتا ہے۔ یہ ایک ایسا انداز تھا جس میں غیر معمولی اور نرالا طریقہ اپنایا گیا تھا تاکہ لوگوں کو محظوظ کیا جا سکے۔اسی طرح دکن کے علاقے میں بھی طنز و مزاح کے رنگوں کا استعمال نظر آتا ہے، خاص طور پر قلی قطب شاہ اور ولی دکنی کی تخلیقات میں۔ دونوں نے اپنے اپنے زمانے میں طنزیہ اور مزاحیہ ادب کو نئے انداز میں پیش کیا اور ان کے لکھے ہوئے ادب میں لفظوں کے بیچ میں ایک خاص توازن اور گہرائی دکھائی دیتی ہے۔

جب ہم طنز و مزاح کی ابتدا کا مطالعہ کرتے ہیں اور اس میں طنز و ہجو نگاری کے پہلے اور نمایاں نمونوں کو تلاش کرتے ہیں تو اس سلسلے میں جو سب سے اہم نام سامنے آتا ہے وہ اٹھارویں صدی کے مشہور شاعر جعفر زٹلی کا ہے۔

جعفر زٹلی نے اپنے دور کے سیاسی اور سماجی حالات، اقتصادی بدحالی اور تہذیبی زوال کو نہایت دلیرانہ انداز میں طنز و مزاح کے ذریعے بیان کیا۔ ان کے اشعار میں طنز کی کاٹ اور مزاح کی شگفتگی کے امتزاج نے ان کی تحریروں کو نہ صرف اس دور میں بلکہ آج بھی یادگار بنا دیا ہے۔ ان کی تخلیقات اس بات کا ثبوت ہیں کہ طنز و مزاح نہ صرف قاری کو حقیقت کے قریب لانے کا ذریعہ ہے بلکہ معاشرتی اصلاح کی ایک مؤثر شکل بھی ہے جو عوام کے دلوں پر دیرپا اثر ڈال سکتی ہے۔

جعفر زٹلی کی شاعری ایک نئی طرزِ ادا اور منفرد لب و لہجے کی حامل ہے جو اپنے عہد کی تہذیبی اور ثقافتی حقیقتوں کی بھرپور عکاسی کرتی ہے۔ انہوں نے اپنی شاعری میں دہلی کی تباہی اور بربادی کو بے مثال انداز میں پیش کیا اور اس میں ایک نیا رنگ اور نیا جذبہ شامل کیا جو پہلے کبھی نہیں دیکھا گیا تھا۔ جعفر زٹلی نے روایتی شاعری سے انحراف کرتے ہوئے نہ صرف اپنی شاعری کے موضوعات میں جدت پیدا کی بلکہ اس میں سماجی و سیاسی مسائل کو بھی بڑی شدت اور جرأت کے ساتھ شامل کیا۔ وہ پہلی بار اپنی شاعری کے ذریعے عوام کو سیاست کی پیچیدگیوں، سماجی عیاریوں اور معاشرتی پریشانیوں سے متعارف کراتے ہیں۔ ان کی تخلیقات میں ایک واضح تنقید اور تیز لہجہ ہے جس کے ذریعے وہ عوام کی حالتِ زار اور معاشرتی بدحالی کو بے باکی کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔ اس طرح زٹلی نے نہ صرف شاعری کی روایات کو چیلنج کیا بلکہ ایک نئی فکری راہ بھی متعارف کرائی جس میں عوامی مسائل اور سماجی برائیوں کو کھل کر اور جرأت سے اجاگر کیا گیا۔ جس کی وضاحت کرتے ہوئے ڈاکٹر محمد فیروز دہلوی لکھتے ہیں:

> ''اردو میں جعفر زٹلی ایسے پہلے شاعر ہیں جنہوں نے اورنگ زیب کے بعد سلطنت مغلیہ کی بکھری ہوئی مرکزیت، حاکموں کی بے انصافی، ظلم و ستم، معاشی بدحالی، ہنرمندوں کی رسوائی، بگڑتے ہوئے اخلاق و کردار کو طنزیہ اور انتہائی جارحانہ انداز میں نظم کیا۔ ایسا جارحانہ انداز جسے برہنہ گفتاری ہی کہا جا سکتا ہے ...... جعفر زٹلی نے اپنے احتجاج اور اعتراضات کے لئے جس برہنہ گفتاری یا بدگفتاری کا سہارا لیا ہے وہ طنز کا انتہائی تیز اور تیکھا پن ہے۔ مگر ہم اس رنگ کو نظر انداز بھی نہیں کر سکتے۔ شمالی ہند میں اسی آشوبیہ کلام سے اردو شاعری کا آغاز ہوا۔''

(اُردو ادب میں طنز و مزاح کی روایت، مرتب ڈاکٹر خالد محمود، ص 177-178، اردو اکادمی، دہلی 2005)

اُردو ادب میں طنز و مزاح کو مضبوط بنیاد فراہم کرنے والے اُدَبا اور شعرا نے اپنے عہد کے مسائل، اخلاقی گراوٹ اور تہذیبی زوال کو اپنے فن کا موضوع بنایا۔ مرزا محمد رفیع سودا نے اپنے زمانے کے سیاسی اور سماجی انتشار، اخلاقی بگاڑ، تہذیبی زوال، بے اعتدالی اور معاشرتی عدم توازن کو نہایت خوب صورتی سے اپنی ہجویہ شاعری میں پیش کیا۔ ان کی ہجو نہ صرف ان مسائل پر گہری تنقید تھی بلکہ ان میں اصلاح کا پہلو بھی نمایاں تھا۔

نظیر اکبرآبادی کی شاعری میں بھی طنز و مزاح کے عناصر کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ وہ عام انسانوں کی زندگی سے قریب رہتے ہوئے ان کے مسائل اور رویوں کو طنزیہ اور مزاحیہ انداز میں پیش کرتے ہیں جو قاری کے دل میں گہرائی سے اترتے ہیں۔ اسی طرح انشاء اللہ خان انشا نے بھی طنز و مزاح کے اسلوب کو اپنایا اور اپنی تحریروں میں ان کی شگفتگی اور گہرائی نمایاں طور پر محسوس کی جا سکتی ہے۔ انشا نے اپنی تخلیقات میں سماجی اور اخلاقی مسائل کو منفرد انداز میں اجاگر کیا۔

نظیرؔ اکبرآبادی کی شاعری میں ظرافت اور طنز کا ایک خاص مقام ہے جہاں انہوں نے اپنے اشعار میں طنز و نشتریت کے کاٹ دار وار بھی کیے ہیں۔ ان کی کئی نظموں میں ہمیں یہ رنگ واضح طور پر نظر آتا ہے خاص طور پر ''شہر آشوب'' میں جسے ایک بلند مقام حاصل ہے۔ یہ نظم آگرہ کی تباہی اور بربادی کی بھرپور عکاسی کرتی ہے جہاں ہر شخص مختلف مشکلات اور پریشانیوں کا شکار ہے۔ نظیرؔ نے اس نظم میں بڑی فنی مہارت سے آگرہ کے تمام طبقوں کی حالت زار کو پیش کیا ہے جیسے صراف، بنیا، جوہری، سیٹھ، ہنرمند، دست کار، سنار، دُکان دار، کوتوال، چوکیدار، ملاح اور دیگر لوگ جو پہلے اپنے کاروبار میں سرگرم تھے، اب ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں۔ جو لوگ کل تک دوسروں کو ادھار دیتے تھے، آج خود ادھار کے محتاج ہو گئے ہیں۔ یہاں تک کہ محبت کے پجاری، عاشق و معشوق بھی اپنی سابقہ اداؤں کو بھول چکے ہیں۔ اس نظم میں نظیرؔ نے آگرہ کی بربادی اور اس کے لوگوں کی پریشانیوں کی ایک ایسی تصویر کشی کی ہے جو نہ صرف گہرے دکھ کی عکاسی کرتی ہے بلکہ اس میں عبرت کا ایک پیغام بھی چھپا ہے۔ اسی طرح ''روٹیاں'' نظم میں نظیرؔ نے روٹی اور رزق کی اہمیت کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے۔ اس نظم میں وہ بتاتے ہیں کہ جب انسان کو پیٹ بھر کے روٹی مل جاتی ہے تو اس کی عادات اور رویے میں کس طرح تبدیلی آتی ہے۔ نظیرؔ کے مطابق، مفلسی انسان کو ذلیل و رسوا کر دیتی ہے اور جیسے ہی اسے رزق کی فراوانی ملتی ہے وہ خود کو بدلتے ہوئے محسوس کرتا ہے۔ وہ دیوانہ ہو جاتا ہے، اپنی اوقات بھول جاتا ہے اور ہر طرف خوشی کے آثار نظر آتے ہیں۔ اس کے رویے میں اُچھلنا، کودنا، ہنسنا اور قہقہے لگانا شروع ہو جاتے ہیں۔ نظیرؔ کی نظر میں جب تک انسان کو روٹی اور رزق کی فکر ہوتی ہے وہ مسلسل جدوجہد کرتا رہتا ہے لیکن جیسے ہی اس کی حالت بہتر ہو جاتی ہے وہ اپنی سچائی اور اصلیت بھول کر خوشی کا اظہار کرتا ہے۔ اس نظم میں نظیرؔ نے طنز و نشتریت کے ذریعے انسان کی فطری کمزوریوں اور اس کی بگڑتی ہوئی عادات پر چوٹ کی ہے جو ایک ہی وقت میں تفریحی اور فکر انگیز دونوں ہیں۔

جب آدمی کے پیٹ میں آتی ہیں روٹیاں — پھولی نہیں بدن میں سماتی ہیں روٹیاں
آنکھیں پری رُخوں سے لڑاتی ہیں روٹیاں — سینے اُپر بھی ہاتھ چلاتی ہیں روٹیاں
جتنے مزے ہیں، سب یہ دِکھاتی ہیں روٹیاں

روٹی سے جس کا ناک تلک پیٹ ہے بھرا — کرتا پھرے ہے کیا وہ اُچھل کود جا بہ جا
دیوار پھاند کر، کوئی کوٹھا اُچھل گیا — ٹھٹھا ہنسی، شراب صنم، ساقی، اِس سوا
سَو سَو طرح کی دھوم مچاتی ہیں روٹیاں

پوچھا کسی نے یہ، کسی کامل فقیر سے — ''یہ مہر و ماہ حق نے بنائے ہیں کاہے کے؟''
وہ سُن کے بولا، بابا! خدا تجھ کو خیر دے — ہم تو نہ چاند سمجھیں، نہ سورج ہیں جانتے
''بابا! ہمیں تو یہ نظر آتی ہیں روٹیاں''

نظیرؔ اکبرآبادی نے اپنی موضوعاتی نظموں میں نہ صرف موضوع کا باریک بینی سے انتخاب کیا بلکہ اس پر وسیع پیمانے پر روشنی ڈالی ہے۔ ان کی شاعری میں عوامی زندگی کے مختلف پہلوؤں کی عکاسی کی گئی ہے اور انہوں نے اپنی تخلیقات کے ذریعے عوام کے جذبات، مسائل اور ان کی روزمرہ کی زندگی کو نہایت کامیابی سے اجاگر کیا ہے۔ نظیرؔ نے اپنی شاعری کا مرکز عوام کو بنایا اور ان کی زندگی کی حقیقتوں کو اپنی تخلیقات کا حصّہ بنایا جس کے نتیجے میں وہ عوام کے دلوں میں ایک خاص مقام حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے۔ ان کی شاعری نے انہیں ایک حقیقی عوامی

شاعر کے طور پر تسلیم کرایا۔ ہندوستانی تہذیب وتمدن، یہاں کے رسم ورواج اور معاشرتی عناصر کا انہوں نے اپنی شاعری میں اس انداز سے استعمال کیا ہے کہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان کے کلام میں ہندوستانیت کی اصل روح اور دھڑکن موجود ہے۔ نظیر کے اشعار میں ہندوستانی زندگی کا جو رنگ اور جو حقیقت پسندی ملتی ہے وہ ایک گہرے، زندہ اور متحرک عکس کی طرح ابھرتی ہے۔ ان کے کلام میں ہندوستانی معاشرت کی گہرائی، یہاں کے ثقافتی پہلو اور لوگوں کے روزمرہ کے تجربات کی ایک جیتی جاگتی تصویر نظر آتی ہے۔ اس طرح نظیر نے اپنی شاعری میں ہندوستانی ثقافت اور عوام کی حقیقت کو اس مہارت سے پیش کیا ہے کہ ان کا کلام نہ صرف ادب کا قیمتی حصّہ ہے بلکہ ہندوستانی سماج کی بھرپور عکاسی بھی کرتا ہے۔

مرزا غالبؔ کی شاعری اور خطوط بھی طنز وظرافت کے شاندار نمونے پیش کرتے ہیں۔ غالبؔ نے نہ صرف دوسروں بلکہ خود اپنا بھی مذاق اڑایا جو ان کے فکری اور تخلیقی دائرہ کار کی وسعت کو ظاہر کرتا ہے۔ انہوں نے اپنی زندگی کے مصائب اور جبر محکومی کو ایک بلیغ طنز کے ساتھ بیان کیا جس سے ان کی تحریروں میں ایک گہری معنویت پیدا ہوئی۔ ان کے طنز کی چاشنی اور ظرافت کی گہرائی ان کے فن کی ایک منفرد پہچان ہے جو اُردو ادب میں ہمیشہ زندہ رہے گی۔

غالب کے بارے میں ایک دل چسپ بات یہ ہے کہ ان کے ابتدائی فارسی خطوط میں وہ طنز ومزاح کی چاشنی نظر نہیں آتی جو بعد میں ان کے اُردو مکتوبات کا ایک نمایاں جزو بن گئی۔ اس تبدیلی کی وجہ شاید یہ ہو سکتی ہے کہ جیسے جیسے غالبؔ کی عمر اور زندگی کے تجربات میں اضافہ ہوا ان کے خیالات اور سوچ میں بھی گہرائی اور گیرائی آتی گئی۔ زندگی کے تلخ اور پیچیدہ حقائق کا سامنا کرتے ہوئے غالبؔ کی شاعری اور ان کے مکتوبات میں ایک نیا زاویہ نظر آنا شروع ہوا۔ جوانی میں ان کی طبیعت میں جو لطافت اور شگفتگی تھی وہ بعد کے سالوں میں مشاہدات اور تجربات کی گہرائی کے ساتھ بدل گئی۔ غالبؔ کی زندگی کے بیشتر حصّے میں وہ مصائب اور مشکلات کا شکار رہے جن کا اثر ان کی تخلیقات پر بھی پڑا۔ ان کے لئے یہ مصائب ایک طرح سے زندگی کے تلخ حقائق بن گئے جن کا شعور انہوں نے اپنے اشعار اور مکتوبات میں شدّت سے محسوس کیا لیکن جوں جوں ان کی زندگی کے سال گزرے غالبؔ نے اپنے بہترین ہتھیار طنز ومزاح کو اختیار کیا۔ یہ طنز ومزاح نہ صرف ان کی شاعری اور مکتوبات کا ایک اہم پہلو بن گئے بلکہ انہوں نے ان کا استعمال اپنی ذہنی کش مکش اور زندگی کی تلخیوں سے نبرد آزما ہونے کے طریقے کے طور پر کیا۔ اس کے ذریعے غالبؔ نے نہ صرف اپنی دُکھ بھری زندگی کو سہل بنایا بلکہ وہ طنز ومزاح کی مدد سے اپنے گرد ونواح کے حالات پر گہری نظر بھی رکھتے تھے۔ اس طرح غالبؔ کا طنز ومزاح ان کی شاعری اور مکتوبات کی ایک اہم خصوصیت بن گیا جو ان کی زندگی کے سچے اور حقیقت پسندانہ عکاس کے طور پر سامنے آیا۔

غالب جب خطوط لکھتے ہیں تو وہ ہمیشہ اس بات کا خیال رکھتے ہیں کہ اپنی ذاتی مشکلات اور مصیبتوں کا ذکر کر کے دوسروں کو بے وجہ پریشانی میں نہ ڈالیں۔ ان کا انداز بیان اس قدر لطیف اور دل چسپ ہوتا ہے کہ وہ اپنے دُکھوں اور دُکھڑے کو بھی مزے لے لے کر بیان کرتے ہیں۔ اس میں ایک خاص طرح کی چہک اور ہنرمندی ہوتی ہے جو ان کے کرب کو ہلکا اور غیر سنجیدہ انداز میں پیش کرتی ہے۔ ایک مثال کے طور پر میر سرفراز حسین کو لکھے گئے اپنے خط میں غالبؔ اپنی تنہائی پر ماتم کرتے ہیں اور اس دوران اُن دوستوں کا ذکر کرتے ہیں جنہیں مختلف حالات وواقعات نے اُن سے جدا کر دیا لیکن غالبؔ کا انداز اس میں بھی منفرد ہوتا ہے۔ وہ باتوں کا رُخ اچانک بدل دیتے ہیں اور اس تبدیلی میں ایسا رنگ ہوتا ہے کہ پڑھنے والا ان کی گفتگو میں گہرائی اور ہنر کو ایک ساتھ محسوس کرتا ہے۔ ان کی تحریر میں وہ خصوصیت ہے کہ وہ کبھی بھی

اپنے دکھوں کو دوسرے پر بوجھ نہیں بناتے بلکہ اپنے کرب کو اس طرح پیش کرتے ہیں کہ وہ دوسروں کو متاثر کرنے کے بجائے ان کے ذہنوں میں ایک خوشگوار تاثر چھوڑ جاتے ہیں۔ان کی یہ خوبی ان کے خطوط کو نہ صرف دل چسپ بناتی ہے بلکہ ان کی شخصیت کی ایک گہری جھلک بھی پیش کرتی ہے جو دکھوں کے باوجود ہنر اور لطافت سے بھری ہوئی ہوتی ہے:

''اللہ، اللہ، اللہ ہزاروں کا میں ماتم دار ہوں، میں مروں گا تو مجھ کو کون روئے گا۔
سنو غالب! رونا پیٹنا کیا، کچھ اختلاط کی باتیں کرے''

(خطوطِ غالب میں طنز ومزاح، خلیق انجم، ص ۵۸۱)

غالبؔ اپنی زندگی کے چھوٹے چھوٹے مسائل کو حل کرنے کے لئے طنز ومزاح کا سہارا لیا کرتے تھے اور ان کا یہ انداز نہایت دل چسپ اور منفرد تھا۔ جب مرزا ہرگوپال تفتہ نے اپنا پہلا دیوان مرتب کیا تو غالبؔ نے نہایت محبت اور خلوص کے ساتھ اس کا دیباچہ تحریر کیا۔ غالب کے قلم سے نکلا ہوا یہ دیباچہ تفتہ کے دیوان کی خوب صورتی اور اہمیت میں اضافہ کا باعث بنا۔ تاہم جب تفتہ نے دوسرا دیوان مرتب کیا اور غالبؔ سے دوبارہ دیباچہ لکھنے کی گزارش کی تو غالبؔ نے نرمی اور محبت سے معذرت کر لی۔ اسی سلسلے میں منشی نبی بخش حقیر نے غالبؔ سے دیباچہ لکھنے کی درخواست کی تو غالبؔ نے اپنے مخصوص شگفتہ انداز میں ایک خط کے ذریعے جواب دیا۔ غالبؔ نے لکھا کہ :

''واللہ تفتہ کو میں اپنے فرزند کی جگہ سمجھتا ہوں اور مجھ کو یہ ناز ہے کہ خدا نے مجھ کو ایسا قابل فرزند عطا کیا ہے۔ رہا دیباچہ تم کو میری خبر ہی نہیں میں اپنی جان سے مرتا ہوں ۔

گیا ہو جب اپنا ہی جیوڑا نکل
کہاں کی رباعی، کہاں کی غزل

یقین ہے کہ وہ اور آپ میرا عذر قبول کریں اور مجھ کو معاف رکھیں۔ خدا نے مجھ پر روزہ نماز معاف کر دیا ہے کیا تم اور تفتہ ایک دیباچہ معاف نہ کرو گے۔''

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:۔

﴿۱﴾ طنز ومزاح کے اولین نقوش کہاں ملتے ہیں؟
﴿۲﴾ امیر خسروؔ کے کون سے انداز میں مزاح کے عناصر پائے جاتے ہیں؟
﴿۳﴾ امیر خسروؔ کے مزاح کا بنیادی طریقہ کیا تھا؟
﴿۴﴾ دکن کے کس شاعر کی تخلیقات میں طنز ومزاح کا رنگ نظر آتا ہے؟
﴿۵﴾ جعفر زٹلی کس صدی کے مشہور شاعر تھے؟
﴿۶﴾ جعفر زٹلی نے دہلی کی کس چیز کو پیش کیا؟
﴿۷﴾ جعفر زٹلی نے اپنی شاعری میں کن مسائل کو شامل کیا؟
﴿۸﴾ نظیرؔ کی کون سی نظم آگرہ کی تباہی کی عکاسی کرتی ہے؟

﴿۹﴾ نظیرؔ نے ''روٹیاں'' نظم میں کس چیز کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا؟

﴿۱۰﴾ نظیرؔ کے مطابق مفلسی انسان کو کیا کرتی ہے؟

﴿۱۱﴾ مرزا غالبؔ کی شاعری اور خطوط کی کیا خاصیت ہے؟

﴿۱۲﴾ غالب کا خطوط لکھنے کا انداز کیا تھا؟

09.04 اُردو طنز و مزاح کے فروغ میں 'اودھ اخبار'' کا حصّہ

''اودھ اخبار'' نے اُردو ادب میں طنز و مزاح کے فروغ میں ایک نمایاں اور مؤثر کردار ادا کیا۔ اُردو صحافت میں منشی نول کشور کا ''اودھ اخبار'' ایک نمایاں حیثیت رکھتا ہے اور اسے ایک تاریخی سنگِ میل کہا جاتا ہے۔ منشی نول کشور نے ابتدا میں اپنا اخبار ''سفیرِ آگرہ'' جاری کیا اور بعد ازاں لاہور کے معروف اخبار ''کوہِ نور'' میں کام کرتے ہوئے صحافت کے اصولوں اور باریکیوں کو سمجھا اور عملی تجربہ حاصل کیا۔ اس تربیت کے بعد انہوں نے لکھنؤ میں اپنا مطبع قائم کیا جو بعد میں اُردو طباعت و اشاعت کا ایک اہم مرکز بنا۔ 1858ء میں انہوں نے ''اودھ اخبار'' کے نام سے ایک باوقار اُردو اخبار کا آغاز کیا جو نہ صرف اپنے وقت کا ایک معیاری اور بااثر اخبار تھا بلکہ اُردو زبان و ادب کے فروغ کے ساتھ ساتھ گنگا جمنی تہذیب کے اشتراک کو بھی فروغ دینے میں نمایاں کردار ادا کر رہا تھا۔ اس اخبار نے اُردو صحافت میں ایک نئے رجحان کی بنیاد رکھی اور اس کے وسیع قارئین میں ہندوستان کے علاوہ انگلستان، فرانس اور دیگر مغربی ممالک کے افراد بھی شامل تھے جو اس اخبار کو شوق سے پڑھتے تھے۔ اس کی مقبولیت اور اثر و رسوخ کی وجہ سے یہ اخبار اپنے وقت کے دیگر اخبارات میں نمایاں حیثیت رکھتا تھا اور اُردو زبان کے فروغ میں اس کا کردار نہایت اہم تھا۔

''اودھ اخبار'' نے نثر اور نظم دونوں اصناف میں طنزیہ اور مزاحیہ تحریروں کو اہمیت دی جو سماجی اور تہذیبی مسائل پر روشنی ڈالنے کا ایک منفرد ذریعہ ثابت ہوا۔ اس اخبار میں پنڈت رتن ناتھ سرشار کا مشہور ناول ''فسانہ آزاد'' قسط وار شائع ہوا جو اُردو ادب کی تاریخ میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ ناول اپنی دل چسپ کہانی اور مزاحیہ اسلوب کے باعث قارئین میں بے حد مقبول ہوا۔ اس کے ساتھ ہی اس ناول کا ایک یادگار اور دل چسپ کردار ''خوجی'' طنز و مزاح کی نمائندگی کرتا ہے۔ خوجی کا کردار اپنے مزاحیہ انداز اور مخصوص زبان و بیان کے ذریعے قارئین کو محظوظ کرتا رہا اور آج بھی اُردو ادب میں مزاحیہ کرداروں کی فہرست میں ایک منفرد مقام رکھتا ہے۔ رتن ناتھ سرشارؔ کے یہاں اگرچہ طنز کا عنصر بہت زیادہ نہیں پایا جاتا لیکن جب وہ لکھنؤ کی زوال پذیر معاشرت سے وابستہ مختلف طبقات کے طرزِ عمل اور رجحانات کو اپنے انداز میں بیان کرتے ہیں تو ان کی تحریروں میں طنز کی نشتریت نمایاں طور پر محسوس کی جا سکتی ہے۔ ان کے قلم نے لکھنؤ کے شہریوں کی اوہام پرستی اور مذہبی رسومات میں ان کے حد سے زیادہ استغراق کو بے نقاب کیا ہے۔ اسی طرح معلّمین کی علمی جہالت اور نااہلی، مولویوں اور پیروں کی بداعمالیوں، شاعروں، وکیلوں اور بانکوں کے نظریات اور طرزِ عمل اور چاندو اور افیون جیسی مہلک عادتوں میں مبتلا معاشرتی برائیوں پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ رتن ناتھ سرشار نے نوّابوں اور نوّاب زادوں کی مکروہ عادات اور بے عملی کو جس مہارت سے پیش کیا ہے وہ بھی ان کے طنزیہ انداز کو عیاں کرتا ہے۔ گو کہ ان کی تحریریں ظاہری طور پر طنزیہ رنگ میں ڈوبی ہوئی نہیں ہوتیں لیکن ان میں چھپا ہوا طنز اس دور کی سماجی برائیوں اور خرابیوں کو آئینہ دکھانے کے لئے کافی ہے :

''میاں آزاد کیا دیکھتے ہیں کہ ایک مجسّم شامت، پستہ قامت، کوتاہ گردن، تنگ پیشانی، شرارت اور خباثت کی نشانی کھڑا دور ہی سے جھولوں پر نگاہِ بد ڈال رہا ہے۔ جب اُنہوں نے کئی بار یہ کیفیت دیکھی تو اُن سے رہا نہ گیا۔ آؤ دیکھا نہ تاؤ ایک چپت زنّاٹے سے جما ہی تو دی۔ ٹیپ کھاتے ہی وہ جھلّا اُٹھا اور گالیاں دے کر کہنے لگا کہ نہ ہوئی ولایتی اس وقت پاس ورنہ بھُٹّا سا سر اُڑا دیتا۔''

رتن ناتھ سرشار کے مشہور ناول ''فسانۂ آزاد'' کے دو اہم مزاحیہ کردار ''آزاد'' اور ''خوجی'' اپنے عہد کی دو مختلف اور متضاد تہذیبی اور معاشرتی رویوں کا بہترین عکاس ہیں۔ سرشار نے ان دونوں کرداروں کے ذریعے لکھنؤ کی زوال پذیر اور ملمّع زدہ تہذیب کو نہایت گہری بصیرت کے ساتھ طنز کا نشانہ بنایا ہے۔ آزاد اور خوجی کے کردار اس پرانی تہذیب کی نمائندگی کرتے ہیں جو بظاہر شان دار اور پر رونق نظر آتی ہے لیکن اندر سے کھوکھلی اور فرسودہ ہو چکی ہے۔ ایک طرف سرشار نے خوجی جیسے کردار کے ذریعے قدیم رسم و رواج اور دقیانوسی خیالات کی تصویر کشی کی، جو اپنی مضحکہ خیز حرکتوں اور دقیانوس طرزِ فکر کے سبب پرانی تہذیب کی کمزوریوں کو واضح کرتا ہے۔ دوسری طرف آزاد کے کردار میں اُس نئے سماجی شعور کی نمائندگی کی گئی ہے جو اُس وقت اپنی جڑیں پکڑ رہا تھا۔ یہ شعور ایک آزاد خیالی اور جدت پر مبنی تھا لیکن اس کا اظہار اکثر بے ڈھنگے اور غیر موزوں طریقوں سے ہوتا تھا۔ سرشار نے ان دونوں کرداروں کی مدد سے اُس دور کے سماجی حالات اور تبدیلیوں کا بھرپور تجزیہ پیش کیا ہے۔ وہ نہ صرف پرانی تہذیب کی فرسودگی اور زوال کو طنز کا نشانہ بناتے ہیں بلکہ اُس نئی ابھرتی ہوئی سماجی فکر کے تضادات کو بھی بے باکی سے نمایاں کرتے ہیں جو بظاہر ترقی پسند لگتی تھی لیکن اپنے ساتھ کئی مسائل اور ناہمواریاں لے کر آ رہی تھی۔ ان کرداروں کے ذریعے سرشار نے لکھنؤ کی تہذیبی اور سماجی دنیا کے تضادات اور کش مکش کو نہایت باریکی اور خوب صورتی کے ساتھ پیش کیا ہے :

''خوجی جب سے اوجھل ہوئے تو میاں آزاد چپکے سے آدھا دودھ کھا گئے اور کٹورا لبالب کرنے کے لئے حوض سے پانی لے کر بھر دیا۔ اتّفاق سے ایک چھوٹی سی مچھلی بھی پانی کے ساتھ کٹورے میں آ رہی.....اس پر میاں آزاد نے کہا: ارے! کھا جا یہ شیرِ ماہی ہے۔ تب تو میاں افیمچی نہایت ہی افسوس کرنے لگے۔ ہائے ہائے سونے کی چڑیا ہاتھ سے نکل گئی۔ مجھے کیا معلوم تھا یہ شیرِ ماہی ہے ورنہ کچّا ہی چبا جاتا۔ اس قسم کی مچھلی کی ایک خاصیت یہ ہے کہ اسّی برس کا بڈّھا کھائے تو جوان ہو جائے۔ نئے سرے سے دانت نکل آئیں۔''

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:۔

﴿۱۳﴾ ''اودھ اخبار'' کس نے جاری کیا؟

﴿۱۴﴾ ''اودھ اخبار'' کا آغاز کب ہوا؟

﴿۱۵﴾ ''اودھ اخبار'' نے اردو ادب میں کیا کردار ادا کیا؟

﴿۱۶﴾ رتن ناتھ سرشار کا مشہور ناول کون سا ہے؟

﴿۱۷﴾ فسانہ آزاد کے دو مشہور کردار کون سے ہیں؟

﴿۱۸﴾ خوجی کا کردار کیا ظاہر کرتا ہے؟

﴿۱۹﴾ آزاد کا کردار کس کی نمائندگی کرتا ہے؟

﴿۲۰﴾ رتن ناتھ سرشار کے طنز کا موضوع کیا تھا؟

﴿۲۱﴾ رتن ناتھ سرشار کے طنز یہ انداز کی خاصیت کیا تھی؟

﴿۲۲﴾ ''اودھ اخبار'' کا کون سا ناول اردو ادب کا سنگ میل ہے؟

﴿۲۳﴾ رتن ناتھ سرشار نے کن مسائل پر روشنی ڈالی؟

﴿۲۴﴾ آزاد اور خوجی کے کرداروں میں کیا تضاد ہے؟

09.05 اُردو طنز و مزاح کے فروغ میں ''اودھ پنچ'' کا حصّہ

طنز و مزاح نگار سماج کے ان پہلوؤں پر گہری نظر رکھتا ہے جہاں بے راہ روی، انسانی کج روی اور تضادات نمایاں ہوتے ہیں۔ وہ اپنی تحریر کے ذریعے ان مسائل کو اجاگر کرتا ہے اور اپنے قلم کو نشتر کی طرح استعمال کرتے ہوئے ان برائیوں پر ضرب لگاتا ہے۔ اس کا مقصد نہ صرف ان مسائل کی نشان دہی کرنا ہوتا ہے بلکہ اعلیٰ انسانی اقدار کو ادب کے ذریعے پیش کرنا بھی ہوتا ہے۔ وہ اپنی تحریروں کے ذریعے ان لوگوں کی زندگی میں امید اور روشنی کی کرن پیدا کرتا ہے جو مایوسی اور افسردگی کے اندھیروں میں گھرے ہوئے ہوں۔ اس کی تحریر بعض اوقات اتنی گہری چوٹ کرتی ہے کہ قاری کو اپنی زندگی کے تضادات اور خامیوں کا احساس ہو جاتا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی یہ چوٹ قاری کو سوچنے اور اپنی حالت پر غور کرنے پر مجبور کرتی ہے۔ دل چسپ بات یہ ہے کہ مزاح کے پہلو کی بدولت قاری نہ صرف ان مسائل کو سمجھتا ہے بلکہ غیر ارادی طور پر اپنی کمزوریوں پر ہنسنے لگتا ہے۔ اس طرح طنز و مزاح نگار کی تحریریں نہ صرف اصلاح کا ذریعہ بنتی ہیں بلکہ قاری کے دل کو ہلکا کرنے اور اس میں تبدیلی لانے کا مؤثر ذریعہ بھی ثابت ہوتی ہیں۔

رسالہ ''اودھ پنچ'' اُردو زبان کا ایک معروف مزاحیہ ہفت روزہ تھا، جو ''لندن پنچ'' کی طرز پر ترتیب دیا گیا تھا۔ اس رسالے کی بنیاد منشی سجاد حسین نے 16 رجنوری 1877 کو لکھنؤ میں رکھی جو اس وقت ہندوستانی صحافت میں طنز و مزاح کے فروغ کا ایک اہم قدم تھا۔ ''اودھ پنچ'' اپنی نوعیت کا منفرد رسالہ تھا جو سیاست اور سماجی مسائل کو ظرافت اور مزاح کے رنگ میں پیش کرتا تھا جس سے نہ صرف قاری محظوظ ہوتا بلکہ ان مسائل پر غور و فکر کرنے کی ترغیب بھی پاتا۔ اس رسالے کی ایک اہم خصوصیت یہ تھی کہ اس میں ممتاز قلم کاروں اور ادیبوں کا تعاون حاصل تھا جنھوں نے اپنی تحریروں کے ذریعے طنز و مزاح کو ایک نئی جہت دی۔

مرزا محمد مرتضیٰ جو مچھو بیگ عاشق کے نام سے مشہور تھے اور اپنا قلمی نام ''ستم ظریف'' رکھتے تھے، اس رسالے میں 33 سال تک مزاحیہ مضامین تحریر کرتے رہے۔ ان کے ساتھ میں نواب سید محمد آزاد، اکبر الہ آبادی، پنڈت تربھون ناتھ، منشی جوالا پرشاد برق، منشی احمد علی شوق اور منشی احمد علی کسمنڈوی بھی رسالے سے وابستہ رہے اور اپنی تحریروں سے اس کے معیار کو بلند کیا۔ اخبار ''اودھ پنچ'' کی تحریریں اُردو ادب میں طنز و مزاح کی ایک نمایاں مثال ہیں جہاں ان موضوعات کو باقاعدگی اور تسلسل کے ساتھ پیش کیا گیا جنھوں نے اس وقت کے سماج اور تہذیب کو متاثر کیا تھا۔ ان تحریروں کے لکھنے والوں نے مغرب پرستی، فیشن پسندی، سامراجی نظام، تہذیبی و اخلاقی زوال، سیاسی بے ترتیبی اور معاشرتی کج روی جیسے مسائل کو اپنے طنزیہ و مزاحیہ اسلوب کے ذریعے نہایت مہارت کے ساتھ اجاگر کیا۔ یہ ادیب اور قلم کار سماجی اور تہذیبی برائیوں کے خلاف کھل کر لکھتے تھے۔ انہوں نے ان موضوعات پر تنقید کی جو اس وقت کے معاشرتی رویوں میں جڑ پکڑ رہے تھے جیسے تصنع اور

بناوٹ اور ان پر گہری چوٹ کی۔ ان کا مقصد نہ صرف ان مسائل کی نشان دہی کرنا تھا بلکہ مغربی تہذیب کی اندھی تقلید کے خلاف مزاحمت کرنا بھی تھا۔ ان تحریروں میں ایک واضح پیغام پایا جاتا ہے جو قارئین کو ان مسائل پر غور و فکر کرنے اور بہتر معاشرتی اقدار اپنانے کی ترغیب دیتا ہے۔

''اودھ پنچ'' کی ادارت اور تحریریں نہ صرف ادب کے میدان میں بلند مقام رکھتی تھیں بلکہ یہ رسالہ سماجی اور سیاسی اصلاح کا علمبردار بھی تھا۔ یہ ہندو مسلم اتحاد کے فروغ اور انڈین نیشنل کانگریس کی حمایت میں پیش پیش تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ مغربی تہذیب کے اثرات کے خلاف ایک مضبوط آواز بن کر اُبھرا اور مشرقی روایات و اقدار کی حفاظت کا عزم لیے ہوئے تھا۔ اپنی ان خصوصیات کی وجہ سے ''اودھ پنچ'' نہ صرف اپنے دور میں مقبولیت کی بلندیوں پر پہنچا بلکہ اُردو صحافت اور طنز و مزاح کی روایت میں ہمیشہ کے لئے ایک نمایاں مقام حاصل کر گیا۔

''اودھ پنچ'' اخبار کے ادیبوں نے اپنی تخلیقات میں طنز و مزاح کے ذریعے نہ صرف اپنے عہد کی پیچیدگیوں اور تضادات کو بے نقاب کیا بلکہ اپنی تحریروں کے ذریعے ایک فکری تحریک پیدا کی۔ ان کی تخلیقات میں نہ صرف شگفتگی اور مزاح کی چاشنی تھی بلکہ ایک گہرا فکری اور اصلاحی پیغام بھی موجود تھا۔ یہ تحریریں آج بھی ادب کے قارئین کو متاثر کرتی ہیں اور طنز و مزاح کی روایت میں ایک سنہری باب کی حیثیت رکھتی ہیں۔

اودھ پنچ رسالہ اپنی اشاعت کے دوران مزاحیہ کارٹونوں اور نظموں کی کثرت کے لئے مشہور تھا۔ یہ رسالہ نہ صرف طنز و مزاح کا ترجمان تھا بلکہ قارئین کے لئے تفریح اور اصلاح کا ایک بہترین ذریعہ بھی تھا۔ اودھ پنچ نے مسلسل چھتیس برسوں تک اپنی اشاعت کا سلسلہ جاری رکھا لیکن بدقسمتی سے یہ رسالہ 19 ردسمبر 1912 کو منشی سجاد حسین کی زندگی ہی میں بند ہو گیا۔ اس وقت یہ اُردو صحافت کے لئے ایک بڑا نقصان تصور کیا گیا۔ دو سال بعد 1914 میں حکیم ممتاز حسین عثمانی نے اودھ پنچ کو دوبارہ جاری کرنے کی کوشش کی۔ اگرچہ یہ رسالہ دوبارہ اپنی پرانی مقبولیت اور معیار تک نہیں پہنچ سکا لیکن حکیم ممتاز حسین کی انتھک محنت اور کوششوں کی بدولت یہ کسی نہ کسی طرح چلتا رہا۔ ان کی محنت نے رسالے کو کچھ عرصے کے لئے زندہ رکھا اور انہوں نے اس کی اشاعت کو جاری رکھنے میں اہم کردار ادا کیا۔ حکیم ممتاز حسین عثمانی کے انتقال کے بعد 1933 میں ان کے صاحب زادے نے اس رسالے کی اشاعت کی ذمہ داری سنبھالی۔ انہوں نے اپنے والد کے کام کو آگے بڑھانے کی بھرپور کوشش کی لیکن بدقسمتی سے وہ خود بھی عین جوانی میں انتقال کر گئے۔ ان کے انتقال کے بعد ''اودھ پنچ'' کی اشاعت کا سلسلہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو گیا۔ اس کے باوجود ''اودھ پنچ'' کی ادبی اور صحافتی خدمات کو آج بھی یاد کیا جاتا ہے اور یہ رسالہ اُردو صحافت اور طنز و مزاح کی تاریخ میں ایک اہم مقام رکھتا ہے۔

''اودھ پنچ'' کے ابتدائی دور کو اُردو ادب میں طنز و مزاح کی لطافت اور شائستگی کا ایک سنہرا عہد قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس دور میں رسالے کے ذریعے پیش کیے جانے والے طنزیہ و مزاحیہ مضامین نہایت مہذّب اور شائستہ انداز میں لکھے جاتے تھے جن میں اصلاحی پہلو نمایاں تھا۔ تاہم جیسے جیسے وقت گزرتا گیا، اس میں کچھ ایسے عناصر شامل ہونے لگے جو اس کے معیار کو متاثر کرنے لگے۔ بعد کے ادوار میں رسالے کی تحریروں میں رکاکت، ابتذال، ذاتیات پر حملے اور طنز کی بجائے پھبتیاں کسنے جیسے رویے بھی جگہ پانے لگے۔ یہ تبدیلی شاید اس وقت کے سماجی، سیاسی اور ادبی حالات کی دین تھی جو رسالے کے اسلوب پر اثر انداز ہوئے۔

ڈاکٹر خورشید الاسلام کے مطابق ۔

''بحیثیتِ مجموعی اودھ پنچ کی ظرافت میں گہرائی اور گیرائی کی کمی ہے لیکن اس میں زمانے کی پابندیوں اور مجبوریوں کو ذہن سے محو نہیں کر دینا چاہیے، اودھ پنچ کی ظرافت ثقیل ہے مگر نمک سے خالی نہیں، کہیں کہیں عریاں ہے مگر پھر بھی ناگوار نہیں ہوتی، الفاظ کی بازی گری ہے مگر اس میں فطری روانی بھی ہے، وہ قہقہوں سے فروغ پاتی ہے مگر بدسلیقہ نہیں۔''

یہ بات خاص طور پر قابلِ توجہ ہے کہ ''اودھ پنچ'' اپنی ابتدا سے لے کر اختتام تک ایک ہی طرز پر شائع ہوتا رہا۔ اس رسالے کا سرورق نہایت منفرد اور پہچان کا حامل تھا جس پر ایک پیچیدہ اسکیچ کی تصویر ہوا کرتی تھی۔ اس تصویر میں رسالے کا نام، جلد اور شمارہ نمبر، ناشر کی معلومات اور قیمت جیسے بنیادی عناصر شامل ہوتے تھے۔ اندرونی صفحات پر ''اودھ پنچ'' کے مینیجر کی جانب سے اشاعت اور خریداری کے حوالے سے ہدایات اور گزارشات موجود ہوتیں۔ ان ہدایات کا لب لباب عموماً پیشگی ادائیگی کی درخواست پر مبنی ہوتا تھا، ساتھ ہی یہ وضاحت کی جاتی تھی کہ رقم وی پی کے ذریعے نہ بھیجی جائے اور نہ ہی رسالے کے نمونے مفت فراہم کیے جائیں۔ مزید برآں، طالب علموں کے لئے خصوصی رعایتیں دی جاتی تھیں اور قاریوں سے اپیل کی جاتی تھی کہ وہ زیادہ سے زیادہ خریدار بننے کی ترغیب دیں۔ رسالے کے مواد کے حوالے سے اگلے دس صفحات پر مضامین، خبریں، تبصرے اور دیگر دل چسپ موضوعات شامل کیے جاتے تھے۔ چوں کہ رسالے کا حجم مختصر ہوتا تھا، اس لئے کسی فہرستِ مضامین کی ضرورت محسوس نہیں کی جاتی تھی۔ تاہم ایک دل چسپ اور قابلِ غور پہلو یہ ہے کہ اس رسالے میں مدیر یا دیگر ادارتی ذمہ داریاں نبھانے والے افراد کے نام شاذ و نادر ہی شائع کیے جاتے تھے جس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ اس وقت صحافتی طرزِ عمل میں گم نامی کو اہمیت دی جاتی تھی یا شاید ادارتی ٹیم کا زور مواد کی نوعیت اور معیار پر ہوتا تھا نہ کہ ذاتی تشہیر پر۔ یہ مستقل طرزِ اشاعت اور اس کی منفرد ترتیب ''اودھ پنچ'' کی ایک خاص پہچان تھی جس نے اسے نہ صرف اپنے وقت میں ایک مقبول اور معتبر رسالہ بنایا بلکہ اُردو صحافت کی تاریخ میں بھی ایک یادگار مقام دلایا۔

''اودھ پنچ'' اپنی نوعیت کے لحاظ سے ایک منفرد طنزیہ و مزاحیہ رسالہ تھا جس نے اپنے قارئین کو نہ صرف تفریح فراہم کی بلکہ مختلف موضوعات پر بے لاگ تبصرے بھی کیے۔ اس رسالے میں تحریریں لکھنے والے ادیب اکثر اپنے اصل نام کے بجائے مضحکہ خیز اور فرضی نام استعمال کرتے تھے، جس کی وجہ سے کئی اہم قلم کار گم نامی کے پردے میں چھپے رہ گئے۔ ان فرضی ناموں کا استعمال مزاح اور طنز کی چاشنی کو مزید دل چسپ بنانے کا ایک ذریعہ تھا لیکن اس نے متعدد ادیبوں کی حقیقی شناخت کو تاریخ کے دھندلکوں میں چھپا دیا۔ ''اودھ پنچ'' کی تحریروں کا ایک خاص پہلو سرسید احمد خاں اور ان کی اصلاحی تحریک کے خلاف سخت مخالفت تھا۔ یہ رسالہ سرسید کے نظریات اور ان کے پیش کردہ اصلاحی اقدامات کے خلاف مسلسل تنقیدی مہم چلاتا رہا۔ سرسید کے خیالات اور ان کی تعلیمی و سماجی تحریک جو مسلمانوں کے لئے جدید تعلیم اور ترقی کی راہ ہموار کرنے کے لئے تھی ''اودھ پنچ'' کے قلم کاروں کے لئے مسلسل اضطراب کا باعث بنی رہی۔ اس مخالفت کا اظہار نہ صرف نثری تحریروں بلکہ نظموں کی صورت میں بھی کھل کر کیا گیا۔ ''اودھ پنچ'' کے مضامین سے واضح ہوتا ہے کہ سرسید اور ان کی تحریک کے خلاف لکھنا اور تنقید کرنا اس رسالے کا ایک اہم مقصد تھا۔ ان تحریروں میں سرسید کے ساتھیوں کو بھی شدید تنقید کا نشانہ بنایا گیا اور ان پر کیے گئے حملے نہایت سخت اور ذاتی نوعیت کے تھے۔ اکثر اوقات یہ حملے تہذیب اور شائستگی کی حدود کو پار کر جاتے اور توہین کے دائرے میں داخل ہو جاتے۔ اس انداز سے یہ

ظاہر ہوتا ہے کہ ''اودھ پنچ'' کی مخالفت صرف نظریاتی اختلاف تک محدود نہیں تھی بلکہ یہ ایک باقاعدہ تنقیدی مہم کا حصّہ تھی جس کا مقصد سرسید اور ان کی تحریک کی ساکھ کو نقصان پہنچانا تھا۔ یہ رویہ ''اودھ پنچ'' کی تحریری پالیسی اور مزاحیہ اسلوب کا ایک متنازعہ پہلو رہا جو اس وقت کے سماجی اور سیاسی تناظر میں ایک اہم کردار ادا کرتا رہا۔ باوجود اس کے کہ یہ رسالہ طنز و مزاح کے لئے مشہور تھا اس کی تحریروں میں بعض اوقات ایسی تلخی شامل ہوتی تھی جو اس کے قارئین کے لئے کسی حد تک غیر متوازن محسوس ہو سکتی تھی۔ اس کے باوجود ''اودھ پنچ'' اُردو ادب اور صحافت کی تاریخ میں اپنی اہمیت برقرار رکھتا ہے کیوں کہ اس نے ایک ایسے دَور کے خیالات اور نظریات کی عکاسی کی جو انقلابی تبدیلیوں سے گزر رہا تھا۔

''اودھ پنچ'' کے نمایاں طناز شعرا میں اکبرالہٰ آبادی کا نام سرِ فہرست آتا ہے۔ اکبرالہٰ آبادی اپنے منفرد اسلوب، تیکھے طنز اور شائستہ مزاح کے ذریعے ''اودھ پنچ'' کے سب سے مؤثر اور جان دار قلمکاروں میں شمار ہوتے تھے۔ وہ سرسید احمد خاں اور ان کے نظریات پر تلخ و ترش ظریفانہ حملے کرنے میں سب سے آگے رہے۔ ان کی شاعری میں سرسید کی اصلاحی تحریک اور جدید تعلیم کے حوالے سے ایسی شدید تنقید پائی جاتی ہے جو ان کے مزاج کی گہرائی اور ''اودھ پنچ'' کی ادبی حکمت عملی کو واضح کرتی ہے۔ اکبرالہٰ آبادی نے نہ صرف سرسید کی شخصیت بلکہ ان کے مشن اور ان کے حامیوں کو بھی اپنے طنز کا موضوع بنایا جو اس زمانے میں ایک اہم ادبی روایت بن گئی تھی۔ اس کے علاوہ ''اودھ پنچ'' کے موضوعات میں ایک خاص رجحان انگریزی تعلیم، تہذیب اور تمدن کا مذاق اڑانے کا تھا۔ مغربی ثقافت کو نشانہ بناتے ہوئے ''اودھ پنچ'' کے قلم کار انگریزی تہذیب کے مختلف پہلوؤں پر طنزیہ تبصرے کرتے اور اسے مشرقی اقدار و روایات کے لئے نقصان دہ قرار دیتے۔ ان کے مضامین اور نظموں میں انگریزی طرزِ زندگی، مغربی لباس، فیشن اور طرزِ معاشرت کو مضحکہ خیز انداز میں پیش کیا جاتا تھا۔ اس کے برعکس، مشرقی تہذیب و تمدن اور روایتی اقدار کی حمایت میں ان کے خیالات نہایت مضبوط اور مستقل تھے۔ یہ رجحان ''اودھ پنچ'' کی تحریروں کا ایک اہم حصّہ تھا جو اس رسالے کی مشرقی روایات کی پاسداری اور مغربی اثرات کے خلاف سخت مؤقف کو ظاہر کرتا تھا۔ اس کے قلمکاروں نے بارہا مشرقی ثقافت کی برتری کو اجاگر کرنے کی کوشش کی اور مغربی تہذیب کے ان اثرات کو تنقید کا نشانہ بنایا جنہیں وہ اپنی ثقافتی اور اخلاقی اقدار کے لئے خطرہ سمجھتے تھے۔ اکبرالہٰ آبادی اور دیگر مصنفین نے اپنی تخلیقات کے ذریعے قارئین کو یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ مشرقی روایات اور اقدار ہی اصل تہذیبی بنیاد ہیں جنہیں اپنانے اور محفوظ رکھنے کی ضرورت ہے۔ ان موضوعات پر ''اودھ پنچ'' کی تحریریں نہ صرف اس وقت کے سماجی مسائل کی عکاسی کرتی ہیں بلکہ ان میں مشرق اور مغرب کے مابین تہذیبی تصادم کی جھلک بھی نمایاں ہے۔ ان مضامین اور شاعری نے ''اودھ پنچ'' کو ایک ایسا رسالہ بنا دیا جو اپنے وقت کی ذہنی اور سماجی کش مکش کو نمایاں کرنے کے ساتھ ساتھ قارئین کو تنقیدی نظر سے دنیا کو دیکھنے کی دعوت دیتا تھا۔

جب اردو ادب کے قارئین اکبرالہٰ آبادی کی ظرافت سے بھرپور شاعری کا مطالعہ کرتے ہیں تو وہ نہ صرف خوشگوار لمحوں سے لطف اندوز ہوتے ہیں بلکہ ان کے اشعار قاری کو مسکرانے اور ہنسنے پر بھی مجبور کر دیتے ہیں۔ اکبر کی شاعری میں مزاح کی جو چاشنی اور شگفتگی ہے وہ ایک منفرد انداز میں قاری کے دل کو گدگداتی ہے۔ ان کے اشعار میں روزمرہ زندگی کے مسائل، سماجی تضادات اور انسانی کمزوریوں پر اس قدر دلچسپ اور دل کش انداز میں طنز کیا گیا ہے کہ قاری خود کو ان اشعار کے آئینے میں دیکھنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے اشعار کا مطالعہ کرتے ہوئے قارئین کبھی تو بے ساختہ قہقہے لگاتے ہیں اور کبھی دھیمے لہجے میں مسکرا دیتے ہیں لیکن اکبرالہٰ آبادی کی شاعری کا حقیقی کمال یہ ہے کہ یہ صرف ظرافت اور مزاح تک محدود نہیں رہتی بلکہ قارئین کو سوچنے اور غور کرنے پر بھی مائل کرتی ہے۔ ان کے اشعار کے پیچھے چھپے طنز کے نشتر قاری کو اپنی کمزوریوں اور معاشرتی رویوں کا محاسبہ کرنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ یہ محاسبہ کبھی کبھی قاری کے دل میں شرمندگی کا احساس

بھی پیدا کر دیتا ہے کیوں کہ وہ دیکھتا ہے کہ ان اشعار میں بیان کی گئی حقیقتیں اس کی اپنی زندگی یا معاشرتی رویوں سے کس قدر قریب ہیں۔ اکبر الہ آبادی کی شاعری نہ صرف مزاح کے ذریعے تفریح فراہم کرتی ہے بلکہ اپنی گہرائی اور فکری پہلو کے ذریعے قاری کو ایک نئی بصیرت سے بھی روشناس کراتی ہے۔ ان کے اشعار ایک ایسا آئینہ ہیں جس میں قاری اپنی اور اپنے معاشرے کی تصویر دیکھتا ہے اور یہ تصویر کبھی ہنسنے، کبھی سوچنے اور کبھی شرمندہ ہونے کا سبب بن جاتی ہے۔ یہی خصوصیت اکبر الہ آبادی کو اُردو ادب کے مزاحیہ شعرا میں ایک منفرد اور بلند مقام عطا کرتی ہے۔

اکبر الہ آبادی نے اپنی شاعری کے ذریعے معاشرتی اصلاح کا وہ اہم کام سرانجام دیا جو عام طور پر سرسید احمد خان اور علامہ اقبال جیسی بلند پایہ شخصیات کے لئے مخصوص سمجھا جاتا تھا۔ انہوں نے اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے شاعری کو محض تفریح یا اظہارِ جذبات تک محدود نہیں رکھا بلکہ اسے سماجی برائیوں کے خاتمے اور عوامی شعور کی بیداری کے لئے استعمال کیا۔ اکبر نے سماج میں پائی جانے والی کمزوریوں، مغربی تہذیب کے اندھے تقلیدی رجحانات اور لادینیت جیسے مسائل کو اپنے طنزیہ اور مزاحیہ انداز کے ذریعے ہدفِ تنقید بنایا۔ اکبر کی شاعری کا سب سے بڑا کمال یہ تھا کہ وہ سماجی برائیوں پر براہِ راست تنقید کرنے کے بجائے انہیں ظرافت کے قالب میں پیش کرتے تھے۔ ان کا اندازِ بیان ایسا نرم، دل کش اور شائستہ تھا کہ ان کی تنقید سننے یا پڑھنے والے افراد کی انا کو ٹھیس نہیں پہنچتی تھی۔ وہ اپنی بات کو اس انداز سے پیش کرتے کہ مخاطب اپنی کمزوریوں کو تسلیم کرنے اور خود احتسابی کرنے پر مجبور ہو جاتا تھا۔ ان کی شاعری میں طنز و مزاح کے امتزاج نے ایک ایسا اثر پیدا کیا جو اصلاحِ معاشرہ کے لئے نہایت مؤثر ثابت ہوا۔ اکبر الہ آبادی کی یہ طرزِ شاعری ان کے فکری وژن اور تخلیقی ہنر کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ انہوں نے اپنے اشعار کے ذریعے نہ صرف سماجی برائیوں کی نشان دہی کی بلکہ اس انداز سے لوگوں کو اپنی خامیوں کا شعور دلایا کہ وہ خفا ہونے کے بجائے ان مسائل کے بارے میں سوچنے پر آمادہ ہو جاتے تھے۔ ان کی یہ خصوصیت ان کی شاعری کو اصلاحی ادب کے میدان میں ایک نمایاں مقام عطا کرتی ہے اور ان کی تخلیقات کو نہ صرف ان کے عہد بلکہ آنے والے زمانوں کے لئے بھی قابلِ تقلید مثال بنا دیتی ہے۔

کھینچو نہ کمانوں کو نہ تلوار نکالو — جب توپ مقابل ہو تو اخبار نکالو

ہم ایسی کل کتابیں قابلِ ضبطی سمجھتے ہیں — کہ جن کو پڑھ کے لڑکے باپ کو خبطی سمجھتے ہیں

قوم کے غم میں ڈنر کھاتے ہیں حکام کے ساتھ — رنج لیڈر کو بہت ہے مگر آرام کے ساتھ

خدا کے فضل سے بیوی میاں دونوں مہذب ہیں — حجاب اُن کو نہیں آتا، اِنہیں غصہ نہیں آتا

ہم آہ بھی کرتے ہیں تو ہو جاتے ہیں بدنام — وہ قتل بھی کرتے ہیں تو چرچا نہیں ہوتا

کر دیا کرزن نے زن مردوں کی صورت دیکھیے — آبرو چہرے کی سب فیشن بنا کر چھین لی

بتائیں آپ کو مرنے کے بعد کیا ہوگا — پلاؤ کھائیں گے احباب، فاتحہ ہوگا

حامدہ چمکی نہ تھی انگلش سے جب بے گانہ تھی — اب ہے شمعِ انجمن پہلے چراغِ خانہ تھی

ہوئے اس قدر مہذب کبھی گھر کا منہ نہ دیکھا — کٹی عمر ہوٹلوں میں مَرے اسپتال جا کر

بے پردہ کل جو آئیں نظر چند بی بیاں — اکبر زمیں میں غیرتِ قومی سے گڑ گیا

پوچھا جو اُن سے آپ کا پردہ وہ کیا ہوا؟ — کہنے لگیں کہ عقل پہ مَردوں کی پڑ گیا

اکبرالہٰ آبادی نے طنز و مزاح کی روایت کو ایک نئی جہت بخشی اور اسے فکری گہرائی اور تہذیبی شعور سے ہم آہنگ کیا۔ ان کی تحریریں مشرقی اقدار اور روایات کے تحفظ اور ان کی اہمیت کو اُجاگر کرنے پر مرکوز تھیں۔ وہ مغربی تہذیب کی اندھی تقلید کو ناپسند کرتے تھے اور اس کے منفی اثرات کو طنزیہ انداز میں پیش کرنے کے ماہر تھے۔ ان کی شاعری اور تحریریں مشرقی ثقافت کی برتری اور اہمیت کو اجاگر کرنے کا ایک مؤثر ذریعہ بن گئیں۔ اکبرالہٰ آبادی نے اپنی طنزیہ اور مزاحیہ تحریروں کے ذریعے نہ صرف مشرقی روایات کا احترام کیا بلکہ قارئین کو ان کے تحفظ کی اہمیت سے بھی آگاہ کیا۔ ان کی تحریروں میں گہرائی، شگفتگی اور شعور کی آمیزش تھی جس نے اُردو ادب میں طنز و مزاح کو ایک بلند مقام عطا کیا۔ ان کا طنز اور مزاح محض تفریح کا ذریعہ نہیں تھا بلکہ اس میں ایک فکری پیغام بھی شامل ہوتا تھا جو قارئین کو سوچنے اور اپنی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر غور کرنے پر مجبور کر دیتا تھا۔ یوں ''اودھ پنچ'' اور اکبرالہٰ آبادی نے مل کر اُردو ادب میں طنز و مزاح کی ترقی میں ناقابل فراموش خدمات انجام دیں، ان کی کاوشوں نے نہ صرف طنز و مزاح کے دائرہ کار کو وسعت دی بلکہ اس صنف کو ادب کا ایک اہم اور سنجیدہ حصّہ بنا دیا جو آج بھی اُردو ادب میں زندہ ہے اور قارئین کو اپنی طرف متوجہ کرتا ہے۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:۔

۲۵ ''اودھ پنچ'' کب اور کہاں قائم ہوا؟

۲۶ ''اودھ پنچ'' کے بانی کون تھے؟

۲۷ ''اودھ پنچ'' کا مقصد کیا تھا؟

۲۸ ''اودھ پنچ'' کے نمایاں ادیب کون تھے؟

۲۹ ''اودھ پنچ'' کن مسائل پر روشنی ڈالتا تھا؟

۳۰ ''اودھ پنچ'' کا ہندو مسلم اتحاد میں کیا کردار تھا؟

۳۱ اودھ پنچ رسالہ کب بند ہوا؟

۳۲ اودھ پنچ کو دوبارہ کب جاری کیا گیا؟

۳۳ اودھ پنچ کے اہم طنزیہ شاعر کون تھے؟

۳۴ اودھ پنچ کا اہم اصلاحی موضوع کیا تھا؟

۳۵ اودھ پنچ کے مضامین میں کس ثقافت پر تنقید کی گئی؟

۳۶ اودھ پنچ کے مدیر کے نام کیوں نہیں شائع کیے جاتے تھے؟

۳۷ اودھ پنچ کا سرورق کیسا ہوتا تھا؟

۳۸ اودھ پنچ کے مضامین کا خاص پہلو کیا تھا؟

۳۹ اکبرالہٰ آبادی کا سب سے بڑا کمال کیا تھا؟

۴۰ اکبرالہٰ آبادی نے مشرقی روایات کا تحفظ کیسے کیا؟

﴿۴۱﴾ اکبرالہ آبادی کی شاعری میں طنز ومزاح کا مقصد کیا تھا؟

﴿۴۲﴾ اکبرالہ آبادی کا طنز ومزاح کس طرح منفرد تھا؟

﴿۴۳﴾ اکبرالہ آبادی کے اشعار قاری کو کس طرح متاثر کرتے ہیں؟

﴿۴۴﴾ اکبرالہ آبادی نے مغربی تہذیب پر کیا تنقید کی؟

﴿۴۵﴾ اکبرالہ آبادی کی شاعری کا ایک بڑا پہلو کیا ہے؟

﴿۴۶﴾ اکبرالہ آبادی کے اندازِ بیان کی خصوصیت کیا ہے؟

﴿۴۷﴾ اکبرالہ آبادی کا طنز کن موضوعات پر مرکوز تھا؟

﴿۴۸﴾ اکبرالہ آبادی کے اشعار کو کیا حیثیت حاصل ہے؟

﴿۴۹﴾ اکبرالہ آبادی کی شاعری کی سب سے بڑی خدمت کیا ہے؟

﴿۵۰﴾ اکبرالہ آبادی اور ''اودھ پنچ'' کا اردو ادب میں کیا مقام ہے؟

09.06 اودھ پنچ کے بعد اُردو طنز ومزاح

اودھ پنچ کے بعد معاشرے میں سیاسی، سماجی، ادبی، اقتصادی اور تہذیبی محاذوں پر ایسی تبدیلیاں رونما ہوئیں جنہوں نے ہر شعبہ زندگی پر گہرا اثر ڈالا۔اس دور میں مغربی تہذیب پر شدید تنقید کی جاتی رہی لیکن اس کے باوجود مغربی علوم وافکار کا اثر نمایاں ہونے لگا۔اس دَور کے ادبی منظر نامے میں سجاد حیدر یلدرم، مہدی افادی، اور عبدالعزیز فلک پیما جیسے ادیبوں کے علاوہ چند صحافیوں نے بھی ادبی طنز ومزاح پر توجہ مرکوز کی۔ اگرچہ سماجی موضوعات پر براہ راست حملے کرنے سے گریز کیا گیا، لیکن بالواسطہ طور پر ان موضوعات پر قلم اٹھایا جاتا رہا، اور طنز و مزاح نگار اپنے منفرد انداز میں سماجی مسائل کو اجاگر کرنے کی کوشش کرتے رہے۔اس دور میں عظیم بیگ چغتائی، شوکت تھانوی اور شفیق الرحمٰن جیسے بڑے نام ابھر کر سامنے آئے جنہوں نے ادبی طنز ومزاح کو نئی بلندیوں تک پہنچایا۔ان فن کاروں نے مزاح کو عملی زندگی کے واقعات اور کرداروں کے ذریعے تخلیق کیا۔

عظیم بیگ چغتائی نے اپنی تحریروں میں بیوی اور زن مرید شوہر کے گرد شرارتوں اور لطائف کا جال بُنا۔ان کی تحریریں سماجی مسائل پر براہ راست حملہ کرنے کے بجائے روزمرہ زندگی کے معمولات کے ذریعے قارئین کو محظوظ کرتی تھیں۔شوکت تھانوی نے سماجی اور سیاسی مسائل کو نشانہ بناتے ہوئے سودیشی تحریک اور سرکاری انتظامات کی خامیوں پر طنز کیا۔ان کی تحریریں نہ صرف دل چسپ تھیں بلکہ قارئین کو ان کے اردگرد کے مسائل پر غور وفکر کی دعوت دیتی تھیں۔

سجاد حیدر یلدرم کی تحریروں میں شائستگی اور سلیقہ مندی نمایاں نظر آتی ہے جس کی ایک بڑی وجہ ان کا زبان و بیان پر مکمل عبور اور ترکی کے رومانی ادب سے گہری واقفیت ہے۔اس علمی وادبی پس منظر کی بدولت ان کے اسلوب میں ایک مخصوص دل کشی اور شگفتگی پیدا ہوگئی ہے جو قاری کو نہ صرف محظوظ کرتی ہے بلکہ ایک خوشگوار احساس بھی عطا کرتی ہے۔سجاد حیدر یلدرم کو عمومی مزاح نگاروں سے اس لئے بھی منفرد کہا جا سکتا ہے کہ وہ کھلی مزاحیہ باتوں یا مضحکہ خیز پہلوؤں کو اجاگر کرنے کے بجائے نرمی اور لطافت کو ترجیح دیتے ہیں۔ وہ نہ تو بے جا ہنسنے ہنسانے کے قائل ہیں، نہ بے تکے لطیفے گھڑنے کی کوشش کرتے ہیں اور نہ ہی زبردستی کی مزاحیہ گفتگو کو اپنی تحریروں میں شامل کرتے ہیں۔اس کے برعکس وہ

اپنے اسلوب میں ایک سنجیدہ اور لطیف شگفتگی کا رنگ پیدا کرتے ہیں جو قاری کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ یا تبسمِ زیرِ لب کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ اگرچہ ان کی تحریروں میں عمومی طور پر نرمی اور سنجیدگی پائی جاتی ہے لیکن بعض مواقع پر وہ نہایت سادہ مگر مؤثر انداز میں ہنسی کے ایسے دل کش نقوش بھی ابھارتے ہیں کہ پڑھنے والا بے اختیار ان کے ہم نوا ہو کر ہنسنے لگتا ہے۔ ان کی کہانی ''چڑیا چڑے کی کہانی'' اس بات کا بہترین نمونہ ہے کہ وہ کس طرح نہایت خوب صورت اور دل کش فضا تخلیق کرتے ہیں۔ اس کہانی میں جہاں رومانی اور فطری ماحول کی جھلک موجود ہے، وہیں ایک مخصوص نرمی اور لطافت سے بھرپور طنز بھی ملتا ہے، جو قاری کو لطف اندوز کرنے کے ساتھ ساتھ ایک دل چسپ ادبی تجربہ بھی عطا کرتا ہے۔

> ''اور انسان تو چلے گئے۔ بس ایک انسان چڑا اور ایک انسان چڑیا تمہاری زبان میں میاں بی بی رہ گئے۔ اب انہوں نے دانہ بدلی شروع کردی اور پھر وہی پیار محبت کی باتیں ہونے لگیں۔ پہلے مجھے خیال ہوا تھا کہ شاید اُنہوں نے مجھے دیکھا نہیں۔ اس لئے اُڑ کے اور پھڑ پھڑا کے اُن کے قریب میز پر جا بیٹھا، پھر کرسی پر جا بیٹھا۔ وہاں سے اُڑ کر دیوار میں جو تصویر لگی ہوئی تھی اُس کے چوکھٹے پر جا بیٹھا۔ تب بھی اپنے کام سے کام۔ آخر مَیں نے زور سے چلاّنا شروع کیا: مَیں یہاں ہوں، مَیں یہاں ہوں۔ چوں چوں، مگر بے حیائی دیکھئے۔ مجھے دیکھ کر دونوں نے ہنسنا شروع کر دیا۔''

پطرس بخاری نے اپنے ماحول کے کرداروں کے ذریعے مزاح تخلیق کیا۔ ان کی تحریریں جیسے ''میں ایک میاں ہوں، کتے، مرید پور کا پیر، اور سویرے جو آنکھ کھلی'' روزمرہ زندگی کی عکاسی کرتی ہیں۔ پطرس نے واقعات کو نہایت چابکدستی سے پیش کیا اور ان کے ذریعے سماج کے کرداروں کی کمزوریوں اور رویوں پر ہلکے پھلکے انداز میں تنقید کی۔ پطرس بخاری اپنی تحریروں میں کردار نگاری اور سیرت طرازی میں ایک ماہرِ نفسیات کی طرح مہارت رکھتے ہیں۔ ان کے کردار حقیقی زندگی سے قریب تر اور فطری انداز میں متحرک نظر آتے ہیں لیکن خود ان کرداروں کو اس بات کا شعور نہیں ہوتا کہ ان کی حرکات وسکنات دوسروں پر کیا اثر ڈال رہی ہیں یا ان کے اعمال سے دوسرے کس حد تک متاثر ہو رہے ہیں۔ یہی بے ساختگی اور فطری انداز پطرس کے مزاح کو ایک انفرادی اور معیاری حیثیت عطا کرتا ہے۔ ان کے مزاح میں محض ہنسی مذاق ہی نہیں بلکہ ایک گہری سنجیدگی کا عنصر بھی شامل ہوتا ہے جو اسے سطحی تفریح کے بجائے ایک بامعنی اور مؤثر انداز عطا کرتا ہے۔ وہ طنز و مزاح کے امتزاج میں اعتدال اور توازن کو برقرار رکھتے ہیں اور ان کے لہجے میں نہ صرف شائستگی بلکہ ایک ہمدردانہ پہلو بھی جھلکتا ہے۔ ان کے مزاح میں کسی قسم کی تلخی یا نشتریت نظر نہیں آتی بلکہ وہ نرم خوئی اور خوش اخلاقی کے ساتھ قاری کو محظوظ کرتے ہیں۔ پطرس بخاری اپنی تحریروں میں نہ صرف موضوع پر مضبوط گرفت رکھتے ہیں بلکہ ان کے اسلوب اور زبان کے انتخاب میں بھی غیر معمولی مہارت نظر آتی ہے۔ وہ الفاظ کے چناؤ میں خاص احتیاط برتتے ہیں اور برمحل الفاظ کے استعمال سے ایک ایسا زیرِ لب مزاح پیدا کرنے میں کامیاب ہوتے ہیں جو بظاہر ہلکا پھلکا محسوس ہوتا ہے مگر اپنے اندر ایک گہرا اثر رکھتا ہے۔ ان کی تحریروں میں نہ صرف مزاحیہ پہلو ہوتا ہے بلکہ وہ قاری کو سوچنے پر بھی مجبور کر دیتی ہیں جو ان کے ادبی کمال اور فنی مہارت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ پطرس بخاری نے اپنے ایک مضمون ''مَیں ایک میاں ہوں'' میں مذاق کے لئے خود کو پیش کیا ہے اور اپنی بے بسی کی عکّاسی ایک ایسے واقعہ سے کی ہے جو مضحکہ خیز بھی ہے اور غیر متوقعہ بھی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''ہم بھی مزے میں آئے ہوئے تھے۔ہم نے کہا تو ہُوا کیا؟ آج ہم ہیں تو کل کسی اور کی باری آ جائے گی۔ نہایت خندہ پیشانی سے اپنے چہرے کو پیش کیا۔ہنس ہنس کر وہ بے ہودہ سی ٹوپی پہنی۔ایک شانِ استغنا کے ساتھ چلم اُٹھائی اور زنانے کا دروازہ کھول کر باورچی خانے کو چل دیے اور ہمارے پیچھے کمرہ قہقہوں سے گونج رہا تھا۔

صحن میں پہنچے ہی تھے کہ باہر کا دروازہ کھُلا اور ایک برقعہ پوش خاتون اندر داخل ہوئیں۔منہ سے بُرقعہ اُلٹا تو روشن آرا۔''

مرزا فرحت اللہ بیگ کے متعدد مضامین میں سنجیدگی اور ظرافت کا ایک ایسا حسین امتزاج نظر آتا ہے جو انہیں منفرد اور ممتاز بناتا ہے۔وہ اپنے تحریری اسلوب میں گزرتے ہوئے حالات و واقعات کا ذکر نہ صرف ایک بیانیہ کے طور پر کرتے ہیں بلکہ ان کے ذریعے ایک زوال پذیر معاشرت اور دم توڑتی ہوئی تہذیب کے اہم نمونوں کو محفوظ کرنے کی کوشش بھی کرتے ہیں۔ان کی تحریریں محض تفریحی نہیں ہوتیں بلکہ ان میں ایک سنجیدہ فکری پہلو بھی شامل ہوتا ہے جو معاشرتی اقدار اور تہذیبی روایات کے تحفظ کی ایک سعی کہی جا سکتی ہے۔فرحت اللہ بیگ کو مزاح تخلیق کرنے کے فن پر عبور حاصل ہے۔وہ مختلف مواقع پر مضحک پہلوؤں کو اجاگر کرتے ہیں اور کہیں کہیں لطائف کا سہارا لے کر ایسی شگفتگی پیدا کر دیتے ہیں جو قاری کے چہرے پر بے ساختہ مسکراہٹ بکھیر دیتی ہے۔ان کے اسلوب میں شوخی اور ظرافت کے ساتھ ساتھ طنز کا ایک نہایت باریک اور نپا تُلا عنصر بھی شامل ہوتا ہے جو ان کے فن کی چابک دستی کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ان کی تحریروں میں ظرافت اور طنز کی ایسی آمیزش ملتی ہے جو قاری کو نہ صرف ہنساتی ہے بلکہ سوچنے پر بھی مجبور کر دیتی ہے۔ان کے شاہ کار خاکوں میں سے ایک ''نذیر احمد کی کہانی کچھ اُن کی کچھ میری زبانی'' اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ وہ کسی شخصیت کی تصویر کشی میں غیر معمولی مہارت رکھتے تھے۔اس خاکے میں وہ نذیر احمد کی زندگی اور شخصیت کی جزئیات کو انتہائی باریک بینی اور دل چسپ انداز میں بیان کرتے ہیں جہاں مزاح اور سنجیدگی کا حسین امتزاج قاری کو بیک وقت محظوظ بھی کرتا ہے اور غور و فکر پر بھی مائل کرتا ہے:

''رنگ سانولا مگر روکھا، قد خاصا اونچا تھا مگر چوڑان نے لمبان کو دبا دیا تھا، دُہرا بدن گدرایا ہی نہیں بلکہ موٹاپے کی طرف کسی قدر مائل۔فرماتے تھے کہ بچپن میں ورزش کا شوق تھا۔ورزش چھوڑ دینے سے بدن جس طرح مرمروں کا تھیلا ہو جاتا ہے، بس یہی کیفیت تھی، بھاری بدن کی وجہ سے چوں کہ قد ٹھگنا معلوم ہونے لگا تھا اس لئے اس کا تکملہ اونچی تُرکی ٹوپی سے کر دیا جاتا تھا مگر کمر کا پھیر ضرورت سے زیادہ تھا۔توند اس قدر بڑھ گئی تھی کہ گھر میں ازار بند باندھنا بے ضرورت ہی نہیں تکلیف دہ سمجھا جاتا تھا اور محض ایک گرہ کو کافی خیال کیا گیا تھا۔گرمیوں میں تہمد (تہ بند) باندھتے تھے، اس کے پلّو اُڑسنے کی بجائے اِدھر اُدھر ڈال لیتے تھے مگر اُٹھتے وقت بہت احتیاط کرتے تھے۔ اوّل تو قطب سے بیٹھے رہتے تھے اگر اُٹھنا ہوا تو پہلے اندازہ کرتے تھے کہ فی الحال اُٹھنے کو ملتوی کیا جا سکتا ہے یا نہیں، ضرورت نے بہت ہی مجبور کیا تو ازار بند کی گرہ یا تہمد کے کونوں کو اُڑسنے کا دباؤ توند پر ڈالتے تھے۔سر بہت بڑا تھا مگر بڑی حد تک اس کی صفائی کا انتظام قدرت نے اپنے اختیار میں رکھا تھا جو تھوڑے رہے سہے بال تھے وہ اکثر نہایت احتیاط سے صاف کرا دیے جاتے تھے، ورنہ بالوں کی یہ گگر سفید مقیش کی صورت میں ٹوپی کے کناروں پر جھالر کا نمونہ ہو جاتی تھی۔آنکھیں چھوٹی چھوٹی ذرا اندر کو دھنسی ہوئی تھیں۔بھویں گھنی اور آنکھوں کے اوپر سایہ افگن تھیں۔آنکھوں

میں غضب کی چمک تھی، وہ چمک نہیں جو غُصّہ کے وقت نمودار ہوتی ہے بلکہ وہ چمک تھی جس میں شوخی اور ذہانت کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ اگر مَیں ان کو ''مُسکراتی ہوئی آنکھیں'' کہوں تو بے جا نہ ہوگا۔ کلّہ، جبڑا، بڑا زبردست پایا تھا۔ چوں کہ دہانہ بھی بڑا تھا اور پیٹ کے محیط نے سانس کے لئے گنجائش بڑھا دی تھی، اس لئے نہایت اونچی آواز میں بغیر سانس کھینچے بہت کچھ کہہ جاتے تھے۔''

رشید احمد صدیقی نے اپنی تحریروں میں ہنگامی موضوعات پر قلم اٹھایا اور سماج کی دکھتی رگوں کو چھوا۔ ان کے مضامین جیسے ''چارپائی، وکیل، ریل کا سفر، گواہ، ارہر کے کھیت اور دیہاتی ڈاکٹر'' معاشرتی مسائل اور انسانی رویوں پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ ان موضوعات کے ذریعے انہوں نے نہایت باریک بینی سے سماجی برائیوں اور انسانی کمزوریوں کو اجاگر کیا۔ ان تمام ادیبوں نے اپنی منفرد طرزِ تحریر اور موضوعات کے ذریعے اُردو ادب کے طنز و مزاح کو ایک نیا معیار دیا۔

رشید احمد صدیقی نے اپنے طنز و مزاح کے ذریعے اُردو ادب میں ایک بلند معیار قائم کیا اور ان کی نثر میں ایک خاص دل کشی اور شائستگی پائی جاتی ہے۔ رشید احمد صدیقی کے ادبی اسلوب میں طنز و مزاح کے ساتھ سنجیدگی، متانت اور ادبی کشش کا خوب صورت امتزاج پایا جاتا ہے۔ ان کی تحریروں میں سطحی مذاق یا پھکڑ پن کی کوئی گنجائش نہیں ہے کیوں کہ وہ عامیانہ انداز کو پسند نہیں کرتے۔ ان کے طنز میں طعن و تشنیع یا ہزل جیسے منفی عناصر بالکل نظر نہیں آتے بلکہ ان کا طنز ایک مہذب اور بامقصد اظہار ہے۔ رشید احمد صدیقی کے مضامین بظاہر عام فہم نہیں ہوتے کیوں کہ ان کی تحریریں اکثر گہرے واقعاتی حوالوں اور لطیف اشارات سے مزین ہوتی ہیں جو قاری کی علمی بصیرت کو متحرک کرتے ہیں۔ رشید احمد صدیقی ادب کو محض تفریح کا ذریعہ سمجھنے کے قائل نہیں تھے بلکہ ان کے نزدیک ادب ایک سنجیدہ ذمہ داری ہے جو انسانی زندگی کو بہتر بنانے میں کردار ادا کرے۔ ان کی رائے میں فن کا مقصد صرف انفرادی دل بستگی یا وقتی مسرت فراہم کرنا نہیں ہونا چاہیے بلکہ اس کے ذریعے معاشرے کی ناہمواریوں اور منفی رجحانات کو اجاگر کرنا اور مثبت وصحت منداقدار کو فروغ دینا زیادہ اہم ہے۔ ان کی نگارشات اسی نظریے کی عکاسی کرتی ہیں اور معیار و وقار کا اعلیٰ نمونہ پیش کرتی ہیں جو قاری کو نہ صرف علمی اور فکری طور پر متحرک کرتی ہیں بلکہ معاشرتی اصلاح کی جانب راغب بھی کرتی ہیں۔ رشید احمد صدیقی خود کہتے ہیں:

''طنز وظرافت کسی کی آبروریزی یا اپنی نالائقی کی تسکین کے لئے نہیں بلکہ معاشرے کی اصلاح و اِرتقا کے لئے ہوتی ہے۔''

علامہ اقبالؔ نے اپنی شاعری کے ابتدائی دور میں طنزیہ ومزاحیہ انداز کو اپنے تخلیقی اظہار کا ایک اہم وسیلہ بنایا۔ ان کی ابتدائی شاعری میں ایسی کئی نظمیں شامل ہیں جن میں ہلکے پھلکے طنز اور شگفتگی کے ذریعے سماجی اور انسانی معاملات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ ان نظموں میں اقبالؔ کے تخلیقی ذہن کا ایک منفرد پہلو سامنے آتا ہے جو ان کے بعد کے سنجیدہ اور فلسفیانہ موضوعات سے مختلف لیکن نہایت اہم ہے۔ ان ابتدائی تخلیقات میں وہ نہ صرف اپنے قارئین کو مسکرانے کا موقع دیتے ہیں بلکہ زندگی کی تلخیوں اور پیچیدگیوں کو ایک خوشگوار اور دل کش انداز میں بیان کرتے ہیں۔ علامہ اقبالؔ کی طنز اور ظرافت ایک سطحی یا ہلکے پھلکے انداز کی حامل نہیں ہے بلکہ اس میں گہری فکر اور عمیق معنویت موجود ہے جو قاری کو دیرپا اثرات سے دوچار کرتی ہے۔ اقبال کی تحریریں اور شاعری قاری کو نہ صرف ذہنی طور پر بیدار کرتی ہیں بلکہ اسے اپنے اردگرد کے حالات اور معاشرتی رویوں کا بغور جائزہ لینے پر بھی آمادہ کرتی ہیں۔ ان کی طنز میں ایک غیر معمولی سنجیدگی پائی جاتی ہے جو محض دل بہلانے یا

تفریح کے لئے نہیں بلکہ قاری کو سوچنے، سمجھنے اور خود کو بہتر بنانے کے لئے متحرک کرتی ہے۔ اقبالؔ کی طنزیہ انداز تحریر کا پہلا اور سب سے نمایاں نشانہ تہذیبِ مغرب ہے جسے وہ اپنی فکر اور نظریے کے تناظر میں شدت کے ساتھ ہدفِ تنقید بناتے ہیں۔ انہوں نے مغربی تہذیب کے ظاہری چمک دمک، مادی ترقی، اور سطحی اقدار پر نہایت گہرائی سے روشنی ڈالی ہے اور اس کے اخلاقی و روحانی پہلوؤں میں موجود کمزوریوں کو بے نقاب کیا ہے۔ اقبالؔ کی طنز محض تنقید برائے تنقید نہیں بلکہ اصلاح اور رہنمائی کا ذریعہ ہے۔ وہ قاری کو یہ باور کراتے ہیں کہ مغربی تہذیب کی اندھی تقلید ایک خطرناک راستہ ہو سکتا ہے جو انسانیت کی حقیقی روحانی اور اخلاقی ترقی کو نقصان پہنچا سکتا ہے۔ اقبالؔ کی اس گہری اور معنویت سے بھرپور طنز کا مقصد قاری کو اس کی اپنی اقدار اور شناخت پر غور و فکر کی دعوت دینا ہے۔ ان کی ظرافت اگرچہ ظاہری طور پر ہلکی پھلکی لگتی ہے لیکن اس کے پیچھے چھپے پیغام اور گہرے خیالات قاری کو ایک نئے شعور اور بصیرت سے آشنا کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تحریروں میں موجود طنز اور ظرافت کا اثر دیرپا اور دل میں اتر جانے والا ہے۔

شیخ صاحب بھی تو پردے کے کوئی حامی نہیں مفت میں کالج کے لڑکے اُن سے بدظن ہو گئے
وعظ میں فرما دیا کل آپ نے یہ صاف صاف پردہ آخر کس سے ہو جب مَرد ہی زَن ہو گئے

☆

لڑکیاں پڑھ رہی ہیں انگریزی ڈھونڈ لی قوم نے فلاح کی راہ
روشِ مغربی ہے مدِ نظر وضعِ مشرق کو جانتے ہیں گناہ
یہ ڈراما دِکھائے گا کیا سین پردہ اُٹھنے کی منتظر ہے نگاہ

☆

مشرق میں اصولِ دین بن جاتے ہیں مغرب میں مگر مشین بن جاتے ہیں
رہتا نہیں ایک بھی ہمارے پلّے واں ایک کے تین تین بن جاتے ہیں

علامہ اقبالؔ کے بعد اُردو ادب میں طنزیہ و مزاحیہ شاعری کو مزید نکھارنے اور مستحکم کرنے میں کئی مشہور شعرا نے نمایاں کردار ادا کیا۔ راجا مہدی علی خان، دلاور فگار، شاد عارفی، امیر جعفری، اور رضا نقوی واہی جیسے بلند پایہ شعرا نے اس صنف کو نیا اعتبار اور وقار بخشا۔ انہوں نے اپنی شاعری میں طنز و مزاح کو نہ صرف تفریح کا ذریعہ بنایا بلکہ اسے سماجی مسائل اور تہذیبی پیچیدگیوں پر تنقید کا ایک مؤثر ذریعہ بھی قرار دیا۔ ان شعرا نے اپنے اشعار میں ہلکے پھلکے مزاح کے ساتھ ساتھ گہرے طنز کے ذریعے سماج کے دوغلے پن، سیاسی و معاشرتی ناانصافیوں اور دیگر مسائل کو نہایت مؤثر انداز میں پیش کیا۔

راجہ مہدی علی خاں نے اپنی طنزیہ و مزاحیہ انفرادیت سے شاعری کی دنیا کو مزید نکھار بخشا۔ انہوں نے مزاح کے ذریعے زندگی کے مختلف پہلوؤں کو خوب صورتی کے ساتھ پیش کیا۔ راجہ مہدی علی خاں کی ایک مشہور مزاحیہ نظم ''ادیب کی محبوبہ'' جس میں انہوں نے بڑی چابکدستی اور مہارت سے مختلف معروف شاعروں اور ادیبوں کے ناموں کو شامل کر کے ایک دل چسپ اور یادگار تخلیق پیش کی ہے۔ یہ نظم نہ صرف ان کی مزاحیہ صلاحیتوں کا شاہ کار ہے بلکہ ان کے تخلیقی اظہار کی انفرادیت کا بھی ثبوت ہے۔ پیش ہیں اس نظم کے چند اشعار۔

تمہاری الفت میں ہارمونیم پہ میرؔ کی غزلیں گا رہا ہوں
بہتر اِن میں چھپے ہیں نشتر جو سب کے سب آزما رہا ہوں

بہت دنوں سے تمہارے جلوے ''خدیجہ مستور'' ہو گئے ہیں
ہے شکرِ باری کہ سامنے اپنے آج پھر تم کو پا رہا ہوں

لحاف ''عصمت'' کا اوڑھ کر تم فسانے ''منٹو'' کے پڑھ رہی ہو
پہن کے ''بیدی'' کا گرم کوٹ آج تم سے آنکھیں ملا رہا ہوں

تمہارے گھر ن.م.راشدؔ کا لے کے آیا سفارشی خط
مگر تعجب ہے پھر بھی تم سے نہیں میں کچھ فیضؔ پا رہا ہوں

بہت ہے سیدھی سی بات میری نہ جانے تم کیوں نہیں سمجھتیں
قسم خدا کی کلامِ غالبؔ نہیں میں تم کو سنا رہا ہوں

حسیں ہو زہرہ جمال ہو تم مجھے ستا کر نہال ہو تم
تمہارے یہ ظلم ''قرۃ العین'' کو بتانے میں جا رہا ہوں

''حکیم یوسف علی'' نے جب میری نبض دیکھی تو رو کے بولے
جگرؔ ہے زخمی تباہ گردے یہ بات تم سے چھپا رہا ہوں

ملیح آباد آج جا رہا ہوں میں جوشؔ لاؤں کہ آم لاؤں
ہیں دونوں چیزیں وہاں کی اچھی میں لاؤں کیا تلملا رہا ہوں

فسانۂ عشق مختصر ہے قسم خدا کی نہ بور ہونا
فراقؔ گورکھ پوری کی غزلیں نہیں میں تم کو سنا رہا ہوں

مِری محبت کی داستاں کو گدھے کی مت سرگزشت سمجھو
میں ''کرشن چندر'' نہیں ہوں ظالم یقین تم کو دلا رہا ہوں

دلاور فگارؔ نے اپنی منفرد اور شگفتہ طرزِ بیان کے ذریعے طنز و مزاح کو ایک نئی جہت دی۔ اُردو کی مزاحیہ شاعری میں دلاور فگار کو ایک نمایاں اور عظیم شاعر کا درجہ حاصل ہے جنہوں نے اپنے منفرد انداز اور بے مثال تخلیقی صلاحیتوں سے طنز و مزاح کو ایک نئی جہت عطا کی۔ دلاور فگار خاص طور پر اپنی معروف غزلوں اور نظموں کی پیروڈی کے لئے مشہور ہیں جنہیں وہ اس قدر شان دار اور غیر معمولی مہارت سے پیش کرتے تھے کہ قاری اور سامع دونوں ان کے فن کے معترف ہو جاتے۔ ان کی پیروڈیز کے دل کش انداز، خوب صورت زبان، اور مزاحیہ موڑ اس قدر لاجواب تھے کہ انہیں بجا طور پر ''پیروڈی کا بادشاہ'' کہا جا سکتا ہے۔ دلاور فگار کی یہ خاصیت کہ وہ کسی بھی سنجیدہ تخلیق کو مزاح کے قالب میں ڈھال کر اسے مزید پرلطف اور معنی خیز بنا دیتے تھے، اُردو شاعری کی دنیا میں ان کی عظمت اور انفرادیت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ دلاور فگار کی مزاحیہ شاعری کا ایک شاہ کار ان کی مشہور نظم ''سہرے میں مرثیہ، مرثیہ میں سہرا'' ہے جس میں انہوں نے طنز و مزاح کے ذریعے انسانی فطرت اور حالات کی دل چسپ عکاسی کی ہے۔ اس نظم میں ایک نو آموز شاعر اپنے استاد کے پاس مشورہ لینے آتا ہے اور کہتا ہے کہ اسے ایک شادی کی تقریب میں سہرا پڑھنے کے لئے بلایا گیا ہے جب کہ اسی دن شام کو ایک جنازے میں مرثیہ بھی پڑھنا ہے۔ چوں کہ اس کے پاس دونوں مواقع کے لئے کوئی موزوں کلام نہیں لہٰذا وہ استاد سے درخواست کرتا ہے کہ وہ اس کے لئے سہرا اور مرثیہ لکھ دیں۔ استاد نے معاملے کو دل چسپ انداز میں حل کرنے کے لئے ایک کاغذ لیا اسے درمیان سے موڑا اور ایک طرف سہرا لکھا اور دوسری طرف مرثیہ۔ ناتجربہ کار شاعر نے شادی کے گھر میں پہنچ کر سہرا پڑھنا شروع کیا لیکن کاغذ کو سیدھا کھولنے کی غلطی کی جس کے نتیجے میں ایک مصرع سہرے کا اور دوسرا مصرع مرثیے کا پڑھا جانے لگا۔ اس طرح سہرا اور مرثیہ ایک ساتھ گڈمڈ ہو گئے اور ایک نہایت مزاحیہ صورت حال پیدا ہو گئی۔ شاعر نے شادی کی تقریب میں سہرا اس طرح پیش کیا۔

اچھے میاں کا عقد ہوا ہے بہار میں
کہہ دو کسی سے پھول بچھا دے مزار میں

رُوئے حسیں پہ سہرے سے کیسی بہار ہے
اے موت جلد آ کہ ترا انتظار ہے

نوشاہ کو عروس بڑی ذی ہنر ملی
مرحوم کو حیات بڑی مختصر ملی

یہ صورتِ حال شادی کے مہمانوں کے لئے نہایت حیرت انگیز اور مزاحیہ ثابت ہوئی۔ بعدازاں وہی شاعر جنازے کے گھر پہنچا اور مرثیہ کے طور پر وہی کلام پیش کیا لیکن اب ترتیب مزید مضحکہ خیز ہو گئی:

پیارے میاں کی موت ہوئی ہے بہار میں　　مدت سے اَقربا تھے اِسی انتظار میں
پیارے میاں کے سوگ میں دل بے قرار ہے　　ساون کے گیت گاؤ فضا خوش گوار ہے
پیارے میاں کو عمر بہت مختصر ملی　　مدت کے بعد آج یہ اچھی خبر ملی

دلاور فگار کی یہ پوری نظم کی بے پناہ تخلیقی صلاحیتوں اور ان کے مزاحیہ اسلوب کا شاہ کار نمونہ ہے جس میں انہوں نے انسانی رویوں، حالات کی نزاکتوں اور موقعوں کی مناسبت کے ساتھ طنز ومزاح کا حسین امتزاج پیدا کیا۔ ان کا یہ کارنامہ اس بات کا مظہر ہے کہ اُردو ادب میں مزاحیہ شاعری کیسے سنجیدگی کے ساتھ گہری تفریح فراہم کرسکتی ہے۔

شہر رام پور کے معروف شاعر شاد عارفی اُردو ادب کے ان چند منفرد اور نمایاں شاعروں میں شمار ہوتے ہیں جو اپنی مخصوص لہجے اور انوکھے طرزِ بیان کی وجہ سے دور سے پہچانے جاتے ہیں۔ ان کا شعری اسلوب، اندازِ فکر اور تیکھا بیان نہ صرف انہیں دوسرے شاعروں سے ممتاز کرتا ہے بلکہ ان کے تخلیقی کارناموں کو اُردو شاعری میں ایک منفرد مقام عطا کرتا ہے۔ شاد عارفی اپنی بنیادی شناخت ایک طنز نگار شاعر کے طور پر رکھتے ہیں لیکن اُردو ادب میں ان کا شمار عشقیہ غزل گو شعرا میں بھی ہوتا ہے۔ شاد عارفی نے گہرے سماجی شعور کے ساتھ طنز کو اپنے اشعار کا حصّہ بنایا۔ شاد عارفی کا سب سے بڑا امتیاز ان کی شاعری میں طنز ومزاح کا گہرا رنگ ہے جو نہ صرف معاشرتی اور سیاسی موضوعات پر گہری تنقید پیش کرتا ہے بلکہ سامعین کو تفکر اور غور وفکر کی طرف مائل بھی کرتا ہے۔ ان کی تخلیقات میں طنز کی گہرائی اور معنویت اس قدر نمایاں ہے کہ انہیں عموماً اُردو کے ایک عظیم طنز نگار شاعر کے طور پر یاد کیا جاتا ہے۔ اُردو غزل کی تاریخ میں شاد عارفی نے غزل کے ذریعے جو سنجیدہ اور بامقصد طنز نگاری کی ہے وہ ایک منفرد مقام رکھتی ہے۔ شاد عارفی کی شاعری کا اگر سرسری جائزہ بھی لیا جائے تو یہ واضح ہو جاتا ہے کہ انہوں نے سماجی زندگی کے ہر پہلو پر گہری نگاہ ڈالی اور اس کی ہر کمزوری، برائی، اور ناہم وَاری کو اپنے طنزیہ انداز میں اجاگر کیا۔ ان کے طنز کا دائرہ اتنا وسیع ہے کہ وہ کسی بھی مسئلے یا تضاد کو اپنی شاعری میں بغیر کسی جھجک کے شامل کرتے ہیں اور ان کی زبان کا تلخ انداز لوگوں کے رویوں اور سماجی حالات پر ایک نیا روشنی ڈالتا ہے۔ شاد عارفی نے خود اپنی طنز کی وسیعت کا بیان یوں کیا ہے ؎

آتی ہیں مِرے طنز کی چھینٹیں تو سبھی پر　　یہ کیا کہ فقط آپ بُرا مان رہے ہیں
عظمتِ فن کی روایات کو مَرنے نہ دیا　　شعر سے بچ کے کوئی ظلم گزرنے نہ دیا

یہ اشعار صرف شاد عارفی کا دعویٰ نہیں بلکہ ان کی شاعری میں موجود حقیقت کا عکاس ہیں۔ ان کی ہر غزل سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ان کا طنز نہ صرف ذاتی یا سطحی نوعیت کا تھا بلکہ سماجی اور سیاسی معاملات کو گہرائی سے سمجھ کر اس پر تبصرہ کرتے تھے۔ شاد عارفی نے اپنے عہد کے ہر مسئلے کو رنگ ونسل اور مذہب کی تفریق سے بالاتر ہو کر طنز کے ذریعے چھوا اور اس پر اپنی رائے دی۔ ان کے کلام میں سماجی اور سیاسی موضوعات پر طنز کی جھلکیاں بہت واضح ہیں۔ ان کی شاعری میں سیاست کی بدعنوانیوں اور بے ترتیبیوں کو نہایت دل سوز اور چٹکیلے انداز میں پیش کیا گیا ہے جیسا کہ ان کے ایک مشہور شعر میں اس بات کی عکاسی کی گئی ہے ؎

ہمارے ہاں کی سیاست کا حال مت پوچھو　　گھری ہوئی ہے طوائف تماش بینوں میں

اس شعر میں انہوں نے سیاست کے بدترین حالات کو انتہائی سادہ لیکن بھرپور انداز میں بیان کیا ہے، جہاں سیاست دانوں کی بے وقعتی اور ان کے اعمال کی حقیقت کو طوائف کے کردار سے جوڑ کر طنز کیا ہے۔ شاد عارفی کی شاعری میں یہی وہ خصوصیت ہے جو انہیں ایک عظیم طنز نگار شاعر کے طور پر ممتاز کرتی ہے جہاں وہ ہر طبقے، ادارے، اور فرد کی خامیوں کو کھل کر بیان کرتے ہیں اور سماج میں چھپی ہوئی بے اعتدالیاں ان کی شاعری کا مرکزی موضوع ہیں۔ ملاحظہ فرمائیے شاد عارفی کے چند اشعار ۔

یہی ہے شاؔد میں سب سے بڑا عیب — وہی لکھتا ہے جو کچھ دیکھتا ہے

اُس نے جب سَو تیر چلائے — میں نے ایک غزل چپکا دی

اصطلاحاً بُرے کو بھلا کہہ دیا — یعنی گالی نہ دی رہ نما کہہ دیا

پئے تحسینِ وطن، طنز ہمارا فن ہے — ہم کسی خانہ بر انداز سے ڈرتے ہی نہیں

ہم سے اِس طرح کی اُمّید نہ رکھے دنیا — ہم کسی شخص کی تعریف تو کرتے ہی نہیں

امیر جعفری اور رضا نقوی واہی نے بھی اپنی شگفتہ اور طنزیہ شاعری سے قارئین کو نہ صرف محظوظ کیا بلکہ انہیں سوچنے پر مجبور بھی کیا۔ یہ شعرا اپنی طنزیہ و مزاحیہ شاعری کے ذریعے اُردو ادب کے افق پر جگمگاتے ستارے بنے اور انہوں نے اس صنف کو ادب میں ایک منفرد اور اہم مقام دلانے میں نمایاں کردار ادا کیا۔ ان کی شاعری نہ صرف ادب کے قارئین کو ہنسی اور خوشی فراہم کرتی ہے بلکہ ان کے اشعار میں چھپے گہرے پیغامات سامعین کو اپنی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر غور کرنے کی دعوت بھی دیتے ہیں۔ یوں ان شعرا کی کاوشوں نے طنزیہ و مزاحیہ شاعری کو ایک قابلِ قدر صنف بنا دیا جو آج بھی اردو ادب کے قارئین کے دلوں کو لبھاتی ہے۔

تخلص بھوپالی نے بھی اُردو طنز و مزاح کو اپنے منفرد اسلوب سے مالا مال کیا۔ اس دور کے دیگر اہم قلمکاروں میں امتیاز علی تاج، انجم مان پوری، وجاہت علی سندیلوی، کرشن چندر، کنہیا لال کپور اور فکر تونسوی جیسے نام بھی شامل ہیں جنھوں نے اُردو ادب میں طنز و مزاح کو مزید تقویت بخشی۔ امتیاز علی تاج نے اپنی تخلیقات میں مزاح کو گہرائی اور شائستگی کے ساتھ پیش کیا جب کہ عظیم بیگ چغتائی نے اپنی شگفتہ اور رنگین تحریروں سے قارئین کو محظوظ کیا۔

موجودہ دور کے ممتاز اور نمایاں طنز و مزاح نگاروں میں کئی اہم شخصیات شامل ہیں جنہوں نے اپنی تخلیقی صلاحیتوں اور منفرد اسلوب کے ذریعے اردو ادب میں طنز و مزاح کو ایک نیا معیار بخشا ہے۔ ان شخصیات میں ابن انشاء، کرنل محمد خان، مشفق خواجہ، مشتاق احمد یوسفی، یوسف ناظم، شفیقہ فرحت، احمد جمال پاشا، اور مجتبیٰ حسین کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان تمام قلمکاروں کی مشترکہ کاوشوں نے اُردو طنز و مزاح کو ایک مضبوط بنیاد فراہم کی ہے اور ان کی تخلیقات آج بھی اُردو ادب میں ایک اہم مقام رکھتی ہیں۔ ان کی تحریریں نہ صرف مزاحیہ ادب کی زینت ہیں بلکہ زندگی کے مختلف پہلوؤں کو خوب صورتی اور گہرائی سے اُجاگر کرنے کا بہترین ذریعہ بھی ہیں۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:۔

﴿۵۱﴾ عظیم بیگ چغتائی کی تحریروں کا موضوع کیا تھا؟

﴿۵۲﴾ پطرس بخاری کی مشہور تحریریں کون سی ہیں؟

﴿۵۳﴾ رشید احمد صدیقی کے طنز کی خاصیت کیا ہے؟

﴿۵۴﴾ رشید احمد صدیقی کے مشہور مضامین کون سے ہیں؟

﴿۵۵﴾ رشید احمد صدیقی کی تحریریں عام فہم کیوں نہیں؟

﴿۵۶﴾ علامہ اقبالؔ کی ابتدائی شاعری میں کس عنصر کی جھلک ملتی ہے؟

﴿۵۷﴾ اقبالؔ کی طنزیہ شاعری کا بنیادی مقصد کیا ہے؟

﴿۵۸﴾ اقبالؔ کی طنز کا پہلا نمایاں نشانہ کون سی تہذیب ہے؟

﴿۵۹﴾ اقبالؔ کی طنز کا مقصد کیا ہے؟

﴿۶۰﴾ اقبالؔ کی ظرافت کا دیرپا اثر کیوں ہے؟

﴿۶۱﴾ دلاور فگار کو اُردو ادب میں کس لقب سے یاد کیا جاتا ہے؟

﴿۶۲﴾ دلاور فگار کس طرز کی شاعری کے لئے مشہور ہیں؟

09.07 خلاصہ

طنز اور مزاح کا آپس میں گہرا تعلق تحریر کو متوازن اور مؤثر بنانے میں مدد دیتا ہے۔ طنز کی شدت کو نرم کرنے کے لئے اس میں مزاح شامل کیا جاتا ہے تاکہ تلخ حقائق قاری کے لئے قابل قبول بن سکیں۔ صرف طنز یا محض مزاح پر مبنی تحریر اکثر یا تو غیر دلچسپ یا سطحی لگ سکتی ہے، اس لئے دونوں کا امتزاج تحریر کو پرکشش اور بامقصد بناتا ہے۔ طنز و مزاح ادب کی وہ جہت ہے جو نہ صرف قاری کو محظوظ کرتی ہے بلکہ گہرے سماجی اور اخلاقی پیغامات پر غور کرنے کی دعوت بھی دیتی ہے جیسا کہ ہمارے ادب کے کئی مشہور ادیبوں نے مؤثر انداز میں پیش کیا ہے۔

طنز و مزاح کا مقصد صرف محظوظ کرنا نہیں بلکہ معاشرتی اصلاح اور سوچ میں تبدیلی بھی ہے۔ اُردو ادب میں طنز و مزاح کی روایت ابتدا سے موجود ہے جہاں ادیبوں اور شاعروں نے سماجی برائیوں، تضادات اور فرسودہ روایات کو اپنے انداز میں نشانہ بنایا۔ امیر خسروؔ کی کہہ مکرنیاں اور قلی قطب شاہ و ولی دکنی کی تخلیقات اس کی ابتدائی جھلک پیش کرتی ہیں۔ اٹھارویں صدی میں جعفر زٹلی نے طنز و مزاح کو جرأت مندی سے سماجی و سیاسی مسائل کے بیان کا ذریعہ بنایا۔ ان کی شاعری میں دہلی کی تباہی، عوامی مسائل اور سماجی زوال کو بے مثال انداز میں پیش کیا گیا۔ جعفر زٹلی نے روایتی شاعری سے انحراف کرتے ہوئے عوامی مسائل اور برائیوں کو جرأت مندانہ لہجے میں اُجاگر کیا جس سے طنز و مزاح کو اصلاح کا ایک مؤثر ذریعہ بنایا۔

اُردو ادب میں طنز و مزاح نے معاشرتی اصلاح کا اہم کردار ادا کیا۔ مرزا رفیع سوداؔ نے اپنی ہجویہ شاعری میں سیاسی و سماجی انتشار اور اخلاقی زوال پر گہری تنقید کی جب کہ اصلاح کا پہلو بھی نمایاں رکھا۔ نظیرؔ اکبرآبادی نے عوامی زندگی کے مسائل اور رویوں کو طنزیہ انداز میں پیش کیا خاص طور پر نظم ''شہر آشوب'' میں آگرہ کی تباہی اور مختلف طبقات کی مشکلات کو مؤثر انداز میں بیان کیا۔ ان کی نظم ''روٹیاں'' رزق کی اہمیت اور مفلسی کے اثرات کو اجاگر کرتی ہے۔ انشاء اللہ خان انشاؔ نے بھی طنز و مزاح کے ذریعے سماجی اور اخلاقی مسائل کو منفرد انداز میں اجاگر کیا۔ یوں اُردو ادب میں طنز و مزاح کو ایک مؤثر بنیاد فراہم ہوئی۔

مرزا غالبؔ کی شاعری اور خطوط طنز وظرافت کے بہترین نمونے ہیں جہاں انہوں نے دوسروں کے ساتھ خود کا بھی مذاق اڑایا۔ زندگی کے مصائب اور تلخیوں کو غالبؔ نے طنزیہ انداز میں پیش کیا جس سے ان کی تحریروں میں گہرائی اور معنویت پیدا ہوئی۔ ان کے فارسی خطوط میں یہ عنصر کم تھا لیکن اُردو خطوط میں یہ نمایاں ہو گیا۔ غالبؔ نے طنز و مزاح کو نہ صرف اپنی مشکلات کا سامنا کرنے کا ذریعہ بنایا بلکہ اسے اپنے اردگرد کے حالات پر گہری نظر ڈالنے کے لئے استعمال کیا۔ ان کے خطوط میں اپنے دکھوں کو لطیف اور دل چسپ انداز میں پیش کرنے کی مہارت ان کی شخصیت اور فن کی انفرادیت کو اجاگر کرتی ہے جو قاری کو متاثر اور محظوظ دونوں کرتی ہے۔

طنز و مزاح نگار سماج کی خامیوں اور تضادات پر گہری نظر ڈال کر اپنی تحریر کے ذریعے ان مسائل کو اُجاگر کرتا ہے۔ اس کا مقصد نہ صرف ان برائیوں کی نشان دہی بلکہ انسانی اقدار کو فروغ دینا اور قاری کو سوچنے پر مجبور کرنا ہوتا ہے۔ مزاح کی دل چسپی قاری کو اپنی کمزوریوں پر ہنسنے اور اصلاح کی ترغیب دیتی ہے۔ رسالہ ''اودھ پنچ'' جو 1877ء میں منشی سجاد حسین نے لکھنؤ سے شروع کیا، اُردو ادب میں طنز و مزاح کا اہم ستون ثابت ہوا۔ یہ سیاسی و سماجی مسائل کو ظریفانہ انداز میں پیش کرتا تھا۔ مرزا مرتضیٰ مچھو بیگ عاشق سمیت مشہور ادیبوں نے اس رسالے میں اپنی تحریروں کے ذریعے مغرب پرستی، فیشن پسندی اور معاشرتی زوال جیسے موضوعات پر تنقید کی۔ ان تحریروں نے نہ صرف قاری کو محظوظ کیا بلکہ معاشرتی اصلاح کا اہم ذریعہ بھی بنیں۔

''اودھ اخبار'' اُردو ادب میں طنز و مزاح کے فروغ میں اہم کردار ادا کرنے والا ایک نمایاں اور باوقار اخبار تھا۔ منشی نول کشور نے اسے 1858ء میں جاری کیا جو اُردو صحافت میں ایک تاریخی سنگِ میل ثابت ہوا۔ اس اخبار نے نہ صرف زبان و ادب کو ترقی دی بلکہ گنگا جمنی تہذیب کو بھی فروغ دیا۔ یہ اخبار طنزیہ اور مزاحیہ تحریروں کے لئے بھی مشہور تھا۔ پنڈت رتن ناتھ سرشار کا ناول ''فسانہ آزاد'' اسی میں قسط وار شائع ہوا جس کا کردار ''خوجی'' اُردو ادب کے مقبول مزاحیہ کرداروں میں شمار ہوتا ہے۔ سرشار نے لکھنؤ کی زوال پذیر معاشرت، مذہبی رسومات، معلمین کی نااہلی، اور نوابوں کی بےعملی پر نرم مگر مؤثر طنز کیا۔ ان کی تحریریں ظاہری طور پر مزاحیہ لگتی ہیں لیکن ان میں پوشیدہ طنز اس وقت کی سماجی برائیوں کو اجاگر کرنے کا بہترین ذریعہ ثابت ہوا۔

''اودھ پنچ'' ایک اہم ادبی اور صحافتی رسالہ تھا جو سماجی و سیاسی اصلاح کا علمبردار رہا۔ یہ ہندو مسلم اتحاد، انڈین نیشنل کانگریس کی حمایت اور مشرقی روایات کے تحفظ کے لئے مؤثر آواز بن کر ابھرا۔ اس کے ادیبوں نے طنز و مزاح کے ذریعے اس دَور کے مسائل اور تضادات کو اجاگر کیا اور فکری تحریک پیدا کی جس سے یہ رسالہ اُردو صحافت کا نمایاں حصّہ بن گیا۔ رسالہ 36 سال تک مقبول رہا لیکن 1912 میں منشی سجاد حسین کی زندگی میں بند ہو گیا۔ 1914 میں حکیم ممتاز حسین عثمانی نے اسے بحال کیا لیکن وہ دوبارہ اپنی پرانی عظمت حاصل نہ کر سکا۔ 1933 میں ان کے صاحب زادے کی موت کے بعد اشاعت ہمیشہ کے لئے ختم ہو گئی۔ ابتدائی دور میں ''اودھ پنچ'' کے مضامین شائستگی اور اصلاحی پہلو کے حامل تھے لیکن بعد کے ادوار میں معیار متاثر ہوا اور تحریروں میں رکاکت اور ذاتیات پر حملے شامل ہونے لگے۔ اس کے باوجود رسالے کی خدمات آج بھی اُردو طنز و مزاح کی تاریخ میں یاد کی جاتی ہیں۔ ''اودھ پنچ'' کے نمایاں طنزیہ شعرا میں اکبرالٰہ آبادی کا نام سرِ فہرست ہے۔ وہ اپنے تیکھے طنز، شائستہ مزاح اور منفرد اسلوب کے ذریعے سرسید احمد خان اور مغربی تہذیب پر گہری تنقید کرتے تھے۔ ان کی شاعری انگریزی تعلیم، فیشن، اور طرزِ زندگی کو ہدفِ طنز بناتے ہوئے مشرقی روایات کی برتری اجاگر کرتی تھی۔ اکبرؔ کے اشعار میں سماجی تضادات اور انسانی کمزوریوں پر دل کش انداز میں طنز کیا گیا ہے جو قاری کو ہنسنے، مسکرانے اور غور و فکر پر مجبور کر دیتا ہے۔ ان کی شاعری نہ صرف تفریح فراہم کرتی

ہے بلکہ قاری کے دل میں اپنی خامیوں کا احساس اور معاشرتی رویوں پر تنقیدی نظر پیدا کرتی ہے۔ یہ خصوصیات انہیں اُردو ادب کے منفرد اور بلند پایہ مزاحیہ شعرا میں شامل کرتی ہیں۔

علامہ اقبالؔ نے اپنی ابتدائی شاعری میں طنزیہ و مزاحیہ انداز کو سماجی اور انسانی مسائل پر روشنی ڈالنے کا ذریعہ بنایا۔ ان کی طنز نہ صرف ہلکی پھلکی بلکہ گہری فکر اور معنویت سے بھرپور تھی جو قاری کو نہ صرف مسکرانے بلکہ اپنی حالت و معاشرتی رویوں پر غور کرنے کی دعوت دیتی تھی۔ علامہ اقبالؔ نے مغربی تہذیب کی چمک دمک اور مادی ترقی کو تنقید کا نشانہ بنایا۔ اسے اخلاقی و روحانی سطح پر کمزور قرار دیا اور قاری کو اس کی اندھی تقلید سے بچنے کی تنبیہ کی۔ ان کی طنز کا مقصد اصلاح اور فکری بیداری تھا جو دیرپا اثرات چھوڑتی ہے۔ اقبالؔ کے بعد اُردو ادب میں طنزیہ و مزاحیہ شاعری کو شعرا جیسے راجا مہدی علی خان، دلاور فگار، شاد عارفی، امیر جعفری اور رضا نقوی واہی نے مزید نکھارا۔ انہوں نے طنز و مزاح کو تفریح کے ساتھ ساتھ سماجی مسائل اور سیاسی ناانصافیوں پر تنقید کا ذریعہ بنایا۔ راجا مہدی علی خان نے اپنی شاعری میں مزاح کے ذریعے زندگی کے مختلف پہلوؤں کو دل کش انداز میں پیش کیا۔

امیر جعفری اور رضا نقوی واہی نے اپنی طنزیہ اور مزاحیہ شاعری سے نہ صرف قارئین کو محظوظ کیا بلکہ انہیں معاشرتی مسائل پر سوچنے کی دعوت بھی دی۔ ان شعرا نے طنز و مزاح کو ادب میں اہم مقام دلایا۔ اردو نثر میں بھی کئی ادیبوں نے طنز و مزاح کو نیا عروج دیا جیسے پطرس بخاری، رشید احمد صدیقی اور تخلص بھوپالی نے اپنے منفرد اسلوب سے اس صنف کو معیاری بنایا۔ رشید احمد صدیقی نے طنز کو ایک مہذب اور بامقصد اظہار بنایا اور اس کے ذریعے معاشرتی اصلاح کی کوشش کی۔ دیگر قلم کار جیسے امتیاز علی تاج، عظیم بیگ چغتائی اور کرشن چندر نے بھی طنز و مزاح کو سماجی مسائل پر روشنی ڈالنے کا ذریعہ بنایا۔ موجودہ دور میں ابن انشاء، مشتاق احمد یوسفی، اور مجتبیٰ حسین نے طنز و مزاح کو ایک نیا معیار بخشا ہے اور ان کی تحریریں آج بھی اُردو ادب میں اہم مقام رکھتی ہیں۔

09.08 فرہنگ

آمیزش	: میل۔شمولیت۔اختلاط۔	عامیانہ	: مقبولِ عام۔رائج۔
اختتام	: خاتمہ۔تمام ہونے کا عمل۔	عزم	: ارادہ۔نیت۔
اسالیب	: طور طریقے۔آداب۔	عکاسی	: تصویر کشی۔کسی حالت یا کیفیت کا ہو بہو اظہار۔
استغراق	: گہری دل چسپی۔کسی فکر خیال یا کام میں غرق ہو کر سب کچھ بھول جانے کی کیفیت۔	عنصر	: جزو۔حصّہ۔
افسردگی	: طبیعت کا مُرجھانا۔بے رونقی۔	فرسودہ	: پرانا۔کہنہ۔
اقتصادی	: کفایت شعاری۔کفایتی۔	فلاح	: کامیابی۔بہتری۔بہبودی۔
امتزاج	: دو یا زیادہ چیزوں کی ترکیب یا آمیزش۔	قارئین	: مطالعہ کرنے والے۔
انتشار	: بے ترتیبی۔	قاصر	: ناچار۔کوتاہی کرنے والا۔
انحراف	: انکار۔	قالب	: سانچہ۔وہ آلہ جس میں کوئی چیز ڈھالیں۔

اوہام : وسوسے۔تخیلات۔

برتری : فضیلت۔بڑائی۔

بروئے کار : عمل میں مشغول۔سرگرم عمل۔

بصیرت : شعور۔سمجھ۔واقفیت۔

بلیغ : فصیح البیان۔

بے اعتدالی : ناانصافی۔غیر معتدل۔

بے لاگ : بے تکلّف۔کسی کی طرف داری کیے بغیر۔

تبسمِ زیرِ لب : ہلکی مسکراہٹ۔

تخلیقی : تخلیق سے منسوب۔کسی نئے تعمیری کام کا وقوع میں لانا۔

ترجمان : نمایندگی کرنے والا۔نمایندہ۔

ترغیب : شوق دلانا۔خواہش پیدا کرنا۔

تصنع : نمود و نمائش۔

تفریح : مسرت۔فرحت۔

تفکر : سوچ بچار۔فکر۔

تکملہ : تکمیل۔پورا کرنا۔

تلخ : بدمزہ۔بے لطف۔

تنقید : پرکھ۔چھان بین۔ایسی رائے جو برُے بھلے یا صحیح اور غلط کی تمیز کرادے۔

توازُن : متناسب برابری یا مساوات وغیرہ۔

توہم پرستی : وہمی۔خلافِ عقل باتوں کو ماننے والا۔

ثقافتی : تہذیب۔

جرأت : حوصلہ۔دلیری۔شجاعت۔ہمت۔

جہت : سمت۔طرف۔

رکاکت : سفلہ پن۔کمینگی۔رذالت۔

روایتی : دستوری۔قدیم۔

کرب : درد۔رنج۔تکلیف۔

کیفیت : حال۔احوال۔حالت جو کسی شے میں ہو۔

لادینیت : مذہب سے کوئی تعلّق نہ ہونا۔

متحرک : حرکت کرنے والا۔چلتا پھرتا۔

متنازعہ : جس کے بارے میں اختلاف یا جھگڑا ہو۔

متوازن : ہم وَار۔

متوجہ : توجہ کرنے والا۔

مثبت : تعمیری۔ٹھوس۔

محتاج : خواہاں۔طلب گار۔خواہش مند۔

محظوظ : مسرور۔لطف اندوز۔جسے لطف حاصل ہو۔

محکومی : غلامی۔

مخالفت : عداوت۔اختلاف۔

مخصوص : خاص۔خصوصی۔جداگانہ۔

مرکزی : وسطی۔مرکز کا۔

مزاحمت : روکنا۔رکاوٹ ڈالنا۔

مستحکم : قائم رہنے والا۔اٹل۔

مشاہدات : غور و خوض۔عینی تجزیہ۔

مصائب : تکلیفیں۔مصیبتیں۔

مضحکہ خیز : ہنسی لانے والی بات۔قابل تمسخر۔

معاشرتی : رہن سہن سے متعلّق۔

مقبول : قبول کیا ہوا۔عام طور پر پسند کیا جانے والا۔

ملتوی : التوا میں ڈالا ہوا۔آئندہ کے لئے ٹالا ہوا۔

منفرد : بے مثل۔

مؤثر : اثر کیا ہوا۔

ناہم وَاری : جس میں نشیب و فراز بہت ہوں۔

نبردآزما : برسرِ پیکار۔لڑنا۔

زاویہ	: نظریہ۔ اندازِ فکر۔	نرم روی	: آہستہ آہستہ چلنے کا عمل۔
ساکھ	: عزّت۔ آبرو۔ وقار۔	نمایاں	: عیاں۔ نمودار۔ ظاہر۔
سکنات	: سکون کے حالات و کوائف۔	نوعیت	: خصوصی فرق۔
شانِ استغنا	: بے نیازی اور بے پروائی کی حالت۔	وسیلہ	: ذریعہ۔
شدّت	: زور۔ کثرت۔	وعظ	: مذہبی تقریر۔ مذہبی نصیحت جو زبانی کی جائے۔
صلاحیت	: لیاقت۔ قابلیت۔		
ضرب	: وار۔	ہم کنار	: بغل گیر۔ ملا ہوا۔ ساتھ۔
طعن و تشنیع	: طنز۔ جلی کٹی بات۔ طعنے۔	ہم وَار	: مسطح۔ جس میں نشیب و فراز نہ ہو۔

09.09 نمونہ امتحانی سوالات

الف: درجِ ذیل سوالوں کے جوابات ۱۰/۱۰ سطروں میں دیجیے:

سوال نمبر ۱ : طنز و مزاح کا بنیادی مقصد کیا ہے؟

سوال نمبر ۲ : جعفر زٹلی کی شاعری کی کیا خصوصیت تھی؟

سوال نمبر ۳ : نظیؔر کی شاعری کا بنیادی مقصد کیا ہے؟

سوال نمبر ۴ : غالبؔ نے طنز و مزاح کو کس مقصد کے لئے اپنایا؟

سوال نمبر ۵ : ''اودھ پنچ'' کا ادبی مقام کیا تھا؟

سوال نمبر ۶ : ''اودھ پنچ'' کا اصلاحی پہلو کیا تھا؟

سوال نمبر ۷ : اکبر الہ آبادی سماجی مسائل کو کیسے پیش کرتے تھے؟

سوال نمبر ۸ : ''اودھ پنچ'' اور اکبر الہ آبادی کا اُردو ادب میں کیا کردار ہے؟

سوال نمبر ۹ : اقبالؔ نے مغربی تہذیب پر کیا تنقید کی؟

سوال نمبر ۱۰ : دلاور فگار کی شاعری کا نمایاں پہلو کیا ہے؟

سوال نمبر ۱۱ : شاد عارفی کی شاعری کا سب سے بڑا امتیاز کیا ہے؟

ب: درجِ ذیل سوالوں کے جوابات ۳۰/۳۰ سطروں میں دیجیے:

سوانمبر ۱ : اُردو کے ابتدائی دور میں طنز و مزاح کی کیا خصوصیت تھی؟ تفصیل سے بیان کیجیے۔

سوال نمبر ۲ : طنز و مزاح کا مقصد سماج میں کیا تبدیلی لانا ہے؟

سوال نمبر ۳ : اُردو شاعری میں طنزیہ و مزاحیہ شاعری کو نیا اعتبار کس نے بخشا؟

سوال نمبر ۴ : اُردو نثر میں طنز و مزاح کو معیاری بنانے والے نمایاں ادیب کون ہیں؟

سوال نمبر۵ : غالبؔ نے طنز و مزاح کا استعمال کس طرح کیا؟

سوال نمبر۶ : اکبرالہ آبادی کی شاعری قارئین پر کیا اثر ڈالتی ہے؟

سوال نمبر۷ : اودھ پنچ کے بعد طنز و مزاح میں کیا تبدیلیاں آئیں؟

سوال نمبر۸ : اقبالؔ کی طنز اور ظرافت کی خصوصیت کیا ہے؟

معروضی سوالات

سوال نمبر۱ : اردو ادب میں طنز و مزاح متعارف کروانے والے پہلے شاعر کون تھے؟

(الف) میر تقی میر (ج) مرزا غالب

(ب) نظیر اکبر آبادی (د) جعفر زٹلی

سوال نمبر۲ : امیر خسرو کے وہ کلام جو مزاح پر مبنی ہیں، کون سے ہیں؟

(الف) قصیدے (ج) غزلیں

(ب) کہہ مکرنیاں اور دو سخنے (د) مثنویاں

سوال نمبر۳ : کس شاعر نے اپنے طنزیہ کلام کے ذریعے مغلیہ سلطنت کے زوال اور سماجی بگاڑ کو اجاگر کیا؟

(الف) مرزا رفیع سودا (ج) میر انیس

(ب) میر درد (د) علامہ اقبال

سوال نمبر۴ : مرزا غالب کے خطوط کس خصوصیت کی وجہ سے مشہور ہیں؟

(الف) رومانوی موضوعات (ج) مذہبی خطبات

(ب) سیاسی گفتگو (د) ظرافت اور مزاح

سوال نمبر۵ : نظیر اکبر آبادی کی شاعری زیادہ تر کس چیز کے لئے مشہور ہے؟

(الف) مذہبی موضوعات (ج) رومانوی شاعری

(ب) طنز و مزاح اور عوامی زندگی کی عکاسی (د) رزمیہ شاعری

سوال نمبر۶ : ''اودھ پنچ'' کا آغاز کب ہوا تھا؟

(الف) 1857ء (ج) 1877ء

(ب) 1912ء (د) 1933ء

سوال نمبر۷ : ''اودھ پنچ'' کے بانی کون تھے؟

(الف) منشی سجاد حسین (ج) نواب سید محمد آزاد

(ب) مرزا محمد مرتضیٰ (د) حکیم ممتاز حسین عثمانی

سوال نمبر۸ : ''اودھ پنچ'' میں سر سید احمد خان کے خلاف کیسا رویہ رکھا گیا؟

(الف) مثبت اور حوصلہ افزا (ج) سخت تنقیدی اور مزاحیہ

(ب) غیر جانب دار (د) محض تعریفی

سوال نمبر۹ : ''اودھ پنچ'' کن موضوعات پر مزاحیہ انداز میں روشنی ڈالتا تھا؟

(الف) مغرب پرستی اور فیشن پسندی (ج) سیاسی بے ترتیبی اور سماجی تضادات

(ب) سامراجی نظام اور تہذیبی زوال (د) سبھی درست ہیں

سوال نمبر۱۰ : ''اودھ پنچ'' میں شامل تحریروں کا انداز کیسا تھا؟

(الف) رکاکت اور ابتذال سے بھرپور (ج) سائنسی تحقیقات پر مبنی

(ب) مہذب اور شائستہ (د) صرف شاعری پر مشتمل

سوال نمبر۱۱ : حکیم ممتاز حسین عثمانی نے ''اودھ پنچ'' کو کب دوبارہ جاری کیا؟

(الف) 1912ء (ج) 1920ء

(ب) 1933ء (د) 1914ء

سوال نمبر۱۲ : ''اودھ پنچ'' کو کس مشہور برطانوی جریدے کی طرز پر بنایا گیا تھا؟

(الف) لندن ٹائمز (ج) لندن پنچ

(ب) برٹش گزٹ (د) دی گارڈین

سوال نمبر۱۳ : وہ کون سے شاعر ہیں جنھوں نے اپنی نظم ''روٹیاں'' کے ذریعے عوامی مسائل کو اجاگر کیا؟

(الف) علامہ اقبال (ج) فیض احمد فیض

(ب) نظیر اکبرآبادی (د) اکبرالہ آبادی

سوال نمبر۱۴ : ''اودھ پنچ'' کا انداز تحریر کیسا تھا؟

(الف) طنزیہ و مزاحیہ (ج) صرف نثری

(ب) خشک اور روایتی (د) سنجیدہ اور فلسفیانہ

معروضی سوالات کے جوابات

جواب نمبر۱ : (د) جعفر زٹلی

جواب نمبر۲ : (ب) کہہ مکرنیاں اور دو سخنے

جواب نمبر۳ : (الف) مرزا رفیع سودا

جواب نمبر۴ : (د) ظرافت اور مزاح

جواب نمبر۸ : (ج) سخت تنقیدی اور مزاحیہ

جواب نمبر۹ : (د) سبھی درست ہیں

جواب نمبر۱۰ : (ب) مہذب اور شائستہ

جواب نمبر۱۱ : (د) 1914ء

جواب نمبر۵	: (ب) طنز و مزاح اور عوامی زندگی کی عکاسی	جواب نمبر۱۲	: (ج) لندن پنچ
جواب نمبر۶	: (ج) 1877ء	جواب نمبر۱۳	: (ب) نظیر اکبر آبادی
جواب نمبر۷	: (الف) منشی سجاد حسین	جواب نمبر۱۴	: (الف) طنزیہ و مزاحیہ

09.10 حوالہ جاتی کتب

۱۔ طنز و مزاح کا تنقیدی جائزہ از خواجہ عبد الغفور

۲۔ طنز و مزاح: تاریخ و تنقید از طاہر تونسوی

۳۔ اُردو ادب میں طنز و مزاح از غلام احمد کاکوروی

۴۔ اُردو ادب میں طنز و مزاح از ڈاکٹر وزیر آغا

۵۔ اُردو ادب میں طنز و مزاح کی روایت از ڈاکٹر خالد محمود

۶۔ فرہنگ فسانۂ آزاد اور اُس کا عمرانی لسانیاتی مطالعہ از ڈاکٹر شریف احمد قریشی

۷۔ اُردو نثر کا فنّی اِرتقا از فرمان فتح پوری

۸۔ اُردو ادب کی تنقیدی تاریخ از سیّد احتشام حُسین

۹۔ ظرافت اور تنقید از احمد جمال پاشا

09.11 اپنے مطالعے کی جانچ کے جوابات

﴿۱﴾ امیر خسروؔ کی تخلیقات میں۔

﴿۲﴾ کہہ مکرنیاں، دوسخنے، اور انمل میں۔

﴿۳﴾ بے ربط اور بے جوڑ الفاظ کا استعمال، جس سے ہنسی مذاق اور چٹکیاں پیدا ہوتی تھیں۔

﴿۴﴾ قلی قطب شاہ اور ولی دکنی

﴿۵﴾ اٹھارویں صدی۔

﴿۶﴾ دہلی کی تباہی اور بربادی کو بے مثال انداز میں پیش کیا۔

﴿۷﴾ سماجی و سیاسی مسائل۔

﴿۸﴾ شہر آشوب

﴿۹﴾ روٹی اور رزق کی اہمیت

﴿۱۰﴾ ذلیل و رسوا کر دیتی ہے

﴿۱۱﴾ طنز و ظرافت کے شان دار نمونے پیش کرتے ہیں۔

﴿۱۲﴾ لطیف، دل چسپ اور خوشگوار تاثر چھوڑنے والا۔

﴿۱۳﴾ منشی نول کشور نے۔

﴿۱۴﴾ 1858ء میں۔

﴿۱۵﴾ ''اودھ اخبار'' نے اردو ادب میں طنزیہ ومزاحیہ ادب کو فروغ دیا اور ''فسانہ آزاد'' جیسے شاہ کار شائع کیے۔

﴿۱۶﴾ ''فسانہ آزاد''

﴿۱۷﴾ آزاد اور خوجی۔

﴿۱۸﴾ قدیم رسم ورواج اور دقیانوسی خیالات کی تصویر کشی۔

﴿۱۹﴾ نئے سماجی شعور اور آزاد خیالی کی۔

﴿۲۰﴾ زوال پذیر تہذیب، اوہام پرستی، اور سماجی برائیاں۔

﴿۲۱﴾ نرم، غیر محسوس لیکن گہرے طنز کے ذریعے معاشرتی برائیوں کو نمایاں کرنا۔

﴿۲۲﴾ ''فسانہ آزاد''۔

﴿۲۳﴾ اوہام پرستی، تعلیمی نااہلی، اور نوابوں کی بے عملی۔

﴿۲۴﴾ آزاد نئے شعور کی نمائندگی کرتے ہیں، خوجی دقیانوسیت کی۔

﴿۲۵﴾ 16 /جنوری 1877ء کو لکھنؤ میں۔

﴿۲۶﴾ منشی سجاد حسین۔

﴿۲۷﴾ سیاست اور سماجی مسائل کو طنز ومزاح کے ذریعے پیش کرنا اور اصلاح کرنا۔

﴿۲۸﴾ مرزا محمد مرتضٰی (ستم ظریف)، اکبر الہ آبادی، پنڈت تربھون ناتھ، اور دیگر۔

﴿۲۹﴾ مغرب پرستی، تہذیبی زوال، سیاسی بے ترتیبی، اور معاشرتی کج روی۔

﴿۳۰﴾ یہ اتحاد کے فروغ اور انڈین نیشنل کانگریس کی حمایت میں پیش پیش تھا۔

﴿۳۱﴾ اودھ پنچ رسالہ 19 /دسمبر 1912 کو بند ہوا۔

﴿۳۲﴾ اودھ پنچ 1914 میں حکیم ممتاز حسین عثمانی نے دوبارہ جاری کیا۔

﴿۳۳﴾ اکبر الہٰ آبادی اودھ پنچ کے اہم طنزیہ شاعر تھے۔

﴿۳۴﴾ سرسید احمد خاں اور ان کی اصلاحی تحریک کی مخالفت۔

﴿۳۵﴾ انگریزی تہذیب اور مغربی ثقافت پر۔

﴿۳۶﴾ گم نامی کو اہمیت دینے یا مواد پر زور دینے کی وجہ سے۔

﴿۳۷﴾ منفرد اسکیچ پر مشتمل، جس میں رسالے کی بنیادی معلومات شامل ہوتیں۔

﴿۳۸﴾ طنز ومزاح اور اصلاحی تبصرے۔

﴿۳۹﴾ سماجی برائیوں پر براہِ راست تنقید کے بجائے ظرافت کے ذریعے اصلاح کرنا۔

﴿۴۰﴾ اکبرالٰہ آبادی نے مغربی تہذیب کی اندھی تقلید پر طنز کیا اور مشرقی اقدار کی اہمیت کو اجاگر کیا۔

﴿۴۱﴾ سماجی اصلاح، عوامی شعور کی بیداری، اور مشرقی تہذیب کی حفاظت۔

﴿۴۲﴾ اکبرالٰہ آبادی طنز و مزاح کو فکری گہرائی اور تہذیبی شعور سے ہم آہنگ کرتے تھے۔

﴿۴۳﴾ اکبرالٰہ آبادی کے اشعار قاری کو اپنی کمزوریوں پر شرمندگی اور خود احتسابی کے لئے آمادہ کرتے ہیں۔

﴿۴۴﴾ اکبرالٰہ آبادی نے مغربی تہذیب کی اندھی تقلید کو طنزیہ انداز میں نشانہ بنایا۔

﴿۴۵﴾ اکبرالٰہ آبادی کی شاعری تفریح کے ساتھ قاری کو غور و فکر اور سماجی مسائل پر سوچنے کی ترغیب دیتی ہے۔

﴿۴۶﴾ اکبرالٰہ آبادی کا انداز نرم، شائستہ، اور دل کش تھا، جو کسی کی انا کو ٹھیس نہیں پہنچاتا تھا۔

﴿۴۷﴾ سماجی برائیاں، انسانی کمزوریاں، اور مغربی تقلیدی رجحانات۔

﴿۴۸﴾ اکبرالٰہ آبادی کے اشعار ایک آئینہ ہیں جو قاری کو اپنی اور معاشرتی خامیوں کا شعور دلاتے ہیں۔

﴿۴۹﴾ اکبرالٰہ آبادی نے طنز و مزاح کو اصلاحِ معاشرہ کا ایک مؤثر ذریعہ بنایا۔

﴿۵۰﴾ اکبرالٰہ آبادی اور ''اودھ پنچ'' نے اردو ادب میں طنز و مزاح کو وسعت دی اور اسے سنجیدہ ادب کا حصہ بنایا۔

﴿۵۱﴾ بیوی اور زن مرید شوہر کے گرد شرارتیں اور روزمرہ زندگی کے لطائف۔

﴿۵۲﴾ ''میں ایک میاں ہوں، کتے، مرید پور کا پیر، سویرے جو آنکھ کھلی''۔

﴿۵۳﴾ شائستگی، سنجیدگی، اور بامقصد طنز، بغیر ہزل یا طعن و تشنیع کے۔

﴿۵۴﴾ ''چارپائی، وکیل، ریل کا سفر، گواہ، ارہر کے کھیت، دیہاتی ڈاکٹر''۔

﴿۵۵﴾ گہرے حوالوں اور لطیف اشارات سے مزین ہوتی ہیں۔

﴿۵۶﴾ ہلکے پھلکے طنز اور شگفتگی۔

﴿۵۷﴾ قاری کو سوچنے، سمجھنے، اور خود کو بہتر بنانے پر آمادہ کرنا۔

﴿۵۸﴾ مغربی تہذیب۔

﴿۵۹﴾ اصلاح اور روحانی و اخلاقی ترقی کی طرف رہنمائی۔

﴿۶۰﴾ اس کے پیچھے گہرے خیالات اور شعور اجاگر کرنے کا پہلو موجود ہے۔

﴿۶۱﴾ پیروڈی کا بادشاہ۔

﴿۶۲﴾ غزلوں اور نظموں کی شان دار پیروڈی۔

✲

اکائی 10 اکبرالٰہ آبادی کی طنزیہ و مزاحیہ شاعری

ساخت

10.01 : اغراض و مقاصد

10.02 : تمہید

10.03 : اکبرالٰہ آبادی کے حالاتِ زندگی

10.04 : اکبرالٰہ آبادی کی شاعری

10.05 : اکبرالٰہ آبادی کی طنزیہ و مزاحیہ شاعری

10.06 : خلاصہ

10.07 : فرہنگ

10.08 : نمونہ امتحانی سوالات

10.09 : حوالہ جاتی کتب

10.01 اغراض و مقاصد

اِس اکائی میں اکبرالٰہ آبادی کے حالاتِ زندگی اور اُن کی طنزیہ و مزاحیہ شاعری کی ایک جھلک پیش کی گئی ہے، اُن کی شعری خوبیوں کو اُجاگر کیا گیا ہے تاکہ آپ اُن کی شاعری کے اُسلوب اور لب و لہجے سے اچھی طرح واقف ہوسکیں۔ ساتھ ہی ساتھ یہ بھی جان سکیں کہ اکبر الٰہ آبادی نے اپنی شاعری کو قوم و ملک کے حق میں کس طرح استعمال کیا۔ آخر میں اکائی کا خلاصہ، مشکل الفاظ کے معانی، امتحان میں پوچھے جانے والے سوالات کے نمونے، حوالہ جاتی کتب اور معروضی و غیر معروضی سوالات و جوابات بھی دیے گئے ہیں تاکہ آپ امتحان کی مشق بھی کر تے رہیں۔

10.02 تمہید

اکبرالٰہ آبادی ہندوستانی زبان و تہذیب کے بڑے مضبوط اور دلیر شاعر تھے۔ اُن کے کلام میں شمالی ہندوستان میں رہنے بسنے والے لوگوں کی ذہنی و اخلاقی قدروں، تہذیبی کارناموں، سیاسی تحریکوں اور حکومتی کارروائیوں کے بھرپور سراغ ملتے ہیں۔ اکبر الٰہ ابادی کی شاعری زمانے اور زندگی کا آئینہ ہے۔ اُن کا اندازِ بیان کہیں قلندرانہ، کہیں شاعرانہ، کہیں تراش خراش کے ساتھ، کہیں سادہ، کہیں روایتی اور کہیں جدت پسندانہ اور انقلابی ہے۔ وہ روایتی ہوتے ہوئے بھی باغی تھے اور باغی ہوتے ہوئے بھی اصلاحی۔

اکبرالٰہ ابادی شاعر تھے، شور نہیں مچاتے تھے۔ عوام و خواص دونوں اُن کو اپنا شاعر سمجھتے تھے۔ اُن کی شاعری دونوں کے ذوق کو سیراب کرتی ہے۔ اُن کا کلام مکمل اُردو زبان کا کلام ہے۔ انہوں نے نظیرؔ اکبرآبادی، میر تقی میرؔ اور میر انیسؔ کے بعد سب سے زیادہ اُردو زبان کے الفاظ استعمال کیے۔ وہ نہ تو مغرب سے مرعوب ہوئے، نہ انگریز حاکموں کی پروا کی اور نہ ہی سیاسی لیڈروں کو خاطر میں لائے۔ اُنہوں نے

اُردو شاعری میں انگریزی زبان کے الفاظ اِس مہارت اور چابک دستی سے استعمال کیے ہیں کہ بے اختیار زبان سے ''واہ واہ'' کی صدا بلند ہوتی ہے۔ اُن کے زمانے میں کوئی بھی شخص ایسا نہ تھا جس نے انگریزی حکومت کا ملازم ہوتے ہوئے انگریزی حکومت کی ایسی خبر لی ہو جیسی خبر اُنہوں نے لی۔

10.03 اکبرالہ آبادی کے حالاتِ زندگی

سید اکبر حسین، اکبرالہ ابادی ۱۶/نومبر ۱۸۴۶ء کو ضلع الہ اباد کے قصبے ''بارہ'' میں پیدا ہوئے۔ اُن کے والد ''سید تفضّل حسین'' نائب تحصیل دار تھے۔ اکبر کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔ آٹھ، نو برس کی عمر میں اُنہوں نے فارسی اور عربی کی درسی کتابیں پڑھ لیں۔ پھر اُن کا داخلہ مشن اسکول میں کرایا گیا لیکن گھر کے مالی حالات اچھے نہ ہونے کی وجہ سے اُن کو تعلیم چھوڑ کر پندرہ سال ہی کی عمر میں ملازمت کرنی پڑی۔ اُسی کم عمری میں اُن کی شادی بھی ''خدیجہ خاتون'' نام کی ایک دیہاتی لڑکی سے ہوگئی لیکن بیوی اُن کو پسند نہیں آئی۔ اُسی عمر میں اُنہوں نے الہ اباد کے طوائفوں کے کوٹھوں کے چکر لگانے شروع کر دیے۔ الہ آباد کی شاید ہی کوئی خوب صورت اور خوش گلو طوائف ہو جس کے پاس وہ نہ گئے ہوں۔ اُنہوں نے ایک طوائف ''بوٹا جان'' سے شادی بھی کی لیکن اُس کا جلد ہی انتقال ہو گیا جس کا اُنہیں بہت صدمہ ہوا۔

اکبرالہ ابادی نے کچھ دنوں تک ریلوے کے ایک ٹھیکے دار کے پاس ۲۰/روپے ماہ وار پر ملازمت کی پھر کچھ دنوں بعد وہ کام ختم ہو گیا۔ اُسی زمانے میں اُنہوں نے انگریزی زبان میں مہارت حاصل کی اور ۱۸۶۷ء میں وکالت کا امتحان پاس کیا۔ اُنہوں نے تین سال تک وکالت کی جس کے بعد وہ ہائی کورٹ کے ''مسل خواں'' بن گئے۔ اس عرصے میں اُنہوں نے ججوں وکیلوں اور عدالت کی کارروائیوں کو گہرائی کے ساتھ سمجھا۔ ۱۸۷۳ء میں اُنہوں نے ہائی کورٹ کی وکالت کا امتحان پاس کیا اور تھوڑے ہی عرصے میں اُن کی تقرری ''منصف'' کے عہدہ پر ہو گیا۔ اُسی زمانے میں اُن کو شیعہ گھرانے کی ایک لڑکی ''فاطمہ صغریٰ'' پسند آ گئی جس سے اُنہوں نے شادی کر لی اور پہلی بیوی کو الگ کر دیا لیکن اُس کو معمولی خرچ دیتے رہے۔ پہلی بیوی سے اُن کے دو بیٹے تھے لیکن اُن کی تعلیم و تربیت کی اُنہوں نے کوئی پروا نہیں کی۔ اُنہوں نے بڑی عسرت میں زندگی گزاری۔ ایک بیٹا تو باپ سے ملنے کی آرزو لیے دنیا سے چلا گیا لیکن وہ اُسے دیکھنے نہیں گئے۔

۱۸۸۸ء میں اُنہوں نے ''سب آرڈینیٹ جج'' اور پھر خفیفہ عدالت کے جج کے عہدے پر ترقی پائی اور علی گڑھ سمیت مختلف مقامات پر اُن کے تبادلے ہوتے رہے۔ ۱۹۰۵ء میں وہ ''سیشن جج'' کے عہدے سے ریٹائر ہوئے اور باقی زندگی الہ اباد میں گزاری۔ ریٹائرمنٹ کے بعد اُن کی دوسری بیوی زیادہ دن زندہ نہیں رہ سکی۔ اکبر اس صدمے سے سنبھل نہیں پائے تھے کہ دوسرے بیوی کے بطن سے پیدا ہونے والا اُن کا جواں سال بیٹا، جس سے اُن کو بہت محبت تھی، چل بسا۔ ان صدمات نے اُن کو پوری طرح توڑ کر رکھ دیا اور وہ مسلسل بیمار رہنے لگے۔ فاطمہ صغریٰ سے اپنے دوسرے بیٹے ''عشرت حسین'' کو اُنہوں نے لندن بھیج کر تعلیم دلوائی۔ پہلی بیوی ''خدیجہ خاتون'' ۱۹۲۰ء تک زندہ رہی لیکن اکبر الہ آبادی نے اُن کو ''عشرت منزل'' میں قدم رکھنے کی کبھی اجازت نہیں دی۔ ۱۹۰۷ء میں حکومت نے اکبر کو ''خان بہادر'' کا خطاب دیا اور اُن کو الہ آباد یونی وَرسٹی کا فیلو بھی بنایا گیا۔ اُنہوں نے ۹/ستمبر ۱۹۲۱ء میں وفات پائی۔

10.04 اکبرؔ الہ آبادی کی شاعری

شاعری میں اکبرؔ الہ آبادی نے وحیدؔ الہ آبادی سے اصلاح لی۔ اکبرؔ الہ آبادی اور شاہ اکبرؔ داناپوری دونوں ہم سبق تھے، ایک ہی استاد نے وحیدؔ الہ آبادی کے شاگرد اور ایک ہی پیر حضرت مولانا شاہ قاسم ابوالعلائی داناپوری کے مُرید تھے۔ شاہ اکبر داناپوری نے اپنی ایک رباعی میں اِس بات کا ذکر بھی کیا ہے:

شاگرد وَحیدؔ کے ہیں دونوں اکبر ہم مشق بھی دونوں رہے ہیں اکثر
لیکن قدرت کا صاد اُن پر ہی ہوا پتھر پتھر ہے اور جوہر جوہر!

اکبرؔ الہ آبادی کو فقط ''شاعرِ طنز و مزاح'' قرار دے دینا یا اُن کی شاعری کو صرف ''طنزیہ و مزاحیہ شاعری'' سمجھ لینا اکبرؔ الہ آبادی اور اُردو شاعری دونوں کے ساتھ سراسر ناانصافی ہے کیوں کہ اُنہوں نے غزل، قطعہ، رباعی اور نظم کی شکل میں اچھا خاصا کلام یادگار چھوڑا ہے۔ اُنہوں نے غزل کی روایتی صنف میں انقلابی تجربے کیے، ''معریٰ نظم'' میں طبع آزمائی کی اور اپنے عہد کے دوسرے شاعروں سے بہترین ''آزاد نظمیں'' کہیں۔ اِس سلسلے میں اُن کی نظم ''ایک کیڑا'' کافی اہمیت کی حامل ہے۔ اُن کی نظموں میں تنوع اور فن کاری کی جو آمیزش ہے وہ اقبالؔ کے سوا اُردو کے کسی دوسرے شاعر کے یہاں نہیں پائی جاتی۔

اکبرؔ الہ آبادی اُردو کے پہلے ایسے شاعر ہیں جنہوں نے اُردو زبان کے عام الفاظ ''اونٹ، گائے، شیخ اور مرزا'' وغیرہ کا علامتی استعمال کیا اور اُردو میں علامتی شاعری کی راہ ہموار کی۔ ادبی ذوق رکھنے والوں کے لئے اُن کے کلام میں خوش فکری، بذلہ سنجی، زبان و بیان پر قدرت اور صنائعِ لفظی و معنوی سب کچھ موجود ہے۔ غور و فکر کرنے والوں کے لئے اُنہوں نے معاشرت اور تمدن کی پیچیدگیوں اور فلسفہ جسم و روح کی حقیقتوں سے پردہ اُٹھایا ہے اور سیاست دانوں کو تو اُنہوں نے اُن کا اصل چہرہ دِکھایا ہے۔ اکبرؔ الہ آبادی اُردو کے پہلے ایسے شاعر ہیں جن کے یہاں عورت کبھی فرنگی نازنینوں اور کبھی تھیٹر والیوں کی شکل میں اپنے پورے وجود کے ساتھ نظر آتی ہے جو اُردو شاعری کی روایتی محبوباؤں سے بالکل مختلف ہے۔ عشق و رومان کے مقابلے میں بصری لطف اَندوزی کا جو انداز اُن کے یہاں ملتا ہے وہ اُردو شاعری میں ایک انوکھی چیز اور اپنی مثال آپ ہے۔ وہ اُردو کے پہلے ایسے شاعر ہیں جن کا دل تو بہتوں پر آتا ہے لیکن اُن کی اصل محبوبہ ایک شادی شدہ عورت ہے جو اُن کی اپنی بیوی ہے:

مِرا جس پارسی لیڈی پہ دل آیا ہے اے اکبرؔ!
جو سچ پوچھو تو حُسنِ ممبئی ہے اُس کی صورت سے

اکبرؔ الہ آبادی نے طنز و مزاح کے شاعر کی حیثیت سے اِس حد تک شہرت و مقبولیت حاصل کی کہ اُن کی سنجیدہ شاعری ایک دُھندلی سی تصویر بن کر رہ گئی۔ اگر اُن کی شاعری کا بہ غور مطالعہ کیا جائے تو اُن کا سنجیدہ کلام اُسلوب اور معنی دونوں اعتبار سے ایک منفرد رنگ رکھتا ہے۔ اُن کی غزلوں میں اعلیٰ درجے کا تغزل موجود ہے:

دل میں سوزش ہے ، آنکھ میں آنسو
عشق ہے کھیل ، آگ پانی کا

دل مِرا جس سے بہلتا کوئی ایسا نہ ملا
بُت کے بندے ملے، اللہ کا بندہ نہ ملا

درد کی دھیمی دھیمی کسک دیکھنی ہو تو اِس قسم کے اشعار دیکھیے:

موت آئی عشق میں تو ہمیں نیند آ گئی
نکلی بدن سے جان تو کانٹا نکل گیا

☆

زخمی نہ ہوا تھا دل اَیسا ، سینے میں کھٹک دن رات نہ تھی
پہلے بھی ہوئے تھے یہ صدمے، روئے تھے مگر یہ بات نہ تھی

اکبر الہ آبادی کی غزلوں کے تین خاص رنگ ہیں۔ پہلا رنگ اُن کی روایتی غزلوں کا ہے جن میں ایک خاص قسم کی گھلاوٹ، زبان کا لطف اور کہیں کہیں مکالماتی فضا ہے:

مَیں حالِ دل تمام شب اُن سے کہا کیا
ہنگامِ صبح کہنے لگے کس اَدا سے ''کیا''؟

☆

تم نے بیمارِ محبت کو ابھی کیا دیکھا
جو یہ کہتے ہوئے جاتے ہو کہ'' دیکھا، دیکھا''

☆

جب کہا مَیں نے کہ پیار آتا ہے مجھ کو تم پر
ہنس کے کہنے لگا: اور آپ کو آتا کیا ہے؟

دوسرا رنگ اُن غزلیات کا ہے جن میں اعلیٰ درجے کا تغزل اور برجستگی ہے۔ یہ غزلیں اُردو غزل کے انتخاب میں نمایاں مقام کی حق دار ہیں۔ اگر اکبر الہ آبادی نے اپنی شاعری کا دائرہ صرف غزل تک محدود رکھا ہوتا تو آج اُن کا شمار اُردو کے نمائندہ غزل گو شاعروں میں کیا جاتا:

ہم آہ بھی کرتے ہیں تو ہو جاتے ہیں بدنام
وہ قتل بھی کرتے ہیں تو چرچا نہیں ہوتا

☆

دنیا میں ہوں ، دنیا کا طلب گار نہیں
بازار سے گزرا ہوں ، خریدار نہیں ہوں

☆

لوگ کہتے ہیں : بدلتا ہے زمانہ سب کو
مَرد وہ ہیں جو زمانے کو بدل دیتے ہیں

☆

ہنگامہ ہے کیوں برپا؟ تھوڑی سی جو پی لی ہے
ڈاکا تو نہیں مارا، چوری تو نہیں کی ہے!

☆

الٰہی! کیسی کیسی صورتیں تُو نے بنائی ہیں
کہ ہرصورت کلیجے سے لگا لینے کے قابل ہے

☆

مرغِ بسمل کی طرح لوٹ گیا دل میرا
نگہِ ناز کی تاثیر بھی کیا ہوتی ہے!

☆

خوش نما چیزیں ہیں بازارِ جہاں میں بے شمار
ایک نقدِ دل سے یا رب! مول کیا کیا لیجیے!

☆

قیس کا ذِکر مِرے شانِ جنوں کے آگے؟
اگلے وقتوں کا کوئی بادیہ پیما ہوگا

☆

عشق نازک مزاج ہے بے حد
عقل کا بوجھ اُٹھا نہیں سکتا

☆

آہ جو دل سے نکالی جائے گی
کیا سمجھتے ہو کہ خالی جائے گی!

تیسرا رنگ اُن غزلوں کا ہے جن میں اُنہوں نے انگریزی زبان کی لفظیات کو خاصی مہارت اور فن کاری کے ساتھ اُردو غزل کے پیکر میں ڈھالا ہے۔ نمونے کے طور پر ایسی غزلوں کے کچھ نمائندہ اشعار بیان کیے جاتے ہیں:

اکؔبر ڈرے نہیں کبھی جرمن کی فوج سے
لیکن شہید ہو گئے بیوی کی نوج سے

یوسف کو نہ سمجھے کہ حسیں بھی ہے، جواں بھی
شاید نرے لیڈر تھے زلیخا کے میاں بھی

☆

لپٹ بھی جا، نہ رُک اکبرؔ غضب کی بیوٹی ہے
نہیں نہیں پہ نہ جا، یہ حیا کی ڈیوٹی ہے

☆

ہم کیا کہیں احباب کیا کارِ نمایاں کر گئے
بی اے ہوئے، نوکر ہوئے، پنشن ملی پھر مر گئے

☆

کوٹ اور پتلون جب پہنا تو مسٹر بن گیا
جب کوئی تقریر کی جلسے میں، لیڈر بن گیا

☆

مَے بھی ہوٹل میں پیو، چندہ بھی دو مسجد میں
شیخ بھی خوش رہیں، شیطان بھی بے زَار نہ ہو

☆

قوم کے غم میں ڈِنر کھاتے ہیں حکام کے ساتھ
رنج لیڈر کو بہت ہے مگر آرام کے ساتھ

☆

لیڈروں کی دھوم ہے اور فالوور کوئی نہیں
سب تو جنرل ہیں یہاں آخر سپاہی کون ہے؟

☆

جب غم ہوا چڑھا لیں دو بوتلیں اکٹھی
ملا کی دوڑ مسجد اکبرؔ کی دوڑ بھٹی

☆

عاشقی کا ہو بُرا، اِس نے بگاڑے سارے کام
ہم تو اے. بی. میں رہے، اغیار بی.اے. ہو گئے

☆

رقیبوں نے رپٹ لکھوائی ہے جا جا کے تھانے میں
ہم تو اے. بی. میں رہے، اغیار بی.اے. ہو گئے

10.05 اکبرالہ آبادی کی طنزیہ و مزاحیہ شاعری

اکبرالہ آبادی کو اُردو شاعری میں طنز و ظرافت کا بادشاہ مانا جاتا ہے۔ اُن سے پہلے اُردو شاعری میں طنز و مزاح، ریختی یا ہجویات کے سوا کوئی دوسری صنفِ شاعری اہمیت اور تسلسل نہیں حاصل کر پائی تھی۔ اُنہوں نے تیزی سے بدلتے ہوئے زمانے کو خبردار کرنے کے لئے طنز و مزاح کی نئی وضع اختیار کی۔ اُن کی ظرافت کا مقصد تفریحِ طبع نہیں بلکہ اُس کا ایک خاص مقصد ہے۔ اُن کی دُور اَندیش نگاہوں نے دیکھا کہ دنیا بڑی تیزی سے بدل رہی ہے اور اس وقت جو طبقہ پیدا ہو رہا ہے اُس کو مغرب پرستی اپنے ساتھ بہائے لیے جا رہی ہے اور لوگ اپنی ہندوستانی اَقدار کو حقارت کی نگاہ سے دیکھنے لگے ہیں۔ اُنہوں نے اپنی شاعری کو ملک و قوم کی خدمت کی طرف موڑتے ہوئے ایک نیا انداز اختیار کیا جس میں بہ ظاہر تمسخر اور ظرافت ہے لیکن اُس کے باطن میں نصیحت اور تنقید ہے۔ وہ اپنی شاعری کو جس رُخ پر لے کر چل رہے تھے اُس کے لئے ضروری تھا کہ لب و لہجہ نیا، دل کش اور دل پذیر ہو۔ یہ ایک ایسے شخص کا کلام ہے جس کے چہرے پر شگفتگی اور تمسخر کے آثار ہیں مگر آواز میں ایک ایسی آنچ ہے جو ظرافت کو پگھلا کر، دل نشین ہونے تک متانت کا درجہ عطا کر دیتی ہے۔

اکبرالہ آبادی کی طنز کا ہدف کوئی فردِ خاص نہیں ہے۔ ہر شخص اولاً یہی سمجھتا ہے کہ طنز کسی اور پر ہے لیکن ہنسنے کے بعد ذرا غور کرنے کے بعد احساس ہوتا ہے کہ اکبر نے ہم سبھی کو مخاطب کیا ہے اور جس کو ہم مذاق سمجھ رہے ہیں اُس کی تہ میں تنقید و نصیحت ہے۔ اپنی بات کو اس نتیجے تک پہنچانے میں اکبر نے بڑی صناعی سے کام لیا ہے۔ اُنہوں نے اُردو شاعری کے تشنۂ اظہار گوشوں کو پُر کیا، اپنے عہد کے تقاضوں کو پورا کیا اور مستقبل کے شاعروں کے لئے نئی راہیں ہموار کیں۔ اُن کی شاعری کی اہمیت اُن کی شاعری کی خوبیوں سے کہیں زیادہ ہے:

حقیقی اور مجازی شاعری میں فرق یہ پایا
کہ وہ جامے سے باہر ہے، یہ پاجامے سے باہر ہے

☆

جو وقتِ ختنہ مَیں چیخا تو نائی نے کہا ہنس کر
مسلمانی میں طاقت خون ہی بہنے سے آتی ہے

☆

اِس قدر تھا کھٹملوں کا چارپائی میں ہجوم
وصل کا دل سے مِرے ارمان رخصت ہو گیا

☆

ہوئے اِس قدر مہذب کبھی گھر کا منہ نہ دیکھا
کٹی عمر ہوٹلوں میں، مَرے اسپتال جا کر

☆

بوٹ ڈاسن نے بنایا، مَیں نے اک مضموں لکھا
ملک میں مضموں نہ پھیلا اور جوتا چل گیا

مولوی صاحب نہ چھوڑیں گے، خدا گو بخش دے
گھیر ہی لیں گے پولس والے ،سزا ہو یا نہ ہو

☆

کیوں سول سرجن کا آنا روکتا ہے ہم نشیں !
اِس میں ہے اک بات آنر کی شفا ہو یا نہ ہو

☆

کچھ الٰہ آباد میں ساماں نہیں بہبود کے
یاں دَھرا کیا ہے بجز اکبر کے اور اَمرود کے

☆

مرعوب ہو گئے ہیں ولایت سے شیخ جی
اب صرف منع کرتے ہیں دیسی شراب کو

☆

اثر یہ تیرے انفاسِ مسیحائی کا ہے اکبر !
الہ آباد سے لنگڑا چلا، لاہور تک پہنچا

☆

پڑ جائیں مِرے جسم پہ لاکھ آبلے اکبر !
پڑھ کر جو کوئی پھونک دے اَپریل ،مئی ، جون

☆

مسجد کا ہے خیال نہ پروائے چرچ ہے
جو کچھ ہے اب تو کالج و ٹیچر میں خرچ ہے

☆

شیخ جی گھر سے نہ نکلے اور مجھ سے کہہ دیا
آپ بی اے پاس ہیں اور بندہ بی بی پاس ہے

☆

باہم شبِ وصال غلط فہمیاں ہوئیں
مجھ کو پری کا شبہ ہوا ، اُن کو بھُوت کا

☆

بتاؤں آپ کو مَرنے کے بعد کیا ہوگا ؟
پلاؤ کھائیں گے احباب، فاتحہ ہوگا

☆

دھمکا کے بوسے لوں گا رخِ رشکِ ماہ کے
چندا وصول ہوتا ہے صاحب دباؤ سے

☆

شیخ صاحب خدا سے ڈرتے ہوں
مَیں تو انگریزوں ہی سے ڈرتا ہوں

اکبرؔالہ آبادی نے صرف غزل ہی میں طنز و مزاح کو جگہ نہیں دی ہے بلکہ قطعہ، رباعی، مثنوی اور نظم میں بھی طنز و مزاح نگاری کے اعلیٰ نمونے پیش کیے ہیں۔ اُن کے دو قطعات پڑھیے:

بے پردہ کل جو آئیں نظر چند بی بیاں
اکبرؔ زمیں میں غیرتِ قومی سے گڑ گیا
پوچھا جو اُن سے آپ کا پردہ وہ کیا ہوا؟
کہنے لگیں کہ عقل پہ مَردوں کی پڑ گیا

☆

چھوڑ لٹریچر کو ، اپنی ہسٹری کو بھول جا
شیخ و مسجد سے تعلق ترک کر ، اِسکول جا
چار دن کی زندگی ہے ، کوفت سے کیا فائدہ؟
کھا ڈبل روٹی ، کلرکی کر ، خوشی سے پھول جا

صنفِ رباعی جس میں عموماً پند و نصیحت، اخلاقی اور تصوفانہ مضامین بیان کیے جاتے ہیں۔ اکبرؔالہ آبادی نے رباعی جیسی صنف میں بھی طنز و مزاح نگاری کے اعلیٰ نمونے پیش کیے ہیں۔ اُن کی دو رباعیاں پڑھیے: طب

اکبر! مجھے شک نہیں تیری تیزی میں
اور تیرے بیان کی دل آویزی میں
شیطاں عربی سے ہند میں ہے بے خوف
لا حول کا ترجمہ کر انگریزی میں

☆

اِسہال نہیں ، گریٹ ہونا اچھا
دل ہونا بُرا ہے ، پیٹ ہونا اچھا
پنڈت ہو کہ مولوی ہو ، دونوں بے کار
انساں کو گریجویٹ ہونا اچھا

آم بھلا کس انسان کو پسند نہیں ہوگا؟ ہندوستان کا ہر باشندہ خواہ وہ شہری ہو یا دیہاتی، آم کو نا پسند نہیں کر سکتا۔ اکبرؔ الہ آبادی کو آم بہت پسند تھے۔ اُنہوں نے اپنے بے تکلف دوست منشی نثار حسین کے نام ایک مزاحیہ نظم ''آم نامہ'' لکھی ہے جو کافی دل چسپ اور معنویت سے بھرپور ہے:

نامہ نہ کوئی یار کا پیغام بھیجئے
اِس فصل میں جو بھیجئے بس آم بھیجئے
ایسا ضرور ہو کہ اُنہیں رکھ کے کھا سکوں
پختہ اگرچہ بیس تو دَس خام بھیجئے
معلوم ہی ہے آپ کو بندے کا اِیڈریس
سیدھے الہ آباد مِرے نام بھیجئے
ایسا نہ ہو کہ آپ یہ لکھیں جواب میں
تعمیل ہوگی ، پہلے مگر دام بھیجئے

اِسی طرح اکبرؔ الہ آبادی نے ایک نظم ''فرضی لطیفہ'' کے نام سے لکھی ہے جس میں ہندوستانی مسلمانوں کی بے علمی، بدحالی اور علمی بے راہ رَوی کو طنز و مزاح کے پیرائے میں بیان کیا ہے:

خدا حافظ مسلمانوں کا اکبرؔ!
مجھے تو اِن کی خوش حالی سے ہے یاس
یہ عاشق شاہدِ مقصود کے ہیں
نہ جائیں گے و لیکن سعی کے پاس
سناؤں تم کو اک فرضی لطیفہ
کیا ہے جس کو مَیں نے زیبِ قرطاس
کہا مجنوں سے یہ لیلیٰ کی ماں نے
کہ بیٹا تو اگر کر لے ایم. اے. پاس

تو فوراً بیاہ دوں لیلیٰ کو تجھ سے
بلا دِقّت مَیں بن جاؤں تری ساس
کہا مجنوں نے: یہ اچھی سنائی
کجا عاشق کجا کالج کی بکواس
کجا یہ فطرتی جوشِ طبیعت
کجا ٹھونسی ہوئی چیزوں کا اِحساس
بڑی بی! آپ کو کیا ہو گیا ہے؟
ہرن پہ لادی جاتی ہے کہیں گھاس؟
یہ اچھی قدر دانی آپ نے کی
مجھے سمجھا ہے کوئی ہرچرن داس؟
دل اپنا خون کرنے کو ہوں موجود
نہیں منظور مغزِ سر کا آماس
یہی ٹھہری جو شرطِ وصلِ لیلیٰ
تو اِستعفیٰ مِرا با حسرت و یاس

☆

10.06 خلاصہ

سید اکبرحسین، اکبرالہ ابادی ۱۶ر نومبر ۱۸۴۶ء کو ضلع الہ آباد کے قصبے ''بارہ'' میں پیدا ہوئے۔ اُن کے والد سید تفضّل حسین نائب تحصیل دار تھے۔ اکبر کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔ آٹھ، نو برس کی عمر میں اُنہوں نے فارسی اور عربی کی درسی کتابیں پڑھ لیں۔ پھر اُن کا داخلہ مشن اسکول میں کرایا گیا لیکن گھر کے مالی حالات اچھے نہ ہونے کی وجہ سے اُن کو تعلیم چھوڑ کر پندرہ سال ہی کی عمر میں ملازمت کرنی پڑی۔ اُسی کم عمری میں اُن کی شادی بھی ''خدیجہ خاتون'' نام کی ایک دیہاتی لڑکی سے ہوگئی لیکن بیوی اُن کو پسند نہیں آئی۔ ۱۹۰۷ء میں حکومت نے اکبر کو ''خان بہادر'' کا خطاب دیا اور اُن کو الہ آباد یونی وَرسٹی کا فیلو بھی بنایا گیا۔ اُنہوں نے ۹ر ستمبر ۱۹۲۱ء میں وفات پائی۔

اکبرالہ آبادی کو فقط ''شاعرِ طنز و مزاح'' قرار دے دینا یا اُن کی شاعری کو صرف ''طنزیہ و مزاحیہ شاعری'' سمجھ لینا اکبرالہ آبادی اور اُردو شاعری دونوں کے ساتھ سراسر نا انصافی ہے کیوں کہ اُنہوں نے غزل، قطعہ، رباعی اور نظم کی شکل میں اچھا خاصا کلام یادگار چھوڑا ہے۔ اُنہوں نے غزل کی روایتی صنف میں انقلابی تجربے کیے، ''معریٰ نظم'' میں طبع آزمائی کی اور اپنے عہد کے دوسرے شاعروں سے بہترین ''آزاد نظمیں'' کہیں۔ اِس سلسلے میں اُن کی نظم ''ایک کیڑا'' کافی اہمیت کی حامل ہے۔ اُن کی نظموں میں تنوع اور فن کاری کی جو آمیزش ہے وہ اقبالؔ کے سوا اُردو کے کسی دوسرے شاعر کے یہاں نہیں پائی جاتی۔

اکبرالہ آبادی اُردو کے پہلے ایسے شاعر ہیں جنہوں نے اُردو زبان کے عام الفاظ’’ اونٹ، گائے، شیخ اور مرزا‘‘ وغیرہ کا علامتی استعمال کیا اور اُردو میں علامتی شاعری کی راہ ہم وار کی۔ ادبی ذوق رکھنے والوں کے لئے اُن کے کلام میں خوش فکری، بذلہ سنجی، زبان و بیان پر قدرت اور صنائعِ لفظی و معنوی سب کچھ موجود ہے۔ غور و فکر کرنے والوں کے لئے اُنھوں نے معاشرت اور تمدن کی پیچیدگیوں اور فلسفہ جسم و روح کی حقیقتوں سے پردہ اُٹھایا ہے اور سیاست دانوں کو تو اُنھوں نے اُن کا اصل چہرہ دِکھایا ہے۔ اکبرالہ آبادی اُردو کے پہلے ایسے شاعر ہیں جن کے یہاں عورت کبھی فرنگی نازنینوں اور کبھی تھیٹر والیوں کی شکل میں اپنے پورے وجود کے ساتھ نظر آتی ہے جو اُردو شاعری کی روایتی محبوباؤں سے بالکل مختلف ہے۔ عشق و رومان کے مقابلے میں بصری لطف اندوزی کا جو انداز اُن کے یہاں ملتا ہے وہ اُردو شاعری میں ایک انوکھی چیز اور اپنی مثال آپ ہے۔

اکبرالہ آبادی کو اُردو شاعری میں طنز و ظرافت کا بادشاہ مانا جاتا ہے۔ اُن سے پہلے اُردو شاعری میں طنز و مزاح، ریختی یا ہجویات کے سوا کوئی دوسری صنفِ شاعری اہمیت اور تسلسل نہیں حاصل کر پائی تھی۔ اُنھوں نے تیزی سے بدلتے ہوئے زمانے کو خبردار کرنے کے لئے طنز و مزاح کی نئی وضع اختیار کی۔ اُن کی ظرافت کا مقصد تفریحِ طبع نہیں بلکہ اُس کا ایک خاص مقصد ہے۔ اُن کی دُور اَندیش نگاہوں نے دیکھا کہ دنیا بڑی تیزی سے بدل رہی ہے اور اس وقت جو طبقہ پیدا ہو رہا ہے اُس کو مغرب پرستی اپنے ساتھ بہائے لیے جا رہی ہے اور لوگ اپنی ہندوستانی اَقدار کو حقارت کی نگاہ سے دیکھنے لگے ہیں۔ اُنھوں نے اپنی شاعری کو ملک و قوم کی خدمت کی طرف موڑتے ہوئے ایک نیا انداز اختیار کیا جس میں بہ ظاہر تمسخر اور ظرافت ہے لیکن اُس کے باطن میں نصیحت اور تنقید ہے۔

10.07 فرہنگ

آبلے	: پاؤں کے چھالے	دیسی	: اپنے ملک کا بنا ہوا
آماس	: سوجن	ڈاکا	: ڈکیتی
آنر	: وقار	ڈنر	: رات کا کھانا
اِسہال	: چھوٹا	ڈیوٹی	: فرضِ منصبی
اِیڈریس	: پتہ	سعی	: کوشش
بادیہ پیما	: جنگل جنگل پھرنے والا	سوزش	: جلن
بہبود	: ترقی	فرضی	: گڑھا ہوا
بیاہنا	: شادی کروانا	فیس	: اُجرت
بےخوف	: نڈر	کوفت	: رنجیدگی
بےزَار	: اُکتایا ہوا	کھٹک	: ٹیس
بیوٹی	: خوب صورتی	گریٹ	: بڑا، عظیم
پارسی	: آتش پرست، اِیرانی	گریجویٹ	: بی.اے. پاس

پختہ	: پکا ہوا	لٹریچر	: ادب
پنشن	: ملازمت سے سبک دوشی کے بعد ملنے والی بقایا رقم	مرعوب	: جو کسی سے متاثر ہو
تعمیل	: حکم بجالانا	مروت	: پاس، لحاظ
جامہ	: کپڑا	مہذب	: تربیت یافتہ
جنرل	: سپہ سالار	نامہ	: خط
خام	: کچا	نرے	: پوری طرح
خوش حالی	: آسودگی	ہجوم	: بھیڑ
دام	: قیمت	ہسٹری	: تاریخ
دباؤ	: زور	ہنگامِ صبح	: صبح کا وقت
دقت	: پریشانی	ہنگامہ	: شور
دل آویزی	: دل کشی	یاس	: نااُمیدی

10.08 نمونہ امتحانی سوالات

الف: درجِ ذیل سوالوں کے جوابات ۱۰/۱۰ سطروں میں دیجیے:

سوال نمبر۱ اکبرالہ آبادی کے کچھ مزاحیہ اشعار قلم بند کیجیے۔

سوال نمبر۲ اکبرالہ آبادی کے حالاتِ زندگی اختصار سے لکھیے؟

سوال نمبر۳ اکبرالہ آبادی کی شاعری کے بارے میں اختصار سے لکھیے؟

ب: درج ذیل سوالوں کے جوابات ۳۰/۳۰ سطروں میں دیجیے:

سوال نمبر۱ اکبرالہ آبادی کی مزاحیہ شاعری کا جائزہ لیجیے؟

سوال نمبر۲ اکبرالہ آبادی کی شاعری کے بارے میں تفصیل سے لکھیے؟

سوال نمبر۳ اکبرالہ آبادی کے حالاتِ زندگی کے بارے میں تفصیل سے لکھیے؟

معروضی سوالات

سوال نمبر۱ : اکبرالہ آبادی کی پیدائش کب ہوئی؟

(الف) ۱۸۴۱ء میں (ب) ۱۸۴۶ء میں (ج) ۱۸۴۵ء میں (د) ۱۸۴۴ء میں

سوال نمبر۲ : اکبرالہ آبادی کی پیدائش کس شہر میں ہوئی؟

(الف) الہ آباد میں (ب) لکھنؤ میں (ج) دہلی میں (د) حیدرآباد میں

سوال نمبر۳ : اکبرالہ آبادی کے گھر کا نام کیا تھا؟

(الف) خدیجہ منزل (ب) زلیخا منزل (ج) عشرت منزل (د) اکبر منزل

سوال نمبر۴ : اکبرالہ آبادی کی وفات کب ہوئی؟

(الف) ۱۹۱۸ء (ب) ۱۹۲۰ء (ج) ۱۹۱۷ء (د) ۱۹۲۱ء

سوال نمبر۵ : اکبرالہ آبادی نے کس استاد شاعر سے اصلاح لی؟

(الف) وحیدالہ آبادی سے (ب) داغ دہلوی سے (ج) جگر مرادآبادی سے (د) مرزا غالب سے

سوال نمبر۶ : اکبرالہ آبادی کس وجہ سے مشہور ہوئے؟

(الف) غزل کی وجہ سے (ب) طنزیہ و مزاحیہ شاعری کی وجہ سے (ج) کتب بینی کی وجہ سے (د) مطالعہ کی وجہ سے

سوال نمبر۷ : یہ شعر کس شاعر کا ہے؟

ہم آہ بھی کرتے ہیں تو ہو جاتے ہیں بدنام
وہ قتل بھی کرتے ہیں تو چرچا نہیں ہوتا

(الف) حسرت کا (ب) میر کا (ج) اکبرالہ آبادی کا (د) جگر مرادآبادی کا

سوال نمبر۸ : اکبرالہ آبادی کے والد کا نام کیا تھا؟

(الف) سید فاضل حسین (ب) سید افضل حسین (ج) سید فضیل حسین (د) سید تفضّل حسین

سوال نمبر۹ : ''تمسخر'' کا معنی کیا ہے؟

(الف) راز کی بات بتانا (ب) گالی دینا (ج) مذاق اُڑانا (د) دُعا دینا

سوال نمبر۱۰ : ''فرضی'' کا متضاد لفظ کیا ہے؟

(الف) اصلی (ب) نقلی (ج) جعلی (د) کوئی نہیں

معروضی سوالات کے جوابات

جواب نمبر۱ : (ب) ۱۸۴۶ء میں
جواب نمبر۲ : (الف) الہ آباد میں
جواب نمبر۳ : (ج) عشرت منزل
جواب نمبر۴ : (د) ۱۹۲۱ء
جواب نمبر۵ : (الف) وحیدالہ آبادی سے
جواب نمبر۶ : (ب) طنزیہ و مزاحیہ شاعری کی وجہ سے
جواب نمبر۷ : (ج) اکبرالہ آبادی کا
جواب نمبر۸ : (د) سید تفضّل حسین
جواب نمبر۹ : (ج) مذاق اُڑانا
جواب نمبر۱۰ : (الف) اصلی

10.09 حوالہ جاتی کتب

۱۔	اُردو شاعری پر ایک نظر	از	پروفیسر کلیم الدین احمد
۲۔	اکبر الہ آبادی	از	صغریٰ مہدی
۳۔	اکبر الہ آبادی اور اُن کا کلام	از	نور الرحمٰن
۴۔	اکبر الہ آبادی کی شاعری	از	ساحل احمد
۵۔	اکبر کی شاعری کا تنقیدی مطالعہ	از	صغریٰ مہدی
۶۔	اکبر نامہ یا اکبر میری نظر میں	از	عبد الماجد دریا آبادی
۷۔	بزمِ اکبر	از	قمر الدین
۸۔	قطعات و رُباعیاتِ اکبر الہ آبادی	از	احسان الحق
۹۔	کلیاتِ اکبر الہ آبادی	از	سید محمد مسلم رضوی

✲

اکائی 11 شیخ پیرو : رشید احمد صدیقی

ساخت

11.01 : اغراض و مقاصد
11.02 : تمہید
11.03 : رشید احمد صدیقی کے حالاتِ زندگی
11.04 : رشید احمد صدیقی کا اُسلوب
11.05 : خاکہ نگاری کا فن
11.06 : خاکہ ''شیخ پیرو'' (متن)
11.07 : خاکہ ''شیخ پیرو'' کا تنقیدی جائزہ
11.08 : خلاصہ
11.09 : فرہنگ
11.10 : نمونہ امتحانی سوالات
11.11 : حوالہ جاتی کتب
11.12 : اپنے مطالعے کی جانچ کے جوابات

11.01 اغراض و مقاصد

اس اکائی میں آپ اردو کے ایک اہم طنز و مزاح نگار نیز ممتاز ناقد پروفیسر رشید احمد صدیقی صاحب کے حالاتِ زندگی اور ان کے اُسلوبِ نگارش سے واقفیت حاصل کریں گے۔اس کے ساتھ ہی خاکہ نگاری کے فن سے متعلّق معلومات بھی آپ کو فراہم کی گئی ہیں تا کہ آپ خاکہ نگاری کے ادبی اور فنی تقاضوں سے واقف ہو سکیں۔رشید احمد صدیقی کا تحریر کردہ ایک مشہور خاکہ ''شیخ پیرو'' کا متن اور اس کا تنقیدی جائزہ بھی اکائی میں شامل ہے جس کے مطالعے سے آپ بحیثیتِ مزاح نگار رشید احمد صاحب کے ادبی مقام و مرتبے سے بھی واقف ہوں گے اور ساتھ ہی ایک اچھے خاکے کی خوبیوں کے تعلّق سے بھی آپ کی معلومات میں اضافہ ہوگا۔

11.02 تمہید

اردو ادب میں طنز و مزاح کی روایت خاصی قدیم ہے۔نثری اور شعری ادب دونوں ہی میں طنز و مزاح کا عنصر پایا جاتا رہا ہے۔نہ صرف اتنا ہی بلکہ باقاعدہ طور پر اردو کے شعرا و اُدبا میں صفِ اوّل کے کئی ایسے نام شامل ہیں کہ جن کے پہچان طنز و مزاح کے حوالے سے ہی کی جاتی ہے۔مثال کے طور پر اکبرالہ آبادی اور رشید احمد صدیقی۔رشید احمد صدیقی اردو کے نثری ادب میں طنز و مزاح کی روایت کا ایک اہم نام ہے۔ان کا تحریر کردہ خاکہ مزاحیہ قہقہے کی بجائے تبسم زیرِ لب کی کیفیت پیدا کرتا ہے اور اسی لئے عوام سے زیادہ خاص کی چیز ہے۔زیرِ نظر اکائی میں آپ اردو کے اسی ممتاز و معروف طنز و مزاح نگار کے تعلّق سے معلومات حاصل کریں گے۔

11.03 رشید احمد صدیقی کے حالاتِ زندگی

رشید احمد صدیقی ۲۴ر دسمبر ۱۸۹۲ء کو ایک متوسّط گھرانے میں پیدا ہوئے۔ وہ یو پی ضلع جون پور کے قصبہ مڑھیاہوں کے رہنے والے تھے۔ ان کے والد جناب عبدالقدیر صاحب محکمۂ پولیس میں سب انسپکٹر تھے اس کے باوجود گھر میں دینی ماحول تھا۔ رشید احمد صدیقی کے یہاں جو انسان دوستی اور زندگی کے اعلیٰ قدریں ملتی ہیں ان میں ان کے گھریلو ماحول و تربیت کا بڑا دخل ہے۔ رشید احمد صدیقی نے ۱۹۱۴ء میں انٹرنس پاس کیا اور اسی سال انہیں جون پور کی عدالت میں کلرک کی نوکری مل گئی لیکن وہ اس نوکری سے مطمئن نہ تھے۔ اسی لئے انہوں نے اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لئے ۱۹۱۵ء میں ایم.اے.او کالج (علی گڑھ مسلم یونیورسٹی) میں داخلہ لیا۔ یہیں سے انہوں نے ۱۹۲۱ء میں ایم.اے امتیازی نمبروں سے پاس کیا اور شعبۂ اردو میں عارضی لکچرر ہو گئے۔ ۱۹۲۶ء میں ان کی نوکری کو استقلال حاصل ہوا اور ۱۹۵۸ء میں ملازمت سے سبک دوش ہوئے۔ علی گڑھ سے غیر معمولی لگاؤ اور جنون کی حد تک محبت نے انہیں وہیں کا اَسیر بنا دیا۔ ۱۵ر جنوری ۱۹۷۷ء کو ۶۶ر سال کی عمر میں انتقال ہوا اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے قبرستان کے احاطے میں ہی سپردِ خاک ہوئے۔ گاؤں میں پیدا ہونے اور علی گڑھ میں زندگی کا بیش قیمت حصہ گزارنے کے سبب وہ دیہی اور شہری نظام زندگی کے نشیب و فراز بخوبی واقف تھے۔ یہی سبب ہے کہ ان کی تحریروں میں گاؤں اور شہر دونوں طرح کی زندگی کی متحرک تصویریں دیکھنے کو ملتی ہیں۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:۔

﴿۱﴾ رشید احمد صدیقی کب اور کہاں پیدا ہوئے؟

﴿۲﴾ رشید احمد صدیقی کو کس مقام سے غیر معمولی لگاؤ تھا؟

﴿۳﴾ رشید احمد صدیقی کا انتقال کب اور کہاں ہوا؟

11.04 رشید احمد صدیقی کا اُسلوب

رشید احمد صدیقی اردو ادب کے اہم نثر نگار ہیں۔ انہوں نے انشائیہ، خاکے، خود نوشت، سوانح اور تنقیدی کتابیں تحریر کی ہیں۔ ان کی تصانیف میں ''طنزیات و مضحکات، جدید غزل، غالبؔ شخصیت سازی، مضامینِ رشید، خندان، ذاکر صاحب، گنج ہائے گرانمایہ، ہم نفسانِ رفتہ، آشفتہ بیانی میری''، وغیرہ کو مقبولیت و اہمیت حاصل ہے۔ رشید احمد صدیقی کی تحریروں میں سادگی و رعنائی کے ساتھ ہی ادبی و فنی رَچاؤ ملتا ہے جس کی وجہ سے ان کی اُسلوب میں غیر معمولی دل کشی، توانائی اور تاثیر پیدا ہو گئی ہے۔ انہوں نے شہر اور گاؤں دونوں کی زندگی کا گہرائی سے مشاہدہ کیا تھا۔ اس کے علاوہ انہیں شعر و ادب اور دوسرے علوم و فنون سے بھی گہری واقفیت تھی۔ اسی لئے ان کی تحریروں میں ایسی بلاغت ہے جس سے لطف اندوز ہونے کے لئے خود بھی خاصا پڑھا لکھا ہونا ضروری ہے۔ دوسرے لفظوں میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ عام قاری کے لئے ان کے یہاں تسکین ذوق کا سامان کم ہی مل پاتا ہے۔ انہوں نے تلمیحات کا کثرت سے استعمال کیا ہے۔ اس کے علاوہ وہ شعر و ادب، تاریخ و سیاست، فلسفہ و عمرانیات اور دیگر علوم سے بھی اپنے فن کے لئے خام مواد حاصل کرتے ہیں۔ فارسی تراکیب و محاورات کے علاوہ ضرب الامثال اور قولِ محال (Paradox) کا استعمال ان کے یہاں بہ کثرت دیکھنے کو ملتا ہے۔ اس کے علاوہ بذلہ سنجی (WIT) کے نمونے بھی ان کے تحریروں میں دیکھنے کو ملتے ہیں جس سے ان کی تحریروں میں چاشنی پیدا ہو گئی ہے۔ ان کے فن پر تبصرہ کرتے ہوئے خورشید الاسلام نے لکھا ہے کہ:

''رشید احمد صدیقی کے فن اور ان کے خیال میں پیچیدگی ہے لیکن ان کا مطالعہ غیر ضروری ہے ان کے طنز میں پہلی نظر میں ظرافت کا دوسری نظر میں بلاغت کا تیسری نظر میں انفرادی اور اجتماعی شامت کا احساس ہوتا ہے اور بعد میں یہ تینوں مل کر آسیب کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔''

مجموعی طور پر رشید احمد صدیقی کا فن بلیغ ہے اور نثر میں ایسی روانی اور چاشنی ہے جس کی تقلید کی کوشش بعد کے ادیبوں نے شعوری طور پر کی ہے۔ البتہ علی گڑھ کی بے پناہ عقیدت اور اس وقت کے شخصی حوالے و واقعات کے بیان نے ان کے فن کو نقصان پہنچایا ہے۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:۔

﴿۴﴾　''آشفتہ بیانی میری'' کس کی تصنیف ہے؟

﴿۵﴾　شید احمد صدیقی کی تحریروں سے لطف اندوز ہونے کے لئے کیا ضروری ہے؟

11.05　خاکہ نگاری کا فن

اردو میں خاکہ نگاری کا فن بہت مقبول نہیں اور بہت کم ادیبوں نے اس فن پر توجہ کی ہے۔ خاکہ نگاری کی صنف کو انگریزی میں Sketch یا Character-Sketch کہتے ہیں۔ یعنی کسی انسان کی ایسے (خطوط) کو اُبھارنا جس سے اس کی تصویر واضح ہو کر ہمارے سامنے آجائے۔ عام طور پر تخلیق کار کسی انسان کی خاص بشری صنف سے متاثر ہوتا ہے تو وہ انہی انسانی خصوصیات کے حوالے سے اس شخص کی تصویر کشی کرتا ہے جسے ہم خاکہ کہتے ہیں۔ بالعموم مصنّف جس شخص کی تصویر پیش کرتا ہے وہ حقیقی انسان ہوتا ہے اور جو کچھ مصنّف پیش کرتا ہے وہ شنید کا نہیں دید کا حصہ ہوتا ہے۔ انسان کی ظاہری شکل وصورت اور جسمانی خوب صورتی اس کی نگاہوں کا مرکز نہیں ہوتی بلکہ وہ اس کی باطنی صفات سے متاثر ہوتا ہے تاہم یہ ضروری نہیں کہ کسی انسان کے صرف اچھے فضائل کو ہی موضوع بنایا جائے اس کی بری عادتوں کو بھی موضوع بنایا جا سکتا ہے۔

کسی افسانے کے کردار اور خاکہ میں بنیادی فرق یہ ہے کہ خاکہ میں ہم کسی کی حقیقی تصویر پیش کرتے ہیں جب کہ افسانوں کے کردار تخیلاتی ہوتے ہیں۔ خاکے میں تخلیق کار ظاہری شکل وصورت سے زیادہ غرض نہیں رکھتا بلکہ وہ اس کی باطنی خوبیوں کو اُجاگر کرتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں ہم یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ مصنّف جس انسان سے ذہنی رفاقت اور قرب و موانست محسوس کرتا ہے اسی کا خاکہ پیش کرتا ہے۔ خاکہ نگاری، سوانح نگاری (Biography) سے بھی مختلف ہے۔ سوانح میں بھی کسی عظیم ہستی کے مہتم بالشان کارناموں کو بیان کیا جاتا ہے جب کہ خاکہ میں کسی غیر اہم اور معمولی آدمی کو ہی موضوع بنایا جاتا ہے۔ خاکہ نگاری (Autobiography) خودنوشت سے بھی مختلف ہے۔ خود نوشت میں مصنّف اپنے نجی حالات، گھر و خاندان، تعلیم و تربیت، عادات و اطوار، پسند و ناپسند وغیرہ کے متعلّق انکشاف کرتا ہے لیکن خاکے میں وہ کسی اور انسان کی زندگی کو موضوع بناتا ہے۔ خاکہ نگاری (Memoir) سرگزشت یا یادداشت سے بھی علیحدہ صنف ہے۔ **Memoir** میں مصنّف بہت سی یادوں اور تجربات و مشاہدات کو بیان کرتا ہے لیکن خاکے میں وہ کسی شخص کے متعلّق اپنے مشاہدات (Observation) کو رقم کرتا ہے۔ خاکہ میں کسی عام انسان کو مرکزی حیثیت حاصل نہیں ہوتی اور مصنّف اس کی زندگی کو فوکس کرتا ہے اور اس کی کسی ایسی بشری صفت کو آشکار کرتا ہے جو غیر معمولی ہو۔ خاکہ میں وحدتِ تاثر کا پایا جانا بھی ضروری ہے۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:۔

﴿۶﴾ خاکے اور افسانے میں کیا فرق ہے؟

﴿۷﴾ خاکہ نگاری کی صنف کو انگریزی میں کیا کہتے ہیں؟

11.06 خاکہ ''شیخ پیرو'' (متن)

ہماری بستی میں دو اشخاص بہت مشہور تھے، ایک شیخ پیرو اور دوسری چھیتا خاتون، چھیتا سے ہر شخص ڈرتا تھا اور پیرو کو ہر شخص چھیڑتا تھا۔ چھیتا جدھر سے نکل جاتی، ادھر کے کتے بھاگ جاتے تھے، اور شیخ پیرو گھر سے نکلے نہیں کہ ۔

شہر کے لڑکوں کو بر آئی مراد

بند سے دیوانہ رہا ہو گیا

چھیتا سے میں خود ڈرتا تھا اور اب بھی میری ہمت نہیں ہوتی کہ ان کا تذکرہ آسانی سے کر سکوں، گو ان کو رحلت کیے ہوئے مدت ہو چکی مگر وہ شہرت ہی کیا جو مرنے کے بعد تک قائم نہ رہے اور وہ ڈرنا کیسا جو ڈرانے والے کے بعد ہی ختم ہو جائے۔

پیرو غدر میں تھے اور اس کے فرو ہونے کے بعد بھی عرصے تک زندگی کے ہنگامے کے تماشے دیکھتے رہے۔ بات یہ ہے کہ غدر کے فرو ہو جانے کے کچھ عرصے بعد غدر کی ہول نا کی قائم رہی۔ زلزلے کے بعد بھی زلزلے کے جھٹکے آتے رہتے ہیں۔ غدر سے پہلے پیرو وطن سے دُور کھانے کمانے چل دیے تھے اور کچھ ایسے لا پتہ رہے کہ وطن میں ان کی رحلت کر جانے کی خبر مشہور ہو گئی۔ غدر ختم ہوا تو یہ عازمِ وطن ہوئے ادھر پولیس والوں کو میرو نام کے ایک ڈاکو کے ظلم و ستم سے بڑی پریشانی تھی۔ میرو کی گرفتاری کا انعام مقرر تھا، جس کے حاصل کرنے میں بہت ساری گرفتاری حیات سے آزاد ہو چکے تھے۔ پولیس والے اس فکر میں تھے کہ آبرو بھی قائم رہے اور جان بھی اور میرو گرفتار ہو جائیں۔ پولیس والوں کے لئے یہ پوزیشن بڑی مشکل تھی، کیوں کہ ان پر تین فرائض عائد ہوتے تھے۔ میرو کو صرف اپنی جان کی فکر تھی اور جسے صرف جان کی فکر ہو اس کا مقابلہ ایسا شخص کب کر سکتا ہے جسے جان کے علاوہ اور باتوں کی بھی فکر ہو۔ انسان جب بہت پریشان ہوتا ہے تو صرف دو باتیں کر سکتا ہے، جان پر کھیل جائے یا ایمان پر اُتر آئے۔ گو اس دنیا میں ایسے بے ایمان بھی دیکھے گئے ہیں جو بے ایمانی کی خاطر جان پر کھیل جاتے ہیں۔ بعض ایسے نالائق بھی ملتے ہیں، جو بے ایمان ایمان دار ہوتے ہیں۔

لیکن ان باتوں کو چھوڑیے رات کے وقت بے ایمانوں کی بحث چھیڑنے سے نیک سے نیک بیویاں ڈراؤنے خواب دیکھتی ہیں اور بیداری میں نیاز مند شوہر ڈراؤنی بیویاں!

مشکل یہ تھی کی پیرو آدمی مرنجاں مرنج تھے، لیکن شکل سے بڑے خونخوار معلوم ہوتے تھے۔ کالے، موٹے، سرخ سرخ آنکھیں، گنجان داڑھی کسی قدر سرخی مائل، آواز ڈراؤنی، بڑے مضبوط جیسے کوئی نیم سوختہ تناور ببول۔ ان کو معلوم نہ تھا کہ ان کا خاندان غدر میں تباہ و تتر بتر ہو چکا تھا۔ پردیس سے ایسے چلے آئے تھے کئی پن سیری بان، جسے پورب میں بادھ کہتے ہیں، کچھ ناریل کھوپڑے، ایک گٹھر کپڑوں کا، پانچ سات تانبے پیتل کے برتن، تھوڑی بہت نقدی، کچھ تمباکو کے پتے۔ ایسا شخص جہاں سے گزرتا لوگوں کو دھوکہ ہوتا اور خطرہ محسوس ہوتا۔ ابھی ابھی غدر ہو چکا تھا مفرور و مشتبہ لوگوں کی تلاش جاری تھی۔ پولیس والوں کو خبر ہو گئی۔ انہوں نے میرو کے بدلے پیرو کو گرفتار کر لیا۔ بہت کچھ ہاتھ پانو مارے لیکن ایک پیش نہ گئی۔ ان کے خلاف ان کا حلیہ تھا اور ان کی کمائی ہوئی چیزیں جنہیں وہ لادے پھاندے آرہے تھے۔

استغاثہ کی طرف سے بیان کیا گیا کہ میر و اور پیرو کے لکھنے میں ممکن ہے کہ کچھ اختلاف ہو لیکن پڑھنے میں دونوں یکساں تھے۔ پیرو کو میر و پڑھ سکتے ہیں اور میر و کو پیرو۔ دوسرے یہ کہ پیرو کا حلیہ ایسا تھا جو خود پیرو کا ممکن ہے ہو یا نہ ہو، میر و کا ضرور ہوگا۔ تیسرے یہ کہ جو مال مسروقہ ان کے جسم پر مسلط تھا، وہ کبھی ایسا نہیں ہوسکتا کہ ایک شخص کے قبضے سے بہ یک وقت برآمد ہو سکے۔ ملزم نے یقیناً مختلف لوگوں کو مختلف اوقات میں لوٹا ہے۔

اس امن و امان اور تمدنی برکات کے عہد میں قانون کا منشا یہ ہوتا ہے کہ اصل مجرم چھوٹ جانے سے بہتر ہے کہ بے گناہ سزا یاب ہو جائے۔ اس لئے ملزم کا قصور، مشتبہ ہو، تو اسے رہا کر دینا چاہیے، جس کو دوسرے الفاظ میں یوں لکھتے ہیں کہ شبہ کا فائدہ ملزم کو ملتا ہے لیکن جہاں اور جس زمانے میں امن و امان کا معاملہ کچھ یوں ہی سا ہو، وہاں کا دستور یہ ہوتا ہے کہ شبہ کا فائدہ پولیس کو دیا جائے، یعنی الزام مشتبہ ہو، تب بھی ملزم کو احتیاطاً سزا دے دینی چاہیے۔

پیرو کا مقدمہ عدالت میں پیش ہوا، جہاں یہ سزا پا گئے۔ ایک طول طویل فیصلے کے آخر میں درج تھا کہ میر و اور پیرو تجنیس خطی ہے، تضاد شخصی نہیں ہے۔ ممکن ہے کہ پیرو کوئی اور ہو لیکن جو شخص اس وقت عدالت کے سامنے لایا گیا ہے، وہ قرائن و قانون دونوں کی رو سے پیرو اور میر و دونوں کا مجموعہ معلوم ہوتا ہے۔ اس لئے حاصل ضرب سزا ہے۔ قانون نام کا پابند ہے اور عدالت حُلیے کی۔ حاکم مِسل دیکھتا ہے واقعات سے بحث نہیں کرتا۔ حاکم کے نزدیک واقعہ وہی ہے جو مسل میں مقیّد ہو۔ واقعے کے مقیّد ہو جانے کے بعد ملزم کا آزاد رہنا اَمنِ عامّہ کی منافی ہوگا۔ غرض پیرو حُلیہ پر سزا پا گئے لیکن اس فیصلے کا رَدِّ عمل ایسا ہوا کہ تمام لوگوں نے جن کا حلیہ مشتبہ تھا، اس پر سخت احتجاج کیا چنانچہ بعد میں عدالت نے حُلیہ سے متاثر ہونا چھوڑ دیا ان تمام لوگوں کو جن کا حلیہ پیرو یا میر و سے ملتا جلتا تھا یا جن کی صورت دفعات تعزیراتِ ہند سے دُور کی بھی نسبت یا مشابہت رکھتی تھی، ان سب کو ایک بڑی آفت سے نجات مل گئی۔ چنانچہ آج وہ تمام لوگ جو حلیے کے اعتبار سے پیرو یا میر و کے نہایت قریبی عزیز معلوم ہوتے ہیں ایسے ایسے مناصب پر فائز ہیں کہ انہیں دیکھ کر پولیس اور عدالت دونوں کے منھ میں پانی بھر آتا ہے لیکن ان کا کچھ بگاڑ نہیں سکتے!

بیچارے پیرو سزا کاٹ کر آئے۔ غدر میں سارا گھرانہ تباہ اور مکان مسمار ہو چکا تھا۔ شادی پہلے اس لئے نہیں کی تھی کہ کما کے آئیں گے تو کریں گے۔ اب ہو نہیں سکتی تھی، اس لئے کہ جیل خانہ کاٹ آئے تھے اور پیسے پاس نہ تھے۔ اپنے ہی ویرانہ پر کھپریل ڈال لی، جس میں رات دن بیٹھے حقہ پیا کرتے تھے، گالی بکا کرتے تھے۔ بڑھاپا آچکا تھا۔ کوئی آگے پیچھے نہیں تھا اور نہ کوئی آس پاس سے گزر سکتا تھا۔ انہیں کے بستی سے نکالا ہوا ایک کتا بھی وہاں آکر ٹِک گیا۔ ایک دن انہوں نے اسے گھورا۔ اس نے دُم ہلانی شروع کر دی، دونوں کی نظریں نیچی ہو گئیں اور بہت سے ایسے مسائل پَل مارتے طے ہو گئے، جو مدّتوں نہ انٹروڈکشن سے طے ہوتے ہیں، نہ مشین گن سے۔ اب پیرو کو گھر کی طرف سے اطمینان ہوا، تو افیون شروع کر دی۔

پیرو کے لئے کتا سب کچھ تھا، ان کا خاندان، ان کا دوست، ان کا مکان، ان کی جائیداد۔ ان کے ہوتے ہوئے وہ خانہ داری کے خدشوں سے اپنے آپ کو آزاد سمجھتے تھے۔ ایک بوجھ تھا جو سر سے اُتر گیا تھا۔ خانہ داری کا جھگڑا ہی وہاں کیا تھا؟ لیکن کتے کی موجودگی کو وہ ایسا مہرہ سمجھتے تھے، جو گرہستی کے ہر خانے میں ٹھیک بیٹھتا تھا۔ گرہستی خارج میں موجود نہ تھی لیکن گرہست تو موجود تھا۔ گرہستی اس کے

ذہن میں تھی۔ پیرو اس ذہنی گرہستی کی خانہ پُری کتے سے کر کے مطمئن ہو جاتے تھے۔ اس طور پر وہ دنیا کو دھوکہ دے رہے تھے، لیکن اپنے سے سچے تھے۔

خوش ہوتے تو کتے سے باتیں کرتے، اس کو اپنے قریب جگہ دیتے، اسے ہر آنچ سے محفوظ رکھنے کے لئے اپنے آپ میں شجاعت و ایثار کے ولولے بیدار پاتے۔ حقہ پیتے، تو کبھی کبھی دھواں اس کے منہ پر چھوڑ دیتے وہ آنکھیں کھولنے اور بند کرنے لگتا تو مسکراتے اور اس وقت مسکراہٹ ان کے چہرے پر ایسی ہی معلوم ہوتی جیسے گھورے پر جنگلی پھول۔ اس کے جسم سے جوئیں نکالتے، زخموں کے داغ پر ہلکے ہلکے انگلیاں پھیرتے، کتے کی رفاقت پر بھروسا کرتے۔ اس لئے نہیں کہ انہیں اس سے کوئی امداد ملے گی، بلکہ اس کی مدد خود کر سکیں گے۔ خود ملول ہوتے، تو کتے کی دل دہی کرتے۔ خفا ہوتے تو اس پر بگڑتے، پھر تسلّی دیتے اور نئی چلم بھرتے۔

کتے کو وہ اپنا مکان سمجھتے تھے، محل بھی، جھونپڑی بھی، قلعہ بھی ہوائی قلعہ بھی۔ وہ کتے کے اعضا، اس کی ساخت، اس کے جسم کے اونچ نیچ، اس کی گرمی و سردی، اس کی نرمی و سختی کو مکان کا نقشہ، مکان کے درو دیوار، فرش اور چھت، کوٹھری اور برآمدہ، طاق اور گوشے، بوریا و بستر سمجھتے تھے۔ جیسے کوئی مکان میں رہتا ہے، یہ کتے میں رہتے۔ کتے کی مسکینی، کس مپرسی، وفاداری، اس کا بھونکنا، اس کی آوارہ گردی، اس کی قناعت، صفات کے وہ مہرے تھے جو پیرو کی ذات پر قائم تھے۔

پیرو کی کمائی کا ذریعہ حقہ پلانا تھا۔ ایک جھولی میں کوئلہ تمبا کو ڈال لیتے۔ ایک ٹوٹا سا حقہ تھا، جیسے کوئی بوڑھا، مفلوج پہلوان۔ اسے لے کر گھر سے نکل کھڑے ہوتے۔ کتا ساتھ ہوتا۔ کبھی کتا آگے اور کبھی یہ آگے، کتا پیچھے۔ یہ واقعہ ہر روز اس تواتر اور پابندی سے پیش آتا کہ لوگ کتے کو پیروا اور پیرو کو انہیں کا کتا سمجھنے لگے تھے اور دونوں کے مجموعے کو حقے کا ایک گہرا کش، تیز و تند بھی، خوش اور پر کیف بھی، کثیف اور پر اسرار بھی۔

پیرو ہمیشہ کچھ نہ کچھ بڑبڑاتے رہتے۔ لوگ سمجھتے کتے سے گفتگو کر رہے ہیں۔ کتا سر جھکائے ساتھ رہتا اور اس طور پر ان کی باتیں سنتا جیسے کوئی تیماردار چڑچڑے یا غافل مریض کی ہذیان سنتا رہتا۔ خود حقہ کسی کو نہ پیش کرتے لیکن پینے والے پی لیتے۔ کچھ ایسا معلوم ہوتا جیسے ہر شخص پیرو کو پہچانتا ہے، ان کے مشن کو سمجھتا ہے اور پیرو ہر شخص کو جانتے اور اس مقصد سے آگاہ ہیں۔ کوئی اجنبی ہوتا تو پیرو گم ہو جاتے اور کتا کان کھڑے کر لیتا۔

جس کے دل میں آجاتا دے دیتا۔ یہاں تک کہ نانبائی اور قصاب کوئی ٹکڑا یا چھیچھڑا کتے کے سامنے پھینک دیتا تو پیروا سے بھی اپنا معاوضہ سمجھ کر حقہ پلا کر آگے بڑھ جاتے۔ بستی کے لڑکے ان کو چھیڑتے، کوئی ان کو دیکھ کر چیختا چڑھاتا، کوئی ان کی جھولی کھینچ کر بھاگ جاتا۔ یہ ڈانٹتے، گالی دیتے، کسی کو پکڑ لیتے، تو حقہ کے چمٹے سے اس کی ناک پکڑنے کی دھمکی دیتے اور غراتے لیکن سب جانتے تھے کہ یہ ہر لڑکے کو اپنا سمجھتے ہیں، نہ نقصان پہنچائیں گے نہ نقصان پہنچنے دیں گے لیکن اگر کوئی لڑکا کتے سے شوخی کرتا تو پھر ان کے تیور ایسے ہو جاتے اور ایسی گھن گرج قسم کی آواز نکالتے کہ آس پاس کے سارے لڑکے اور کتے ادھر اُدھر بھاگنے لگتے۔

بستی میں ہیضہ پھیلا۔ لوگ مرنے اور بھاگنے لگے۔ چند ہی دنوں میں ساری بستی سنسان ہوگئی، چوروں کی بن آئی۔ لوگ بیماری اور چوری کے بھنور میں تباہ ہونے لگے۔ پیروا اور ان کے کتے نے دن کے بجائے رات کو چکر لگانا شروع کیا۔ بیماروں کا علاج اور تیمارداری کون

کرتا؟ مردوں کو دفن کرنا، جلانا مشکل ہو گیا۔ پیرو اور ان کا کتا ہر جنازے یا ارتھی کے ساتھ دیکھے جاتے، کہیں جنازہ کاندھے پر، کہیں مردہ جلانے کی لکڑیاں سر پر۔

چور اور پیرو دونوں رات بھر بستی کا گشت لگاتے رہتے۔ ایک دن بارش ہو رہی تھی، رات کا وقت تھا، آگے پیچھے کچھ سجھائی نہ دیتا تھا۔ رات زیادہ ہو چکی تھی۔ کہیں کہیں سے گھر گرنے یا مرنے عزیز و اقارب کے رونے پیٹنے کی آواز آجاتی تھی۔ پیرو حسبِ معمول کتے سمیت گشت لگا رہے تھے، ایک ہاتھ میں بانس کے بڑا موٹا ڈنڈا، دوسرے میں حقہ۔ نظر تاریکی میں اور دھیان خدا جانے کہاں؟ ایک جگہ پانوں کی آہٹ معلوم ہوئی۔ کتا جھجکا، پیرو بڑھے معلوم ہوا کچھ لوگ سرگوشی کر رہے ہیں۔ آوازیں یک بہ یک رُک گئیں اور لاٹھی ہوا میں سنسناتی ہوئی پیرو کے بازو پر پڑی۔ حقہ چھوٹ پڑا، کتا بھونک کر پیچھے ہٹا۔ پیرو اندھیرے میں ہی سائے پر جھپٹے۔ ہنکار کر گالی دے کر۔ پیچھے سے آواز آئی حقے والا بد معاش ہے، جانے نہ پائے۔ پیرو کچھ غصے سے، کچھ کراہ کر، کچھ لاچار ہو کر بولے، ارے سامنے آتو بستی تباہ ہو گئی، حقے والے بدمعاش کو اس مہاماری میں کوئی پوچھنے والا تو ملا۔ بادلوں سے چاند نکل آیا۔ چاندنی پھیل گئی۔ التیاں موتی رول رہی تھیں اور گلی میں گندا گدلا پانی بہہ رہا تھا۔ پیرو کا مقابلہ تین آدمیوں سے تھا ہر ایک کے پاس لاٹھی اور کلہاڑی تھی۔ ان کے پاس بانس کا ڈنڈا۔ کتا ٹانگوں سے لپٹا ہوا۔ یہ اس فکر میں کہ کتا دُور ہو تو دشمن سے اُلجھیں۔ جب خطرہ بڑھا تو قوّتِ فیصلہ بیدار ہوئی۔ جھکے اور کتے کی ٹانگ پکڑ کر سامنے چھت پر پھینک دیا۔ اسی دَوران میں دشمن نے ایک لاٹھی رسید کی۔ پیرو نے بروقت وار خالی دیا لیکن ان کے بانس کے پرخچے اُڑ گئے۔ لاٹھی ہوا کو چیرتی ہوئی ٹین کے ایک سائبان کی لکڑی کے ستون سے ٹکرائی۔ ایک تُراقا ہوا۔ جیسے بجلی کسی درخت پر گری ہو، سائبان کا گرنا پیرو کے لئے تائیدِ غیبی ہوا۔ انہوں نے ستون اُٹھا لیا اور آنکھ بند کر کے ایک ہاتھ رسید کی تو حریف زمین سے اُچھل کر دیوار سے جا ٹکرایا اور بتاشے کی طرح زمین پر وہیں ڈھیر ہو گیا۔ اتنے میں بقیہ دونوں نے کلہاڑی سے حملہ کر دیا۔ پیرو نے ایک ضرب کو ستون کے اُلجھیڑے سے رَد کیا، دوسرے کا وار کمر پر پڑنے ہی والا تھا کہ چھت پر سے کتے نے ایک حزیں آواز کے ساتھ جست کی۔ کلہاڑی اور پیرو کی کمر کے درمیان آ گیا کتے کا تو وہی خاتمہ ہو گیا لیکن کلہاڑی پیرو پر بھی اپنا کام کر گئی۔ پیرو نے کتے کا انجام دیکھا تو ایسا معلوم ہوا جیسے ان میں عفریت کی روح حلول کر گئی ہو۔ ستون پھینک دیا۔ کلہاڑی کو ہاتھ سے پکڑ کر جھٹکا دیا تو حریف چکرا کر قریب آ گیا۔ غرا کر دونوں ہاتھ سے گردن پکڑ لی ایک ذرا دیر کے لئے گرفت کو تولا اور پھر نہایت ہی بھیانک قسم کا نعرہ لگا کر دشمن کو ہوا میں چکر دے کر زمین پر دے پٹکا۔ یہ سارے مرحلے چند ہی سکنڈ میں ختم ہو گئے۔ تینوں حریف اور کتا زمین پر خون اور کیچڑ میں لتھڑے ہوئے ٹھنڈے ہو چکے تھے۔

پیرو نے کراہ کر کتے کو اُٹھا لیا۔ تھوڑی دُور لڑکھڑاتے چلے، پھر گر پڑے۔ ہوا کا ایک تیز جھونکا آیا اور نکل گیا۔

صبح کے وقت خبر مشہور ہوئی کہ پیرو مارے گئے۔ ان کے جنازے میں بستی کے تمام لوگ تھے، جو مرنے سے بچ رہے تھے یا بھاگ گئے تھے۔ پیرو کو سپرد خاک کر کے لوگ براہِ راست اپنے گھروں کو واپس آئے کیوں کہ عوام کا عقیدہ تھا کہ بستی کے سب سے بڑے آدمی کے مرنے کے بعد وَبا کا بھی خاتمہ ہو جاتا ہے۔

11.07 خاکہ ''شیخ پیرو'' کا تنقیدی جائزہ

شیخ پیرو ایک عام اور بے ضرر قسم کے انسان ہیں۔ تلاشِ معاش کے سلسلے میں وہ وطن سے دُور چلے گئے۔ غدر کے ہنگامے سرد ہونے کے بعد وہ وطن واپس لوٹے۔ جو کچھ کمایا تھا وہ مختلف پوٹلیوں کی شکل میں اپنے اُوپر لادے ہوئے تھے۔ اسی زمانے میں پولیس کو ''میرو'' نامی کسی ڈاکو کی تلاش تھی۔ میرو سے اپنی مماثلث اور نام کی یکسانیت خوفناک شکل وشباہت اور طرح طرح کے سامانوں کی موجودگی کی وجہ سے پولیس کو مشکوک نظر آئے۔ پولیس نے انہیں میرو کی جگہ پکڑ کر جیل میں بند کر دیا جیسا کہ عام طور سے پولیس بے قصور لوگوں کو ہی پکڑ کر خانہ پُری کر لیتی ہے۔ مقدمہ کی ساعت ہوئی۔ پولیس کی بے انصافی اور نام کی مشابہت کی وجہ سے وہ سزایاب ہوئے۔

پیرو سزا کاٹ کر آئے تو ایک کھپریل میں رہنے لگے۔ جہاں حقہ پیتے اور گالیاں دیا کرتے۔ غربت کی وجہ سے شادی نہیں ہو سکی تھی۔ اس لئے تنِ تنہا تھے۔ ایک کتا آیا اور شیخ پیرو کے ساتھ رہنے لگا۔ پیرو گھر کی طرف سے مطمئن ہو کر افیون کھانے لگے۔ کتا ان کی زندگی کا ایک جزو بن گیا۔ ان کے گھر کا محافظ اور ان کا ہمراز و ہم سخن بھی وہی ٹھہرا۔ دونوں ایک دوسرے کے دکھ درد کے شریک تھے اور دونوں کی کائنات ایک دوسرے کی ذات تک محدود تھی۔

شیخ پیرو کی کمائی کا ذریعہ حقہ پلانا تھا۔ وہ اپنے کتے کے ساتھ گھر سے نکلتے۔ لوگ حقہ پیتے اور انہیں کچھ دے دیتے۔ اس طرح ان دونوں کی گزر اوقات ہو جایا کرتی تھی۔ پیرو ہمیشہ کچھ بڑبڑاتے رہتے جسے صرف ان کا کتا ہی سمجھ پاتا۔ لوگ ان سے ہنسی مذاق کرتے۔ بچے انہیں چھیڑتے وہ بچوں کو مارنے کے لئے دَوڑاتے مگر کبھی کسی کو نقصان نہ پہنچاتے لیکن اگر کوئی لڑکا ان کے کتے سے شوخی کرتا تو یہ حرکت ان کے لئے ناقابل برداشت ہوتی اور اتنی زور سے چلاتے کہ آس پاس کے لڑکے اور کتے ادھر اُدھر بھاگ جاتے۔

بستی میں ہیضہ پھیلا۔ لوگ بے تحاشہ مرنے لگے پیرو اپنے کتے کے ساتھ حفاظت کے خیال سے رات میں پہرا دیتے۔ دن میں مردوں کے تجہیز و تکفین کے موقعوں پر لوگوں کے ساتھ رہتے اور ہر طرح سے لوگوں کا ہاتھ بٹاتے۔ برسات کی ایک کالی رات میں ایک بانس کا ٹکڑا لیے اپنے کتے کے ساتھ گشت لگا رہے تھے کہ سرگوشیوں کی آواز آئی پھر لاٹھی ان کے بازو پر پڑی۔ شیخ پیرو چوروں کی طرف جھپٹے اور چوروں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ ایک چور نے کلہاڑی سے ان پر حملہ کیا۔ کتا جست لگا کر شیخ پیرو اور کلہاڑی کے درمیان آ گیا جس سے اس کے دو ٹکڑے ہو گئے۔ کتے کی حالت دیکھ کر پیرو پر جنون سوار ہو گیا اور انہوں نے چوروں پر حملہ کر کے انہیں زمین پر ڈھیر کر دیا۔ اس طرح کتا اور تینوں چور خون اور کیچڑ میں لتھڑے ہوئے ٹھنڈے ہو چکے تھے۔ پیرو نے کتے کو اُٹھایا کچھ دور چلے اور پھر لڑکھڑا کر گر پڑے اور ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گئے۔ صبح کے وقت لوگوں کو پتہ چلا کہ شیخ پیرو مارے گئے۔ گاؤں کے تمام لوگ ان کے جنازے میں شریک ہوئے۔ انہیں سپردِ خاک کر کے لوگ اپنے گھر لوٹے کیوں کہ ان کا عقیدہ تھا سب سے بڑے آدمی کے مر جانے کے بعد وَبا کا بھی خاتمہ ہو جاتا ہے۔

شیخ پیرو ایک ایسے شخص کی کہانی ہے جو بے ضرر ہے لیکن پولیس کی لاپرواہی کے سبب اُسے جیل جانا پڑتا ہے اور سزا بھی کاٹنی پڑتی ہے۔ جیل سے رہائی کے بعد شخصیت میں اور کجی پیدا ہو جاتی ہے۔ شیخ پیرو مفلسی کے باعث غیر شادی شدہ ہیں اس لئے کوئی غم گسار بھی نہیں۔ صرف گالیاں بک کر اپنے دکھ کا مداوا تلاش کرتے ہیں اور اپنی ذہنی اذیت کو کم کرتے ہیں۔ حالات کی چکی میں ان کی شخصیت ایسی کچل گئی ہے کہ کچھ نہ کچھ بکتے رہتے ہیں اور پوری شخصیت مضحکہ خیز بن گئی ہے۔ کسی کو ان سے ہم دَردی نہیں بلکی بہت سے لوگ ان کا مضحکہ اُڑاتے ہیں اور

ان سے مذاق کر کے ان کی اذیت میں اضافہ کرتے ہیں، ایسے میں ایک کتا ان کی غم گساری کرتا ہے اور دونوں ایک دوسرے کے رفیق بن جاتے ہیں۔ شیخ پیرو کے اندر ایسی خصلتیں ہیں جو انہیں ایک اعلیٰ انسان بناتی ہیں۔ گاؤں کے لوگ نہ ان کی مالی مدد کرتے ہیں اور نہ ہی کسی قسم کی ہم دَردی۔ ایسے میں لوگوں کو حقہ پلا کر اپنی اور کتے کے پیٹ کی آگ بجھاتے ہیں۔ گاؤں کے لوگ شیخ پیرو کے ساتھ چاہے جس طرح کا سلوک کریں لیکن انہیں گاؤں والوں کے لئے وہ شب بیداری کرتے ہیں اور پہرے دیتے ہیں۔ اس کام میں کتا بھی ان کے ہم رَاہ ہوتا ہے۔ جب شیخ پیرو پر حملہ ہوتا ہے تو کتا اپنی وفاداری کا ثبوت دیتے ہوئے اپنی جان قربان کر دیتا ہے۔ کتے کی وفاداری اور اپنے رفیق کا یہ انجام دیکھ ان کے اوپر جنونی کیفیت طاری ہو جاتی ہے اور چوروں کو مار کر خود بھی موت کی آغوش میں چلے جاتے ہیں۔ شیخ پیرو ایک ایسا کردار ہے جس سے قاری کو بے پناہ ہم دَردی ہوتی ہے اس کے ساتھ ہی پولیس کے اس ظالمانہ نظام سے بھی نفرت کا احساس ہوتا ہے جو ایک بے ضرر انسان کو مجرم بنا دیتا ہے۔ پولیس کی لاپرواہی کے نتیجہ میں شیخ پیرو کی شخصیت کچل کر بے وقعت ہو جاتی ہے۔ تاہم ان تمام حالات میں شیخ پیرو کا کردار بڑی اہمیت کا حامل اور پر کشش بھی ہے۔ شیخ پیرو کا گاؤں والوں کے لئے جگنا، پہرہ دینا اور پھر اپنی جان قربان کر دینا ایسا کارنامہ ہے جو ان کی شخصیت کو انسانی معراج تک پہنچاتا ہے۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:۔

﴿۸﴾ شیخ پیرو کا نام کس سے ملتا تھا؟

﴿۹﴾ شیخ پیرو کا ذریعۂ معاش کیا تھا؟

﴿۱۰﴾ شیخ پیرو کے کردار کا مطالعہ کس نظام سے نفرت پیدا کرتا ہے؟

11.08 خلاصہ

رشید احمد صدیقی ۲۴ر دسمبر ۱۸۹۲ء کو پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم کے بعد علی گڑھ مسلم یونیورسٹی جو اس زمانے میں ایم.اے.او کالج میں داخلہ لیا اور وہی تعلیم سے فراغت کے بعد درس وتدریس سے وابستہ ہوئے۔ انہیں علی گڑھ سے بے پناہ محبت اور عقیدت تھی۔ گاؤں میں پیدا ہوئے اور وہیں بچپن گزارا، باقی ایام شہر کے نذر ہوئے۔ گاؤں اور شہر دونوں کی زندگی کو قریب سے دیکھا۔ اسی لئے ان کی تحریروں میں گاؤں اور شہر دونوں جگہوں کی تصویریں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ البتہ علی گڑھ اور وہاں کی زندگی سے وہ بے حد مرعوب تھے جس کا ذکر اکثر ان کے تحریروں میں ہوتا ہے۔

اردو ادب میں رشید احمد صدیقی کو اہم مقام حاصل ہے۔ انہوں نے کئی کتابیں تحریر کی ہیں جن میں ''طنزیات ومضحکات، جدید غزل، غالبؔ کی شخصیت وشاعری، خنداں، اور' مضامینِ رشید، ذاکر صاحب، گنج ہائے گراں مایہ، ہم نفسانِ رفتہ، آشفتہ بیانی میری'' وغیرہ کتابوں کو اہمیت واعتبار حاصل ہے۔ رشید احمد صدیقی نے مختلف موضوعات پر قلم اُٹھایا ہے تاہم انہیں شہرت ایک طنز ومزاح نگار کی حیثیت سے حاصل ہے۔ انہوں نے معاشرے پر تنقیدی نگاہ ڈالی اور اس میں پائی جانے والی برائیوں اور برے نظام کو اپنے طنز کا نشانہ بنایا۔ شہر اور گاؤں دونوں کی زندگی پر ان کی بڑی گہری نگاہ تھی اور اس کی خوبیوں خامیوں سے وہ واقف تھے اور انہیں پیش کرنے کا سلیقہ بھی آتا تھا رشید احمد صدیقی کے فن میں بلاغت ہے۔ تلمیحات کے استعمال اور شعر وادب کے حوالے سے انہوں نے اپنی تحریروں کو پُر مغز بنایا ہے جس کے باعث ان کی تحریریں ادبی نقطۂ نظر سے وقیع اور باوقار ہو گئی ہیں۔

دوسری اصناف کی طرح اردو میں خاکہ نگاری بھی نثر کی ایک اہم صنف ہے لیکن اردو کے بہت کم ادیبوں نے اس صنف پر توجہ کی جس کی وجہ سے یہ صنف زیادہ مقبول نہ ہوسکی۔ عام طور پر خاکے میں مصنّف کسی انسان کی باطنی صفات کو موضوع بناتا ہے اور ایسے افراد کا خاکہ پیش کرتا ہے جس سے وہ اپنی ذہنی قربت محسوس کرے۔ خاکہ میں وحدتِ تاثر کا پایا جانا بھی ضروری ہے۔ خاکہ میں مصنّف کسی ایک شخص کا انتخاب کرتا ہے۔ اسی کے گرد اپنے خیالات کا تانا بانا بنتا ہے۔ پوری کہانی میں اس شخص کو مرکزی حیثیت حاصل ہوتی ہے۔ افسانوی کرداروں سے خاکہ مختلف ہوتا ہے۔ اسی طرح خاکہ، سوانح، خودنوشت اور سرگذشت سے بھی علیحدہ ایک صنف ادب ہے۔

شیخ پیرو رشید احمد صدیقی کا تحریر کردہ ایک اہم خاکہ ہے جس میں ایک ایسے شخص کی کہانی کو بیان کیا گیا ہے جو بے ضرر ہے اور پولیس کے مظالم کا شکار ہوجاتا ہے۔ پولیس کی لاپرواہی سے شیخ پیرو کو جیل جانا پڑتا ہے اور انہیں سزا بھی ہوجاتی ہے۔ رہائی کے بعد وہ بدمزاج ہو جاتے ہیں اور گاؤں کے لڑکے ان کو چھیڑتے ہیں۔ دنیا میں کوئی ان کا درد باٹنے والا نہیں۔ ایسے میں ایک کتا ان کا ہمراز بنتا ہے۔ گاؤں میں وبا آئی تو شیخ پیرو راتوں کو جاگ کر گاؤں والوں کی حفاظت کرنے لگے اور ایک روز چوروں سے مقابلہ کرتے ہوئے وہ اور ان کا کتا دونوں موت کی آغوش میں چلے جاتے ہیں۔ ان کی تدفین کے بعد گاؤں کے لوگ سمجھتے ہیں کہ اب وَبا کا خاتمہ ہوجائے گا کیوں کہ سب سے بڑے آدمی کی موت ہوچکی ہے۔

اس خاکہ میں بہت گہرا طنز ہے اور رشید احمد صدیقی نے پولیس کی لاپرواہی سے برباد ہونے والی ایک زندگی کو موضوع بنایا ہے اس میں پولیس کی کارکردگی کا بھی مضحکہ اُڑایا گیا ہے۔ اسی کے ساتھ ہی معاشرے کے ان افراد پر بھی گہرا طنز ہے جو شیخ پیرو سے کسی قسم کی ہم دَردی نہیں رکھتے اور جن کے لئے شیخ پیرو جان تک قربان کردیتے ہیں۔ اسی کے ساتھ ہی کتے جیسے جانور کے ذریعہ وفاداری دکھلا کر مصنّف نے یہ تاثر دینے کی کوشش کی ہے کہ انسان اپنے لئے اشرف المخلوقات کا دعوے دار ضرور ہے تاہم ایک معمولی سا جانور اس سے زیادہ وفاداری کا ثبوت دیتا ہے۔ یہ پورا خاکہ انسان اور اس کے افعال پر گہرا طنز ہے جس کی ضرب سے قاری بے چینی محسوس کرتا ہے۔

11.09 فرہنگ

آشکار	: کھولنا، نمایاں، واضح	کجی	: ٹیڑھا پن
استقلال	: مستقل، پائیدار (Permanent)	متحرک	: حرکت کرنے والا
بشری صفت	: انسانی صفت	مجذوب	: دیوانہ، پاگل
خصلتیں	: عادتیں	مشاہدات	: تجربات
غم گُساری	: غم باٹنا، ہم دَردی	نشیب وفراز	: اتار چڑھاؤ

11.10 نمونہ امتحانی سوالات

الف: درجِ ذیل سوالوں کے جوابات ۱۰/۱۰ سطروں میں دیجیے:

سوال نمبر۱ شیخ پیرو کی موت کس طرح ہوئی؟

سوال نمبر۲ شیخ پیرو کے مرکزی خیال کو بیان کیجیے؟

سوال نمبر۳ شیخ پیرو کی کہانی میں کتے کا کیا رول ہے؟

سوال نمبر۴ شیخ پیرو کو جیل کی سزا کیوں کاٹنی پڑی؟ وضاحت کیجیے۔

ب: درج ذیل سوالوں کے جوابات ۳۰/۳۰ سطروں میں دیجیے:

سوال نمبر۱ ''شیخ پیرو'' کی کہانی تحریر کیجیے۔

سوال نمبر۲ رشید احمد صدیقی کے حالاتِ زندگی بیان کیجیے۔

سوال نمبر۳ رشید احمد صدیقی کی ادبی خدمات کا جائزہ لیجیے۔

سوال نمبر۴ رشید احمد صدیقی کے اسلوب نگارش پر روشنی ڈالیے۔

سوال نمبر۵ رشید احمد صدیقی کے خاکے ''شیخ پیرو'' کے تعلق سے اپنی رائے کا اظہار کیجیے۔

11.11 حوالہ جاتی کتب

۱۔	اصناف ادب اُردو	از	قمر رئیس اور خلیق انجم
۲۔	انتخاب رشید احمد صدیقی	از	شہاب الدین ثاقب
۳۔	خنداں	از	رشید احمد صدیقی
۴۔	مضامین رشید	از	رشید احمد صدیقی

11.12 اپنے مطالعے کی جانچ کے جوابات

﴿۱﴾ ۲۴/دسمبر ۱۸۹۲ء کو قصبہ مڑیاہوں ضلع جون پور یو پی میں رشید احمد صدیقی کی پیدائش ہوئی۔

﴿۲﴾ علی گڑھ سے گہرا لگاؤ تھا

﴿۳﴾ ۱۵/جنوری ۱۹۷۷ء کو علی گڑھ میں انتقال ہوا۔

﴿۴﴾ رشید احمد صدیقی کی

﴿۵﴾ قاری کا خاصا پڑھا لکھا ہونا ضروری ہے۔

﴿۶﴾ خاکے کا کردار حقیقی ہوتا ہے جب کہ افسانہ کا فرضی۔

﴿۷﴾ خاکہ نگاری کی صنف کو انگریزی میں Sketch کہتے ہیں۔

﴿۸﴾ شیخ پیرو کا نام میرو نام کے ڈاکو سے ملتا تھا۔

﴿۹﴾ لوگوں کو حقہ پلانا۔

﴿۱۰﴾ پولیس کے نظام سے نفرت پیدا کرنا۔

اکائی 12 یادش بخیریا : مشتاق احمد یوسفی

ساخت

12.01 : اغراض ومقاصد
12.02 : تمہید
12.03 : طنز ومزاح کی تعریف اور فرق
12.04 : مشتاق احمد یوسفی کی تصانیف
12.05 : مشتاق احمد یوسفی کی نگارشات کے موضوعات
12.06 : مشتاق احمد یوسفی کی نگارشات اور اُسلوب کی فنّی خصوصیات
12.07 : مشتاق احمد یوسفی کی نگارشات کے چند فن پارے
12.08 : یادش بخیریا (اقتباس)
12.09 : یادش بخیریا (اقتباس) کا تجزیہ
12.10 : خلاصہ
12.11 : فرہنگ
12.12 : نمونہ امتحانی سوالات
12.13 : حوالہ جاتی کتب

12.01 اغراض ومقاصد

آپ بخوبی واقف ہوں گے کہ کسی ادب میں طنز ومزاح کا ادبی سرمایہ خواہ وہ نثر میں ہو یا نظم میں، اُس زبان کے ادب کا تہذیبی وفکری رجحان کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ اگرچہ اُردو کا طنزیہ ومزاحیہ سرمایہ بہت قدیم نہیں ہے پھر بھی یہ مخصوص تہذیبی وفکری پس منظر میں نہایت معنی خیز، پختہ تر اور اہم ہے۔ دراصل اُردو زبان کا مزاحیہ ادب تہذیبی اور فکری اعتبار سے اِرتقا کے مختلف مراحل سے گزر چکا ہے۔ اُردو کے طنز ومزاح نگاروں میں مشتاق احمد یوسفی کا شمار ممتاز ومنفرد ادیبوں میں کیا جاتا ہے۔ اس لئے اُردو کے ہر طالب علم کے لئے ضروری ہے کہ وہ اُن کے افکار و نظریات اور اُسلوب وفن سے پوری طرح واقف ہو۔ اسی اغراض و مقاصد کے تحت اس اکائی میں مشتاق احمد یوسفی کی تصانیف، اُن کے موضوعات، اُن کے اُسلوب اور اُن کی نگارشات کی فنّی خصوصیات کے مطالعہ کو شامل کیا گیا ہے۔

اس اکائی میں اُن کے شہرہ آفاق انشائیہ ''یادش بخیریا'' کے متن کو بھی شامل کیا گیا ہے اور اُس کا تجزیہ بھی کیا گیا ہے تاکہ آپ اُن کے پسندیدہ موضوع اور ''یادش بخیریا'' کی خصوصیات سے اچھّی طرح واقف ہو جائیں۔ مشتاق احمد یوسفی کے اُسلوب وفن اور نظریات سے اچھّی طرح واقفیت حاصل کرنے نیز آپ کی معلومات میں مزید اضافہ کی غرض سے اُن کی نگارشات کے چند اقتباسات یا فن پاروں کو بھی تحریر کیا گیا ہے۔

12.02 تمہید

بیسویں صدی کے نصف آخر میں جن ادیبوں نے طنز و مزاح کے فن کی روایت میں اضافہ کیا ہے اور قابلِ قدر کارنامے انجام دِیے ہیں اُن میں مشتاق احمد یوسفی کا نام نہایت اہم ہے۔ اُنہوں نے اپنی جدّتِ طبع سے اس فن کو نکھارا بھی ہے اور اسے نئے لب و لہجے کے ساتھ نئی معنویت بھی عطا کی ہے۔ اُن کی طنزیہ و مزاحیہ نگارشات صرف تفریحِ طبع کے سامان فراہم نہیں کرتی ہیں بلکہ تعمیر و اصلاح کے جذبے کو بھی جلا بخشتی ہیں۔ اُن کے اُسلوب میں دل کشی، بے ساختگی اور روانی پائی جاتی ہے۔

دَورِ حاضر میں طنز و مزاح کی اہمیت و افادیت میں گونا گوں اضافہ ہو رہا ہے اور متعدد ادیب بھی اس فن کی طرف سنجیدگی سے متوجّہ ہوئے ہیں۔ اس لئے ادب کے طلبا و طالبات کے لئے طنز و مزاح کے فن اور اس فن کے اہم ادیبوں کی شخصیت، اُسلوب اور نگارشات سے واقفیت ضروری ہے۔ مشتاق احمد یوسفی اُردو کے طنز و مزاح نگاروں میں منفرد و ممتاز مقام رکھتے ہیں۔ اس لئے اُن کی شخصیت، اندازِ بیان اور نگارشات کی خصوصیات کا مطالعہ کرنا نہایت ضروری ہے۔

12.03 طنز و مزاح کی تعریف اور فرق

مشتاق احمد یوسفی کے یہاں طنز بھی ہے اور مزاح بھی۔ اس لئے طنز و مزاح کے فرق کو سمجھنا ضروری ہے۔ اگر چہ طنز اور مزاح کی جداگانہ اہمیت کے باوجود دونوں کو خلط ملط کر دیا جاتا ہے۔ اس لئے ان کی بنیادی خصوصیت سے واقفیت ضروری ہے۔ مزاح کو انگریزی میں ہیومر (Humour) اور طنز کو سٹائر (Satire) کہتے ہیں۔ مزاح زندگی کی ناہم وَاریوں کے اُس ہم دَردانہ شعور کا نام ہے جس کا اظہار فن کارانہ طور پر کیا جاتا ہے۔ اگر غم و غصّہ، غیظ و غضب اور تلخی سے پرہیز کرتے ہوئے کسی خامی، بدصورتی، بے تُکی بات یا پھوہڑ پن پر خوش دلی سے مسکرایا یا ہنسا جائے تو اُسے مزاح یا ظرافت کہیں گے۔ مزاح یا ظرافت کا مقصد ہنسی مذاق کے پیرائے میں اصلاح کرنا بھی ہوتا ہے۔

زندگی کے تضاد، معاشرے اور سماج کی خامیوں، کوتاہیوں، ناہم وَاریوں، زیادتیوں، بے انصافیوں وغیرہ کی طرف اشارے کرنے کو طنز کہتے ہیں۔ بہترین طنز ذاتی عناد اور تعصّب سے پاک بھی ہوتا ہے اور ذہن و فکر کی بے لوث برہمی یا شگفتگی کا نتیجہ بھی ہوتا ہے۔ طنز میں کسی بُرائی یا خامی کو کچھ زیادہ ہی بُرا بنا کر اس طرح پیش کیا جاتا ہے کہ لوگ اُس بُرائی کو ترک کرنے کے لئے غور و فکر کرنے لگیں۔ طنز کے ذریعہ نفرت یا ناپسندیدگی کا اظہار براہِ راست نہیں کیا جاتا ہے بلکہ ایسے جملے ادا کیے جاتے ہیں جو تلخ ہونے کے باوجود لطف کا بھی احساس کراتے ہیں۔

12.04 مشتاق احمد یوسفی کی تصانیف

مشتاق احمد یوسفی کی چار کتابیں منظرِ عام پر آ چکی ہیں جن کے نام بالترتیب چراغ تلے، خاکم بدہن، زرگزشت اور آبِ گُم ہیں۔ چراغ تلے اور خاکم بدہن مختلف عنوانات کے انشائیوں کے مجموعے ہیں جب کہ زرگزشت اور آبِ گُم میں موضوع کا تسلسل ہے۔ آپ کو اُن کے فن اور طرزِ تحریر سے اچھی طرح واقفیت ہو جائے اس لئے اُن کی متذکرہ چاروں کتابوں کا مختصر تعارف پیش کیا جا رہا ہے۔

چراغ تلے : ''چراغ تلے'' مشتاق احمد یوسفی کی پہلی تصنیف ہے جس کے مقدّمہ کا عنوان ''پہلا پتھر'' ہے۔ اس تصنیف میں بارہ انشائیوں کی شمولیت ہے جن کے عنوانات: ''پڑیئے گر بیمار، کافی، یادش بخیر یا، موذی، سنہ، جنون لطیفہ، چار پائی اور کلچر، اور آنا گھر میں مُرغیوں کا، کرکٹ، صنف لاغر، موسموں کا شہر اور کاغذی ہے پیرہن'' ہیں۔ کتاب کا مقدّمہ ''پہلا پتھّر'' طنز و مزاح کا حسین

امتزاج ہے۔ انہوں نے اس کے ذریعہ اپنی اہلیہ کے تعارف کے ساتھ اپنے ہم زاد مرزا عبدالودود بیگ کی شخصیت سے بھی روشناس کرایا ہے اور کتاب کے لئے تقریظ یا مقدّمہ لکھنے اور لکھوانے والوں کا بھی نہایت شائستہ انداز میں مضحکہ اُڑایا ہے۔ ''یادش بخیریا'' ناسٹلجیا (Nostalgia) یعنی ماضی تمنّائی میں مبتلا افراد کی نفسیات، محدود ذہنیت اور خود مشتاق احمد یوسفی کے ذہنی وفکری رجحان کا بھی عکّاس ہے۔

''پڑیئے گر بیمار'' میں اُن تیمارداروں اور عیادت کرنے والوں کا مضحکہ اُڑایا گیا ہے جو طرح طرح کی باتیں کرکے مریض کو نہ صرف وہم میں مبتلا کر دیتے ہیں بلکہ اُس کے لئے وبالِ جان بھی بن جاتے ہیں۔ ''کافی'' ایک طویل انشائیہ ہے جس میں کافی کے مُضر اثرات کو دل چسپ انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ ''موذی'' میں مرزا کے بار بار سگریٹ نوشی ترک کرنے اور بار بار اُسے اپنانے کے جواز کو پُر لطف انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ انشائیہ ''سنہ'' میں واقعات کی تاریخیں حفظ کرنے کی پریشانیوں اور اُلجھنوں کی عکّاسی کی گئی ہے۔ خانساماؤں کے دستیاب نہ ہونے کی شکایت اور اُن کے ذریعہ بدمزہ کھانوں کو کس طرح زہر مار کر کھانا پڑتا ہے کو چٹخارے کے ساتھ ''جنونِ لطیفہ'' میں بیان کیا گیا ہے۔

''چارپائی اور کلچر'' میں چارپائی اور تہذیب کے رشتہ پر روشنی ڈالنے کے ساتھ چارپائی کی خوبیوں اور خامیوں کو بھی بیان کیا گیا ہے۔ ساتھ ہی چارپائی کے مختلف نام بھی گنوائے گئے ہیں۔ ''اور آنا گھر میں مُرغیوں کا'' کے ذریعہ یوسفی نے مُرغیوں کے ذریعہ گندگی پھیلانے اور پڑوسیوں سے تعلّقات خراب ہونے جیسے واقعات کو نہایت دل چسپ انداز میں پیش کیا ہے۔ ''کرکٹ'' یوسفی کا مزاحیہ انشائیہ ہے جو کرکٹ کے کھیل کی کمنٹری بھی ہے اور اُس کی ہجو بھی۔ ''صنفِ لاغر'' میں انشائیہ نگار نے عورتوں کی نفسیات اور مردوں کی خواہشات کی عکّاسی ظریفانہ انداز میں کی ہے اور اُن عورتوں کو نشانہ بنایا ہے جو خود سبک اندام نظر آنے کے لئے طرح طرح کے جتن کرتی ہیں۔ ''موسموں کا شہر'' میں کراچی کے خراب موسم کی عکّاسی کی گئی ہے۔ ''کاغذی ہے پیرہن'' کا انداز مکالماتی ہے۔ مصوّر، مرزا، زبیر اور ساجد کے ذریعہ جدید آرٹ کے موضوع کو گفتگو اور بحث کے ذریعہ پیش کیا گیا ہے اور باتوں ہی باتوں میں معاشرے کی برائیوں کی طرف اشارے بھی کیے گئے ہیں۔

خاکم بدہن : ''خاکم بدہن'' مشتاق احمد یوسفی کا دوسرا مجموعۂ مضامین ہے۔ ''دستِ زُلیخا'' کے نام سے ایک دیباچہ کے علاوہ صبغے اینڈ سنز سوداگران وناشرانِ کتب، سیزر ماتاہری اور مرزا، بارے آلو کا کچھ بیان ہو جائے، پروفیسر، ہوئے مر کے ہم جو رسوا، ہل اسٹیشن، بائی فوکل کلب اور چند تصویرِ بتاں کے عنوانات سے آٹھ انشائیے اور خاکے اس مجموعے میں شامل ہیں۔ دیباچہ کی ابتدا بابائے انگلش شمویل جانسن کے مزاحیہ فقرے ''جو شخص روپۓ کے علاوہ کسی اور جذبہ کے تحت کتاب لکھتا ہے اُس سے بڑا احمق روئے زمین پر کوئی نہیں'' سے کی گئی ہے۔ مرزا عبدالودود بیگ اور پروفیسر عبدالقدّوس کے افعال وکردار کے ذریعہ اُن کی شخصیت کے مختلف گوشوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ ان دو کرداروں کے علاوہ صبغے اور ضرغوص جیسے کئی کرداروں کی مدد سے مشتاق احمد یوسفی نے اپنے افکار ونظریات کو بڑی خوبی سے پیش کیا ہے۔

''صبغے اینڈ سنز سوداگران وناشرانِ کتب'' کا صبغے اپنے ذوق ومعیار کے مطابق اپنی پسندیدہ ایسی کتابیں ہی فروخت کرنے کے لئے اپنی دُکان میں رکھتا ہے جس کی بازار میں مانگ نہیں ہوتی ہے۔ اس انشائیہ کے ذریعہ یوسفی نے مشاعروں کے روبہ زوال ادبی ذوق کو بھی طنز کا نشانہ بنایا ہے۔ ''سیزر ماتاہری اور مرزا'' میں مرزا کی شخصیت کے علاوہ سیزر کُتّا اور ماتاہری کُتیا کے گرد خیالات کا تانا بانا بُنا گیا ہے۔ یہ انشائیہ

طربیہ انداز سے شروع ہو کر المیہ پر ختم ہوتا ہے۔اس کے ذریعہ سماج کی بُرائیوں کو اُجاگر کرنے کے ساتھ کُتّے کو ایک وفادار جانور ثابت کیا گیا ہے۔کُتّے کی دردناک مَوت کے ساتھ اس انشائیہ کا اختتام کیا گیا ہے۔انشائیہ ''بارے آلو کا کچھ بیان ہو جائے'' آلوؤں کی مدح بھی ہے اور ہجو بھی۔

''پروفیسر'' کا مرکزی کردار عبدالقدّوس ہے جو بینک میں ملازم ہے اور اپنی احمقانہ حرکتوں سے تفریح کا سامان فراہم کرتا رہتا ہے۔سطحی رسائل کے مدیروں سے تنگ آنے،مشاعروں کا انعقاد کرنے،ٹیلی فون پر اشعار سُننے سُنانے اور اسی طرح کی دیگر حرکتوں کے ذریعہ اُس کے خاکہ میں مزاح کا رنگ بھرا گیا ہے۔خود ساختہ رائے دینے کے سبب پروفیسر کا کردار بھی نہایت دل چسپ ہے۔''ہوئے مر کے ہم جو رسوا'' میں مَوت اور تدفین کے وقت غیر شرعی رسومات،آں جہانی کی ذات میں خواہ مخواہ اچھّائیاں تلاش کرنے اور چہلّم میں پیٹ بھر کھانا کھانے والوں پر طنز کے تیر چلائے گئے ہیں۔''ہِل اسٹیشن'' میں پہاڑی سفر کو دل چسپ انداز میں پیش کیا گیا ہے۔اس سفر میں مرزا عبدالودود بیگ،پروفیسر قدّوس اور ضرغوص بھی مصنّف کے ہم رکاب ہیں۔پروفیسر قدّوس پر قدامت کا رنگ چڑھا ہے اور ضرغوص نئی قدروں کا دل دَادہ ہے۔یہ انشائیہ قدرتی مناظر کی تصویر کشی کے ساتھ زندگی کے تلخ حقائق کو بھی نمایاں کرتا ہے۔

مصنّف نے ''بائی فوکل کلب'' میں اپنی مستقل علالت کو موضوع بنا کر خود اپنا مضحکہ اُڑایا ہے۔اس انشائیہ میں مرزا اپنی نازیبا حرکتوں اور غلط مشوروں سے دل چسپی کے سامان فراہم کرتا رہتا ہے۔اسی انشائیہ میں قوّالی میں حال آنے اور اُودھم چوکڑی مچانے کی کیفیات کی مذمّت پُرلطف انداز میں بیان کی گئی ہے۔''چند تصویر بتاں'' میں فوٹو گرافی کے فن میں درک نہ ہونے کے باعث اپنے احباب سے تعلّقات خراب ہونے کی حکایت کو دل چسپ انداز میں پیش کر کے ایسے افراد کا مضحکہ اُڑایا گیا ہے جو اپنے پیشے میں مہارت نہیں رکھتے ہیں۔

زَرگزشت : ''زرگزشت'' موضوع اور مواد کے اعتبار سے خود نوشت سوانح سے قریب ہے۔مشتاق یوسفی نے سرگزشت کو زرگزشت اور سوانح عمری کو سوانح نَو عمری تحریر کیا ہے۔اس کتاب کے مقدّمہ کا نام تزکِ یوسفی ہے۔سبق یہ تھا پہلا کتابِ ربا کا، رہے دیکھتے اَوروں کے عیب و ہنر،کیا کوئی وحشی اور آ پہنچا یا کوئی قیدی چھوٹ گیا،پروٹوکول،فینی ڈارلنگ،کوئی قلزم کوئی دریا کوئی قطرہ،مدد ے، جانا ہمارا کاک ٹیل پارٹی میں،موصوف اور موصوفہ کے ابواب کے تحت متعدّد ذیلی عنوانات قائم کر کے مشتاق احمد یوسفی نے اپنی ملازمت کے دَوران پیش آنے والے واقعات کا ذکر نہایت سلیقہ اور ہنر مندی سے کیا ہے اور مقدمہ میں خود اپنا مضحکہ بھی اُڑایا ہے۔

اگرچہ یہ کتاب سوانحی ہے مگر اس کے ذریعہ مشتاق احمد یوسفی کی زندگی،خاندانی حالات،اہل وعیال،ادبی سفر،ذوق وشوق وغیرہ پر خاطر خواہ روشنی نہیں پڑتی ہے۔بس معمولی سی واقفیت ہوتی ہے جیسے اُن کی پرورش راجستھان کے ایک مذہبی گھرانے میں ہوئی۔اُن کے والد کٹّر مذہبی تھے جو تصاویر اور سود کو قطعی ناجائز تصوّر کرتے تھے اور خود یوسفی بھی بینک کی ملازمت کو شرع کی رو سے حرام سمجھتے تھے۔

زرگزشت کا اندازِ بیان پُرکشش اور ساحرانہ ہے۔واقعات کے بیان میں غلو کا پہلو اس قدر نمایاں ہے کہ حقیقی واقعات بھی غیر حقیقی معلوم ہونے لگتے ہیں۔البتّہ واقعات کی ترتیب اور کرداروں کی تشکیل نہایت فن کاری اور چابک دستی سے کی گئی ہے۔یوسفی نے مزاحیہ پیرائے میں جگہ جگہ ادیبوں،شاعروں اور عصری ادب پر چوٹیں بھی کی ہیں اور معاشرے میں پھیلی بُرائیوں کی طرف اشارے بھی کیے ہیں۔

مشتاق احمد یوسفی نے بینک کے جملہ افراد اور دیگر کرداروں کے عمل سے اپنی نوکری پیشہ زندگی کی پُر لطف عکّاسی کی ہے۔ اُنہوں نے انٹرویو کا نقشہ بڑے دل کش انداز میں پیش کیا ہے۔ زرگزشت میں کرداروں کی بھرمار ہے اور ہر کردار منفرد حیثیت کا حامل ہے۔ بینک کا مینیجر مسٹر اینڈرسن بلانوش ہے، یعسوب الحسن غوری شکّی مزاج اور عبدالرّحمٰن قالب لفّاظ ہے۔ سابق سیکنڈ لیفٹیننٹ نوّاب محمد عمر مجاہد نجاس پاشا کنجو جسے این.ایم. یو.ایم.این. پی. کنجو کہا جاتا ہے، نہایت عیّار اور چرب زبان ہے۔ سیف الملوک خاں لن ترانیوں سے دل چسپی کے سامان فراہم کرتا رہتا ہے۔ نورالحسن شیخ فراڈ کرنے اور محیر العقول چیزیں ایجاد کرنے میں ماہر ہے۔ جرمن لیڈی کی رعنائیوں، حشر سامانیوں، جنسی بے راہ رَوی، تعیش پسندی اور بلانوشی کی عکّاسی دل چسپ پیرائے میں کی گئی ہے۔ ان کے علاوہ دیگر کردار بھی اہمیت کے حامل ہیں جن کے ذریعہ مشتاق احمد یوسفی نے بینک کی ملازمت کی زندگی کو دل چسپ انداز میں بیان کیا ہے۔

آبِ گُم : پانچ ابواب پر مشتمل مشتاق احمد یوسفی کی چوتھی کتاب ''آبِ گُم'' کا آغاز غنودیم غنودیم (پس وپیش لفظ) سے ہوتا ہے جسے مقدمہ بھی کہا جا سکتا ہے۔ ابواب کے عنوانات حویلی، اسکول ماسٹر کا خواب، کارکابلی والا اور الہ دین بے چراغ، شہر دو قصّہ اور دھیرج گنج کا پہلا یادگار مشاعرہ ہیں۔ مشتاق احمد یوسفی نے شروع میں منور حُسین کی مَوت اور میاں احسان الٰہی کی طویل علالت کے تذکرہ کے ساتھ تیسری دنیا کے سیاسی بحران پر نکتہ چینی بھی کی ہے اور کرداروں کی نفسیات سے بھی واقف کرایا ہے۔ اس طرح اس تصنیف میں طنز و مزاح کے ساتھ سنجیدگی کی فضا کو بھی برقرار رکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ آبِ گُم کہانی نما خاکوں کا مجموعہ ہے یا ناول؟ اس پر اہلِ فن متفق الرّائے نہیں ہیں۔ آل احمد سرور نے اسے بے فارم کی فارم کا نام دیتے ہوئے صنف کے اس ابہام کو آبِ گُم کی صفت قرار دیا ہے۔

آبِ گُم کا پہلا باب ''حویلی'' ہے جس میں بشارت علی فاروقی کے خسر کا دل چسپ خاکہ پیش کیا گیا ہے۔ موصوف نہایت مغلوب الغضب واقع ہوئے ہیں۔ بات بات پر دوسروں کی تذلیل کرنے، مارنے پیٹنے اور گالی بکنے میں اُنہیں مزہ آتا تھا۔ وہ کان پور میں لکڑی کے تاجر تھے اور وہاں اُن کی ایک حویلی بھی تھی۔ وہ ہجرت کر کے کراچی آئے تو اُنہیں کان پور جیسا ماحول میسر نہیں ہوا، ایک دن اُنہوں نے ایک انسپکٹر کو جوتوں سے اس لئے پیٹا کہ اُس نے مکان کا الاٹ مینٹ آرڈر طلب کیا تھا۔ اس جرم کی پاداش میں اُنہیں جیل بھی جانا پڑا تھا۔ وہ کان پور اور کراچی کے ماحول کا موازنہ کرتے ہوئے کان پور کی اپنی حویلی کا فوٹو لوگوں کو اکثر دکھاتے تھے اور کراچی میں دَر دَر ٹھوکریں کھانے کا شکوہ بھی کرتے تھے۔ شعلہ مزاجی کے باوجود وہ اپنی اہلیہ سے بہت محبت بھی کرتے تھے۔

آبِ گُم کا دوسرا باب ''اسکول ماسٹر کا خواب'' بشارت فاروقی کے گھوڑا پالنے کے شوق کا تذکرہ ہے۔ عجلت میں لنگڑا گھوڑا خریدنے کے باعث اُنہیں جن پریشانیوں سے دوچار ہونا پڑا۔ اُن کا بیان مزاحیہ انداز میں کیا گیا ہے۔ بشارت حُسین کے ضعیف والد منشی کرامت حُسین کے کردار بھی اہم ہیں۔ یوسفی نے ایک ایسی بستی کی دل خراش منظر نگاری کی ہے جہاں کے پستہ حال افراد کیڑے مکوڑوں سے بھی بدتر زندگی گزارنے کے لئے مجبور ہیں۔

''کارکابلی والا اور الہ دین بے چراغ'' اس کتاب کا تیسرا باب ہے جو کتاب کے سابقہ باب ''اسکول ماسٹر کا خواب'' میں بیان کی گئی کہانی سے متصل ہے۔ اس بار بشارت فاروقی لنگڑے گھوڑے ہی کی طرح ایک انگریز بیوہ سے پرانی کار خرید کر پھر پریشانی میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ اس باب میں ثقافتی اور تہذیبی صورتِ حال کی بھی عکّاسی کی گئی ہے۔

آبِ گُم کے چوتھے باب ''شہر دو قصّہ'' میں مصنّف نے ناسٹیلجیا سے متعلّق اپنے نظریات وتصوّرات کو وضاحت سے پیش کیا ہے۔ اس باب کے آغاز ہی میں بشارت فاروقی اپنی اہلیہ کی وفات سے خود کو تنہا محسوس کرنے لگتے ہیں۔ اُنہیں اپنے وطن کان پور کی یاد ستانے لگتی ہے۔ وہ کان پور واپس لوٹتے ہیں مگر وہاں کے تغیرات کو دیکھ کر شدید ذہنی صدمے میں مبتلا ہوجاتے ہیں۔ وہ جب کان پور اور کراچی کے ماحول کا موازنہ کرتے ہیں تو اُنہیں اپنے سابقہ خیالات وافعال بے سود معلوم ہونے لگتے ہیں۔ اسی باب میں کان پور کے ایسے مختلف کرداروں کی بھی عکّاسی کی گئی ہے جو ناسٹیلجیا میں مبتلا ہیں۔

آبِ گُم کے آخری باب کا نام ''دھیرج گنج کا پہلا یادگار مشاعرہ'' ہے۔ دھیرج گنج لکھنؤ اور کان پور کے درمیان ایک چھوٹی سی بستی کا نام ہے۔ یہ باب بشارت فاروقی کے انٹرویو، تقرّری، ملازمت پیشہ زندگی اور دھیرج گنج میں ایک مشاعرے کے انعقاد کے ہنگاموں سے عبارت ہے۔ اس میں بیان کیے جانے والے حادثات اور واقعات کا تعلّق آزادی سے قبل ۱۹۳۰ء کی دہائی ہے۔ اس باب میں اسکول کے وسائل کی قلّت، شعری ذوق کے زوال، ٹیپو سلطان کے ساتھ ظالمانہ سلوک، مسلمانوں کی خود اپنی تاریخ سے ناواقفیت وغیرہ کو مؤثر انداز میں بیان کیا گیا ہے۔

12.05 مشتاق احمد یوسفی کی نگارشات کے موضوعات

بہ اعتبارِ موضوعات مشتاق احمد یوسفی کی نگارشات میں تنوّع نظر آتا ہے۔ اُن کے یہاں شب وروز کے حادثات وواقعات اور حیات وکائنات کے متعدّد مسائل کی جلوہ گری ہے۔ وہ چھوٹے چھوٹے واقعات و تجربات اور مختلف الالوان کیفیات کو منعکس کرنے میں مہارت رکھتے ہیں۔ اُن کا مرغوب اور پسندیدہ موضوع ناسٹلجیا (Nostalgia) یعنی ماضی تمنّائی کا مرض ہے۔ انہوں نے اپنی بیش تر نگارشات اور متعدد انشائیوں کے ذریعے اس کے متعلّق نہ صرف اپنے خیالات وتاثرات کو صراحت کے ساتھ پیش کیا ہے بلکہ اس کی تعریف وتوضیح بھی کی ہے۔ ''یادش بخیریا'' کا مرکزی خیال اور محور بھی ناسٹلجیا ہے۔ ''بارے آلو کا کچھ بیان ہوجائے'' کے مرزا عبدالودود بیگ بھی ناسٹلجیا کے مرض میں مبتلا نظر آتے ہیں۔ انہوں نے زرگزشت کے کردار عبدالرحمٰن قالب کے ناسٹلجیا کو اس طرح بیان کیا ہے:

> ''اپنی متروکہ حویلی سے زیادہ اُس شفیق نیم کو یاد کرتے ہیں جسے آنگن میں سر جھکائے تنہا کھڑا چھوڑ آئے تھے۔ کہتے تھے مکان کے عوض مجھے مکان الاٹ ہوگیا لیکن حکومت وہ نیم کہاں سے لائے گی جس کی چھاؤں میں پریاں نیند کا جھولا جھلاتی تھیں۔ جس کے نیچے ایک بچّے نے نبولیوں سے آم کی دُکان لگائی تھی۔ جہاں بہنیں گڑیاں کھیلیں، شادی کی شہنائی بجی، باپ کا جنازہ رکھا گیا پھر اسی بوڑھے نیم کی سینک سوگوار ماں نے کانوں میں پہن لی۔''

مشتاق احمد یوسفی نے عصری مسائل کے تحت گردوپیش میں رونما ہونے والے واقعات، معاشرے کی زبوں حالی اور معاشرتی نظام کی خرابیوں کو بھی اپنے خاص پیرائے میں بیان کیا ہے۔ انہوں نے ہم عصر ادیبوں کی خامیوں اور لغزشوں کو بھی بے نقاب کیا ہے جو اُن کی عقابی نظر کے ثبوت کے لئے کافی ہے۔ وہ ادب کے بارے میں لکھتے ہیں:

''کوئی لکھنے والا اپنے لوگوں، ہم عصر ادیبوں، ملکی ماحول ومسائل، لوک روایت اور کلچر سے کٹ کر کوئی زندہ اور تجربے کی دہکتی کٹھالی سے نکلا ہوا فن پارہ تحریر نہیں کرسکتا۔''

اُنہیں اپنے ثقافتی اور تہذیبی ورثے سے بھی گہرا لگاؤ اور وابستگی ہے۔ اسی لئے انہوں نے ثقافتی اور تہذیبی ورثے کی اُن خوبیوں اور خامیوں کو بھی اُجاگر کیا ہے جو تہذیب وثقافت کا حصّہ ہیں یا حصّہ رہیں تھیں۔ پیشِ نظر ہے یہ اقتباس:

''ہم نے یہ بھی دیکھا ہے کہ آدمی کو کھانا اپنی بیوی کے ہاتھ کا پچتا ہے اور پان پرائی کے ہاتھ کا رچتا ہے۔ ساجد رضا لکھنوی تو کہتے ہیں کہ گنگا جمنی خاصدان سے ورق لگی گلوری اُٹھا کر صحیح لب ولہجہ اور انداز سے آداب عرض کہنے کے لئے تین نسلوں کا رَچاؤ درکار ہے۔''

مذہبی معاملات اور دینی اُمور کو مزاح کے پیرایے میں بیان کرنا آسان کام نہیں۔ شاید اسی لئے مشتاق احمد یوسفی نے مذہبی معاملات سے اپنا دامن بچانے کی بھرپور کوشش کی ہے مگر جہاں کہیں بھی انہوں نے باطل نظریات کو موضوع بنایا ہے وہاں دل آزاری کے بجائے مضحکہ خیزی کے پہلو کو بڑی مہارت سے نمایاں کیا ہے۔ پیش ہے یہ اقتباس:

''پیر ومرشد کبھی کراچی تشریف لاتے تو جمعہ اور اتوار کو عصر ومغرب کے درمیان منگھو پیر و پیر کی طرف سفید گھوڑی پر سیر کو نکلتے۔ یہ رکاب تھامے ساتھ ساتھ چلتے۔ انہیں سے مروی ہے کہ حضرت جتنی دیر گھوڑی پر سوار رہتے لید میں سے شمامتہ العنبر کی خوشبو آتی ہے۔ حجرے میں تہجد سے پہلے ببر شیر اپنی دُم سے جھاڑو دیتا ہے۔''

مشتاق احمد یوسفی کی نگارشات میں سیاسی موضوعات بھی جابجا نظر آتے ہیں۔ انہوں نے سیاسی داؤں پیچ اور سیاسی رہنماؤں کی بددیانتی کو نہایت بے باکی سے بےنقاب کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کے نزدیک کسی مُلک کی بدحالی، بدامنی، اخلاقی تنزّلی، تعلیمی پس ماندگی اور معاشرے کی دیگر خرابیاں بالواسطہ یا بلاواسطہ سیاسی رہنماؤں کی بددیانتی کے سبب ہی پروان چڑھتی ہیں۔ اُن کے سیاسی شعور کا اندازہ ذیل کے اس اقتباس سے بھی کیا جاسکتا ہے:

''پاکستان کی افواہوں کی سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ سچ نکلتی ہیں۔ یہ عمل دَس گیارہ سال تک جاری رہے تو حسّاس آدمی کی کیفیت سیسمو گراف کی سی ہوجاتی ہے جس کا کام ہی زلزلوں کے جھٹکے ریکارڈ کرنا اور ہمہ وقت لرزتے رہنا ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ہماری سیاست کا قوام آتش فشاں لاوے سے اُٹھا ہے۔''

مشتاق احمد یوسفی نے جنسی موضوعات پر بھی خامہ فرسائی کی ہے۔ انہوں نے جہاں کہیں بھی جنسی موضوعات کو پیش کیا ہے وہاں سوقیانہ پن، فحاشی اور ابتذال سے دامن بچانے کی بھرپور کوشش کی ہے مگر اُن کے یہاں اس قسم کی تحریروں میں قدرے عریانیت اور جنسی تلذّذ کو بھی محسوس کیا جاسکتا ہے۔ بطورِ مثال پیش ہیں ''کاغذی ہے پیرہن'' کی یہ سطور:

''ذہانت کی وہ چمک جو ایک غبی لڑکے کی آنکھوں میں پیدا ہوتی ہے جس پر پہلے پہل یہ انکشاف ہوا ہو کہ پشواز کے نیچے سارنگی کے تار کی طرح تنا ہوا کٹیلا بدن بھی ہوتا ہے۔''

مشتاق احمد یوسفی غلیظ اشیا، کریہہ مناظر اور بدصورت واقعات کی فضا اس طرح تخلیق کرتے ہیں کہ قاری اور سامع کے دل و دماغ میں اُس کا تعفّن اس طرح چھا جاتا ہے کہ اُسے اُبکائی سی محسوس ہونے لگتی ہے۔

مشتاق احمد یوسفی زندگی کو کسی خاص زاویے یا کسی ایک رُخ سے دیکھنے کے قائل نہیں ہیں۔ وہ اُس کے تضاد کو بڑی فن کارانہ مہارت سے اس طرح پیش کرتے ہیں کہ قاری لطف اندوز بھی ہوتا ہے اور اُس پر اُداسی و دل گرفتگی کی سی کیفیت بھی طاری ہو جاتی ہے۔ انہوں نے مختلف واقعات کے تبصروں کے ذریعہ اپنی نگارشات کو مختلف الجہات بنا دیا ہے۔

12.06 مشتاق احمد یوسفی کی نگارشات اور اُسلوب کی فنّی خصوصیات

مشتاق احمد یوسفی کی نگارشات کے اُسلوب کی بنیادی خصوصیت مزاح ہے۔ اُن کے مزاح میں سادگی، فطری پن، بے ساختگی و برجستگی ہے جس میں کہیں ثقالت اور پیچیدگی نظر نہیں آتی۔ اُن کی بیش تر نگارشات میں طنز و مزاح کا خوب صورت امتزاج پایا جاتا ہے جن میں تفریحِ طبع کے ساتھ اصلاحی جذبے کی بھی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ ذیل کا اقتباس طنز و مزاح کے امتزاج کا بہترین نمونہ ہے:

> ’’مرحوم نے پانچ سال قبل دونوں بیویوں کو اپنے تیسرے سہرے کی بہاریں دکھائی تھیں اور یہ اُن کے مرنے کے نہیں، ڈوب مرنے کے دن تھے۔ مجھے اچھّی طرح یاد ہے کہ انہوں نے انگلیوں پر حساب لگا کر کانا پھوسی کے انداز میں یہ تک بتایا کہ تیسری بیوی کی عمر مرحوم کی پنشن کے برابر ہے۔‘‘

فلسفہ کا شمار انتہائی خشک موضوع میں کیا جاتا ہے۔ تاہم مشتاق احمد یوسفی کی فلسفیانہ تحریروں میں بھی مزاح کی آمیزش نظر آتی ہے۔ وہ فلسفیانہ خیالات کو نہ صرف مزاحیہ اُسلوب میں پیش کرنے میں مہارت رکھتے ہیں بلکہ اُسے پُر مغز بھی بنا دیتے ہیں جیسا کہ اس اقتباس سے بھی ظاہر ہے:

> ’’جس شخص نے ناقابلِ تقسیم رواں دواں وقت کو پہلی بار سیکنڈ، سال اور صدی میں تقسیم کیا اُس نے انسان کو صحیح معنوں میں پیری اور مَوت کا مزہ چکھایا۔ وقت کو انسان جتنی بات تقسیم کرے گا زندگی کی رفتار اُتنی ہی تیز اور نتیجتاً مَوت اُتنی ہی قریب ہوتی جائے گی۔‘‘

مشتاق احمد یوسفی کے بیش تر فن پارے مسرّت کا احساس بھی کراتے ہیں اور غور و فکر کی دعوت بھی دیتے ہیں۔ اُن کے یہاں تنقیدی افکار و خیالات بھی نظر آتے ہیں اور علمی و ادبی رنگ کی جھلکیاں بھی پائی جاتی ہیں۔ بطورِ مثال پیش ہے ’’آبِ گُم‘‘ کا یہ اقتباس:

> ’’جتنی داد طوائفوں کو اُردو فکشن لکھنے والوں سے ملی اُتنی اپنی شبینہ گاہوں سے بھی نہ ملی ہوگی۔ انگریزی فکشن پچھلے تیس برسوں میں بین السطور کا گھونگھٹ اُٹھا کر کھُلّم کھُلّا بین السطور پر اُتر آئی ہے۔‘‘

مشتاق احمد یوسفی کی نگارشات میں روز مرّہ، محاوروں، کہاوتوں، تلمیحات اور ادبی تلمیحات کا برجستہ و برمحل استعمال بھی نظر آتا ہے۔ پیش ہے یہ مختصر اقتباس:

> ’’مثل مشہور ہے کہ سردی یا روئی سے جاتی ہے یا دوئی سے لیکن اگر یہ اسباب ناپید ہوئے اور سردی زیادہ اور لحاف پتلا ہو تو غریب غربا محض منٹو کے افسانے پڑھ کر سو رہتے ہیں۔‘‘

مشتاق احمد یوسفی کو انگریزی ادب وزبان سے گہری واقفیت تھی۔اس لئے اُن کے یہاں انگریزی اور مغربی اُدباء کی نگارشات کے حوالے اور اقتباسات بھی نظر آتے ہیں۔انہوں نے موقع ومحل کی مناسبت سے مشرقی اور مغربی ممالک کے مفکّرین کے اقوال بھی درج کیے ہیں اور اُن کے حوالوں سے بھی اپنی بات میں زور پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔بطورِ مثال پیش ہے یہ مختصر اقتباس:

''سابق صدر سوئیکارنو کا قول ہے کہ تیس بہاروں کے بعد ربر کا درخت اور بنتِ حوّا کسی مصرف کے نہیں رہتے۔''

مشتاق احمد یوسفی اُردو، فارسی اور انگریزی کے اشعار اور مصرعوں کے برمحل استعمال سے اپنی نگارشات کی تزئین کاری میں مہارت رکھتے ہیں۔تحریف نگاری اُن کے فن کی خاص صفت ہے۔وہ لفظوں، جملوں، اصطلاحوں، کہاوتوں، مصرعوں اور اشعار میں معمولی تحریف و تصرّف یا حذف و اضافہ سے مزاحیہ کیفیت پیدا کرنے میں مہارت رکھتے ہیں جیسے انہوں نے سرگزشت کو زرگزشت، سوانح عمری کو سوانح نو عمری، پیش لفظ کو پس و پیش لفظ، عمل دخل کو حمل دخل، جوشؔ ملیح آبادی کو ہوشؔ خلیج آبادی، ہوا خور کو حوا خور، حتی الامکان کو حتی الامتحان، سینۂ شمشیر سے باہر ہے دَم شمشیر کا کو سینۂ ہمشیر سے باہر ہے دَم ہمشیر کا اور کچھ اور چاہیے وسعت مرے بیاں کے لئے کو کچھ اور چاہیے وسعت مری میاں کے لئے تحریر کر کے مزاح پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔

مشتاق احمد یوسفی کو جزئیات نگاری میں بھی ملکہ حاصل ہے۔وہ کسی واقعہ کے بیان، کسی منظر کی تصویر کشی یا کسی چیز کی پیش کش میں اُس کے تمام ممکنہ پہلوؤں کو اس طرح اُجاگر کرتے ہیں کہ اُس کی ہو بہو تصویر نگاہوں میں پھرنے لگتی ہے۔بطورِ مثال پیش ہے یہ اقتباس:

''اور جب یکا یک رُکتی تو پشواز سڈول ٹانگوں پر امربیل کی طرح ترچھی لپٹتی چلی جاتی، سازندے ہانپنے لگتے اور کھرن پر طبلچی کی تنی ہوئی اُنگلیوں سے لگتا کہ خون اب ٹپکا کہ اب ٹپکا۔''

مشتاق احمد یوسفی کے یہاں نادر تشبیہات، بے جوڑ اشیاء، صنعتِ تضاد، سہ حرفی الفاظ، ہم وزن الفاظ، لطائف، قولِ محال، مبالغہ آرائی، طفلانہ معصومیت اور متوازیت کے نمونے جابجا نظر آتے ہیں۔پیش ہے متوازیت کی ایک بہترین مثال:

''جیسے کوئی بے ادب یہ پوچھ بیٹھے کہ غبارِخاطر چائے کی وجہ سے مقبول ہوئی یا چائے غبارِخاطر کے باعث۔''

مشتاق احمد یوسفی کی نگارشات میں درج بالافنّی خصوصیات کے علاوہ اور بھی بہت سی خصوصیات پائی جاتی ہیں جنھوں نے اُن کی نگارشات اور اُن کے اُسلوب کو انفرادی اور امتیازی حیثیت عطا کی ہے۔

12.07 مشتاق احمد یوسفی کی نگارشات کے چند فن پارے

''خچر کی دُم مکھی اُڑانے کے لئے کُتّے کی دُم اعلان وفاداری بلّی کی دُم انکشاف جنس اور اونٹ کی دُم شتر پوشی کے لئے بنائی گئی ہے۔انسان کی دُم اس لئے جھڑ گئی کہ اسے رکھنے کے لئے پتلون میں کوئی جگہ نہیں نیز ڈرل پریڈ وغیرہ میں پچھلی صف والوں کو بڑی تکلیف ہوتی۔''

(زرگزشت ص ۳۲۰)

''جب آدمی کیلے کے چھلکے پر پھسل جائے تو پھر رُکنے اور بریک لگانے کی کوشش ہرگز نہ کرنی چاہیے کیوں کہ اس سے اور زیادہ چوٹ آئے گی۔ بس آرام سے پھسلتے رہنا چاہیے اور پھسلنے کو اِنجوائے کرتے رہنا چاہیے۔ بقول تمہارے استاد ذوقؔ کے ؎

تم بھی چلی چلو یہ جہاں تک چلی چلے

کیلے کا چھلکا جب تھک جائے گا تو خود بخود رُک جائے گا۔ لہٰذا قدم ہی نہیں قلم یا نگاہِ تصوّر بھی پھسل جائے تو ہم اسی اُصول پر عمل کرتے ہیں۔''

(آبِ گم ص ۸۸)

مرزا کے الفاظ ہیں'' کہتے ہیں انگریزی فلموں میں لوگ یوں پیار کرتے ہیں جیسے تخمی آم چوس رہے ہوں۔''

(خاکم بدہن ص ۵۶)

''مگر یہ حقیقت ہے کہ مجھے حنائی اُنگلیاں، صندلی بانہیں، دہکتے رُخسار، گلنار لب، چمپئی بدن اور ان پر اَودی رگوں کے روایتی جال نیلگوں آنکھیں اور ان کے مہین مہین گلابی ڈورے سوائے مغل آرٹ اور اسلامی ناولوں کے کہیں دکھائی نہیں دیتے۔''

(چراغ تلے ص ۱۷۰)

''آدمی ایک دفعہ پروفیسر ہو جائے تو عمر بھر پروفیسر ہی کہلاتا ہے خواہ بعد میں سمجھداری کی باتیں ہی کیوں نہ کرنے لگے۔''

(خاکم بدہن ص ۹۳)

''آگے چل کر جب یہی بچّے پڑھتے ہیں کہ سکندر ۳۵۶ ق م میں پیدا ہوا اور ۳۲۳ ق م میں فوت ہُوا تو وہ اسے کتابت کی غلطی سمجھتے ہوئے استاد سے پوچھتے ہیں کہ یہ بادشاہ پیدا ہونے سے پہلے کس طرح مرا۔ استاد جواب دیتا ہے کہ پیارے بچّو اگلے وقتوں میں ظالم بادشاہ اسی طرح مرا کرتے تھے۔''

(چراغ تلے ص ۸۲)

''قبرستان بھی جائے عبرت ہے۔ کبھی جانے کا اتفاق ہوتا ہے تو ہر قبر کو دیکھ کر یہ خیال آتا ہے کہ جس دن اس میں میّت اُتری ہوگی کیسا کہرام مچا ہوگا۔ رونے والے کیسے بلک بلک کے تڑپ تڑپ کے روئے ہوں گے پھر خود ہی رونے والے دوسروں کو رُلاتے ہیں، باری باری پیوند خاک ہوتے چلے گئے۔ صاحب جب یہی سب کچھ ہوتا ہے تو پھر کیسا سوگ کس کا ماتم کاہے کا رونا۔''

(آب گم ص ۳۱۴)

''ہمارے خیال میں آدمی کو آدمی ڈھونے کی اجازت صرف دو صورتوں میں ملنی چاہیے۔ اوّل اس موقع پر جب دونوں میں سے ایک وفات پاچکا ہو دوسرے اس صورت میں جب دونوں میں سے ایک اردو نقاد ہو جس پر مردے ڈھونا فرض ہی نہیں ذریعۂ معاش اور وجہِ شہرت بھی ہے۔''

(آب گم ص ۱۰۱)

''اونچے گھرانوں میں اب ایسی چارپائیوں (جھلنگا) کو غریب رشتہ داروں کی طرح کونوں کھدڑوں میں آڑے وقت کے لئے چھپا کر رکھا جاتا ہے۔''

(چراغ تلے ص ۱۰۸)

''شعر پڑھتے وقت چہرے پر مرگی کی سی کیفیت میں نے قوالوں کے سوا کسی اور کے چہرے پر اس سے پہلے نہیں دیکھی۔''

(چراغ تلے ص ۸۳)

''اپنے نام کا تلفّظ ین، یم، یو، یم، ین، پی، کنجو فرماتے ہیں۔ ایک دن ہم نے چھیڑا سرکار نے سارا کرناٹک چھوڑ کر یوپی کی خاتون سے کیوں شادی رچائی؟ کھٹا سالن اِملی چانول اور بگھارے بیگن کھاتے کھاتے دانت امل گئے تھے۔ اتفاخ سے ملاقات ہوگئی۔ سلیخہ منہ خاندانی خمری لکھنوی خلیہ خورمہ پکانے میں طاخ خوب صورت اُمور خانہ داری کے قاعدے اور خانون سے واقف اور کیا چاہیے۔ وہ خوخیائے۔''

(زگ ص ۸۴)

''مصوّر نے غلط منزل کی طرف صحیح قدم اُٹھایا ہے اور یہ ہمارے ملک کی اس عام رَوش سے بدرجہا بہتر ہے کہ صحیح منزل کی طرف غلط قدم اُٹھایا جائے۔''

(چراغ تلے ص ۱۸۸)

''دونوں نے ایک دوسرے کو مبارک باد دی اور اس طرح گلے ملے جس طرح دودھیارے ملتے ہیں جو ایک دوسرے کے بہنوئی بھی ہوتے ہیں اور سالے بھی۔''

(آب گم ص ۲۲۹)

12.08 یادش بخیریا (اقتباس)

یادش بخیر! مجھے وہ شام کبھی نہ بھولے گی جب آخر کار آغا تلمیذ الرحمٰن چاکسوی سے تعارف ہُوا۔ سُنتے چلے آئے تھے کہ آغا اپنے بچپن کے ساتھیوں کے علاوہ جواب ایک ہاتھ کی اُنگلیوں پر گنے جاسکتے تھے، کسی سے نہیں ملتے اور جس سہمے سہمے انداز سے انہوں نے مجھ سے مصافحہ کیا، بلکہ کرایا، اس سے بھی یہی ہویدا تھا کہ ہر نئے ملاقاتی سے ہاتھ ملانے کے بعد وہ اپنی اُنگلیاں ضرور گن لیتے ہوں گے۔ دُشمنوں نے اُڑا رکھی تھی کہ آغا جن لوگوں سے ملنے کے متمنّی رہے ان تک رسائی نہ ہوئی اور جو لوگ ان سے ملنے کے خواہش مند تھے، ان کو مُنہ لگانا انہوں نے

کسرِ شان سمجھا۔ انہوں نے اپنی ذات ہی کو انجمن خیال کیا، جس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ مستقل اپنی ہی صحبت نے ان کو خراب کر دیا لیکن وہ خود اپنی کم آمیزی کی توجیہ یوں کرتے تھے کہ جب پُرانی دوستیاں نباہنے کی توفیق اور فرصت میسّر نہیں تو نئے لوگوں سے ملنے سے فائدہ؟ رہے پُرانے دوست تو ان سے بھی نہ ملنے میں زیادہ لطف و عافیت محسوس کرتے۔ اس لیے کہ وہ نفسیات کے کسی فارمولے کی گمراہ کن روشنی میں اس نتیجے پر پہنچ چکے تھے کہ مل کر بچھڑنے میں جو دُکھ ہوتا ہے وہ ذرا دیر مل بیٹھنے کی وقتی خوشی سے سات گُنا شدید اور دیرپا ہوتا ہے اور وہ بیٹھے بٹھائے اپنے دُکھوں میں اضافہ کرنے کے حق میں نہیں تھے۔ سُنا یہ ہے کہ وہ اپنے بعض دوستوں کو محض اس بنا پر محبوب رکھتے تھے کہ وہ ان سے پہلے مر چکے تھے، اور ازبس کہ ان سے ملاقات کا امکان مستقبل قریب میں نظر نہیں آتا تھا، لہٰذا ان کی یادوں کو حنوط کر کے انہوں نے اپنے دل کے ممی خانے میں بڑے قرینے سے سجا رکھا ہے۔

لوگوں نے اتنا ڈرا رکھا تھا کہ مَیں جھجکتا ہوا آغا کے کمرے میں داخل ہُوا۔ یہ ایک چھوٹا سا نیم تاریک کمرہ تھا جس کے دروازے کی تنگی سے معاً خیال گزرا کہ غالباً پہلے موروثی مسہری اور دوسری بھاری بھرکم چیزیں خوب ٹھسا ٹھس جما دی گئیں۔ اس کے بعد دیواریں اُٹھائی گئی ہوں گی۔ مَیں نے کمال احتیاط سے اپنے آپ کو ایک کونے میں پارک کر کے کمرے کا جائزہ لیا۔ سامنے دیوار پر آغا کی ربع صدی پُرانی تصویر آویزاں تھی جس میں وہ سیاہ گاؤن پہنے ڈگری ہاتھ میں لیے، یونیورسٹی پر مُسکرا رہے تھے، اُس کے عین مقابل، دروازے کے اوپر دادا جان کے وقتوں کی ایک کاواک گھڑی ٹنگی ہوئی تھی جو چوبیس گھنٹے میں صرف دو دفعہ صحیح وقت بتاتی تھی۔ (یہ پندرہ سال سے دو بجا رہی تھی) آغا کہتے تھے کہ اس گئی گزری حالت میں بھی یہ ان ''ماڈرن'' گھڑیوں سے بدرجہا بہتر ہے جو چلتی تو چوبیس گھنٹے ہیں مگر ایک دفعہ بھی ٹھیک وقت نہیں بتاتیں۔ جب دیکھو ایک منٹ آگے ہوں گی یا ایک منٹ پیچھے۔

دائیں جانب ایک طاقچے میں جو فرش کی بہ نسبت چھت سے زیادہ نزدیک تھا، ایک گراموفون رکھا تھا، جس کی بالانشینی پڑوس میں بچوں کی موجودگی کا پتا دے رہی تھی۔ ٹھیک اُس کے نزدیک چیڑ کا ایک لنگڑا اِسٹول پڑا تھا، جس پر چڑھ کر آغا چابی دیتے تھے اور چھپّن چھری اور بھائی چھیلا پٹیالے والے کے گھسے گھسائے ریکارڈ سُنتے۔ (سُننے میں کانوں سے زیادہ حافظے سے کام لیتے تھے) اس سے ذرا ہٹ کر برتنوں کی الماری تھی جس میں کتابیں بھری پڑی تھے ان کے محتاط انتخاب سے ظاہر ہوتا تھا کہ اردو میں جو کچھ لکھا جانا تھا وہ پچیس سال قبل لکھا جا چکا ہے۔ (اسی زمانے میں سُنا تھا کہ آغا جدید شاعری سے اس حد تک بیزار ہیں کہ نئے شاعروں کو ریڈیو سیٹ پر بھی ہوٹ کرنے سے باز نہیں آتے۔ اکثر فرماتے تھے کہ ان جوان رگوں میں روشنائی دَوڑ رہی ہے) آتش دان پر سیاہ فریم میں جڑا ہوا الوداعی سپاس نامہ رکھا تھا جو اُن کے ماتحتوں نے پندرہ سال قبل پرانی دلّی سے نئی دلّی تبادلہ ہونے پر پیش کیا تھا۔ اس تقریب میں یادگار کے طور پر آغا نے اپنے ماتحتوں کے ساتھ گروپ فوٹو بھی کھنچوایا جس میں آغا کے علاوہ ہر شخص نہایت مطمئن و مسرور نظر آتا تھا۔ یہ پائینتی ٹنگا تھا تاکہ رات کو سونے سے پہلے اور صبح اُٹھنے کے بعد آئینۂ ایّام میں اپنی ادا دیکھ سکیں۔

مجھے اچھّی طرح یاد ہے کہ اس وقت آغا تین درویش صورت بزرگوں کے حلقے میں مہابلی اکبر کے دَور کی خوبیاں اور برکتیں نہایت وارفتگی سے بیان کر رہے تھے۔ گویا سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے ہیں۔ ابوالفضل کے قتل تک پہنچے تو ایسی ہچکی بندھی کہ معلوم ہوتا تھا کہ انہیں اس واردات کی اطلاع ابھی ابھی ملی ہے۔ اس حرکت پر وہ شیخو کو ڈانٹ ڈپٹ کر ہی رہے تھے کہ اتنے میں پہلا درویش بول اُٹھا: اماں چھوڑو

بھی، بھلا وہ بھی کوئی زمانہ تھا۔ جب لوگ چار گھنٹے فی میل کی رفتار سے سفر کرتے تھے اور رؤسا تک جمعہ کے جمعہ نہاتے تھے۔'' اس کا مُنہ آغا نے یہ کہہ کر بند کر دیا کہ حضرت اس سُنہری زمانے میں ایسی سڑی گرمی کہاں پڑتی تھی۔

یہ نوک جھونک چل رہی تھی کہ پہلا درویش پھر گمبھیر لہجے میں بولا'' قاعدہ ہے کہ کوئی دَور اپنے آپ سے مطمئن نہیں ہوتا۔ آج آپ اکبر اعظم کے دَور کو یاد کر کے روتے ہیں لیکن مجھے یقین ہے کہ اگر آپ اکبر کے عہد میں پیدا ہوتے تو علاء الدین خلجی کو یاد کر کے آبدیدہ ہوتے۔ اپنے عہد سے غیر مطمئن ہونا بجائے خود ترقی کی نشانی ہے۔''

'' سچ تو یہ ہے کہ حکومتوں کے علاوہ کوئی بھی اپنی موجودہ ترقی سے مطمئن نہیں ہوتا'' چگی داڑھی والے درویش نے کہا:

مَیں نے پہلے درویش کو سہارا دیا،'' آپ بجا فرماتے ہیں۔ اسی بات کو ہم یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ اگر کوئی باپ اپنے بیٹے سے سَو فی صد مطمئن ہے تو سمجھ لیجیے کہ یہ گھرانا رُو بہ زوال ہے۔ برخلاف اس کے اگر کوئی بیٹا اپنے باپ کو دوستوں سے ملانے میں شرمانے لگے تو یہ علامت ہے اس بات کی کہ خاندان آگے بڑھ رہا ہے۔''

'' مگر اس کو کیا کیجیے کہ آج کل کے نوجوان مطلب کی خاطر باپ کو بھی باپ ہی مان لیتے ہیں! کیا سمجھے؟'' آغا نے کہا۔

سب کو بڑا تعجب ہوا کہ آغا پہلی مُلاقات میں مجھ سے بے تکلّف ہو گئے...... اتنے کہ دوسری صحبت میں انہوں نے مجھے نہ صرف اپنا پہلونٹی کا شعر بڑے لحن سے سُنایا بلکہ مجھ سے اپنے وہ اداریے بھی پڑھوا کر سُنے جو سترہ اٹھارہ سال پہلے انہوں نے اپنے ماہ نامے'' سرودِ رفتہ'' میں پُرانی نسل کے بارے میں مندرجہ ذیل نوٹ کے ساتھ شائع کیے تھے:

'' قارئین کا ایڈیٹر کی رائے سے متفق ہونا ضروری نہیں۔''

یہ ربط ضبط دن بدن بڑھتا گیا۔ مَیں اس تقریبِ خاص پر نازاں تھا گو کہ حاسدوں کو...... اور خود مجھے بھی...... اپنی سیرت میں بظاہر کوئی ایسی بات نظر نہیں آتی جو آغا کی پسندیدگی کا باعث ہو۔ آخر ایک روز انہوں نے خود یہ عقدہ حل کر دیا۔ فرمایا تمہاری صورت عین میں ہمارے ایک ماموں سے ملتی ہے جو میٹرک کا نتیجہ نکلتے ہی ایسے رُوپوش ہوئے کہ آج تک مفقود الخبر ہیں۔

انگریزوں کا وطیرہ ہے کہ وہ کسی عمارت کو اس وقت تک خاطر میں نہیں لاتے، جب تک وہ کھنڈر نہ ہو جائے۔ اسی طرح ہمارے ہاں بعض محتاط حضرات کسی کے حق میں کلمۂ خیر کہنا روا نہیں سمجھتے تاوقتے کہ ممدوح کا چہلم نہ ہو جائے۔ آغا کو بھی ماضی بعید سے خواہ اپنا ہو یا پرایا، والہانہ وابستگی تھی۔ جس کا ایک ثبوت ان کی ۱۹۲۷ء ماڈل کی فورڈ کار تھی جو انہوں نے ۱۹۵۵ء میں ایک ضعیف العمر پارسی سے تقریباً مفت لی تھی۔ اس کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ چلتی بھی تھی اور اس میانہ رَوی کے ساتھ کہ محلّے کے لونڈے ٹھلولے جب اور جہاں چاہتے چلتی گاڑی میں کود کر بیٹھ جاتے۔ آغا نے کبھی تعرض نہیں کیا۔ کیوں کہ اگلے چوراہے پر جب یہ دھکڑ دھکڑ کر کے دَم توڑ دیتی تو یہی سواریاں دھکّے لگا لگا کر منزلِ مقصود تک پہنچا آتیں۔ اس صورت میں پٹرول کی بچت تو خیر تھی ہی لیکن بڑا فائدہ یہ تھا کہ انجن بند ہو جانے کے سبب کار زیادہ تیز چلتی تھی۔ واقعی اس کار کا چلنا اور چلانا معجزۂ فن سے کم نہ تھا اس لیے کہ اس میں پٹرول سے زیادہ خون جلتا تھا۔ آغا دل ہی دل میں کڑھتے اور اپنے مصنوعی دانت پیس کر رہ جاتے لیکن کوئی یہ کار ہدیتہً لینے کے لیے بھی رضامند نہ ہوتا۔ کئی مرتبہ تو ایسا ہوا کہ تنگ آ کر آغا کار کو شہر سے دُور کسی پیپل کے نیچے کھڑا کر کے راتوں رات بھاگ آئے لیکن ہر مرتبہ پولیس نے کار سرکاری خرچ پر ٹھیل ٹھال کر آغا کے گھر بحفاظتِ تمام پہنچا دی۔

غرض یہ کہ اس کار کو علاحدہ کرنا اتنا ہی دُشوار نکلا جتنا اس کو رکھنا۔ پھر یہ بات بھی تھی کہ اس سے بہت سے تاریخی حادثوں کی یادیں وابستہ تھیں جن میں آغا بے عزتی کے ساتھ بری ہوئے تھے۔ انجام کار ایک سہانی صبح فورڈ کمپنی والوں نے اُن کو پیغام بھیجا کہ یہ کار ہمیں لوٹا دو۔ ہم اس کو پبلسٹی کے لیے اپنے قدیم ماڈلوں کے میوزیم میں رکھیں گے اور اس کے بدلے سالِ رواں کے ماڈل کی بڑی کار تمہیں پیش کریں گے۔ شہر کے ہر کافی ہاؤس میں آغا کی خوش نصیبی اور کمپنی کی فیّاضی کے چرچے ہونے لگے اور یہ چرچے اس وقت ختم ہوئے جب آغا نے اس پیش کش کو حقارت کے ساتھ مسترد کر دیا۔

کہنے لگے، ''دولوں گا۔''

کمپنی خاموش ہوگئی اور آغا مدّتوں اس کے مقامی کارندوں کی نااہلی اور ناعاقبت اندیشی پر افسوس کرتے رہے۔ کہتے تھے، ''لالچی کہیں کے! پانچ سال بعد تین دینی پڑیں گی! دیکھ لینا!''

وہ خلوصِ نیت سے اس دَور کو کلجگ کہتے اور سمجھتے تھے۔ جہاں کوئی نئی چیز، کوئی نئی صورت نظر پڑی اور انہوں نے کچکچا کے آنکھیں بند کیں اور یادرفتگاں کے اتھاہ سمندر میں غڑاپ سے غوطہ لگایا اور کبھی ایسا نہیں ہُوا کہ کندھے پر ایک آدھ لاش لادے برآمد نہ ہوئے ہوں۔ کہیں کوئی بات بارِ خاطر ہوئی اور انہوں نے ''یادش بخیر'' کہہ کر بیتے سمے اور بچھڑی ہوئی صورتوں کی تصویر کھینچ کے رکھ دی۔ ذرا کوئی امریکی طور طریق یا وضع قطع ناگوار گزری اور انہوں نے کولمبس کو گالیاں دینی شروع کیں۔ وہ فی الواقع محسوس کرتے تھے کہ ان کے لڑکپن میں گنّے زیادہ میٹھے اور ملائم ہوا کرتے تھے۔ میرے سامنے بارہا اتنی سی بات منوانے کے لیے مرنے مارنے پر تُل گئے کہ اُن کے بچپنے میں چنے ہرگز اتنے سخت نہیں ہوتے تھے۔ کہتے تھے آپ نہ مانیں یہ اور بات ہے مگر یہ ٹھوس حقیقت ہے کہ گزشتہ پندرہ بیس سال میں قطب مینار کی سیڑھیاں گھسنے کے بجائے اور زیادہ اونچی ہوگئی ہیں اور اس کے ثبوت میں اپنے حالیہ سفر دہلی کا تجربہ ہانپ ہانپ کر بیان کرتے۔ چوں کہ ہم میں سے کسی کے پاس پاسپورٹ تک نہ تھا اس لیے اس منزل پر بحث کا پلّہ ہمیشہ ان کے حق میں جھک جاتا۔

قدیم نصابِ تعلیم کے وہ بے حد معترف و مدّاح تھے، اکثر کہتے کہ ہمارے بچپن میں کتابیں اتنی آسان ہوتی تھیں کہ بچّے تو بچّے، ان کے والدین بھی سمجھ سکتے تھے۔ اسی رَو میں اپنی یونیورسٹی کا ذکر بڑی للک سے کرتے اور کہتے کہ ہمارے وقتوں میں ممتحن اتنے لائق ہوتے تھے کہ کوئی لڑکا فیل نہیں ہوسکتا تھا۔ قسمیں کھا کھا کر ہمیں یقین دلاتے کہ ہماری یونیورسٹی میں فیل ہونے کے لیے غیر معمولی قابلیت درکار تھی۔ جس شہر میں یہ یونیورسٹی واقع تھی اسے وہ عرصے سے اُجڑا دیار کہنے کے عادی تھے۔ ایک دن مَیں نے آڑے ہاتھوں لیا۔ ''آغا! خدا سے ڈرو! وہ شہر تمہیں اُجاڑ دکھائی دیتا ہے؟ حالاں کہ وہاں کی آبادی پانچ ہزار سے بڑھ کر ساڑھے تین لاکھ ہوگئی ہے؟''

''مُسلمان ہو؟''

''ہوں تو۔''

دوزخ پر ایمان ہے؟''

''ہے۔''

وہاں کی آبادی بھی تو روز بروز بڑھتی جارہی ہے! کیا سمجھے؟''

اختؔر شیرانی کی ایک مشہور نظم ہے جس میں انہوں نے یارانِ وطن کی خیر و عافیت پوچھنے کے بعد، دیس سے آنے والے کی خاصی خبر لی ہے۔اس بھولے بھالے سوال نامے کے تیور صاف کہہ رہے ہیں کہ شاعر کو یقینِ واثق ہے کہ اس کے پردیس سدھارتے ہی نہ صرف دیس کی ریت رسم بلکہ موسم بھی بدل گیا ہوگا اور ندی نالے اور تالاب سب ایک ایک کر کے سوکھ گئے ہوں گے۔آغا کو اپنے آبائی گاؤں چاکسو (خورد) سے بھی کچھ اسی نوع کی توقعات وابستہ تھیں۔

چاکسو (خورد) دراصل ایک قدیم گاؤں تھا جو چاکسو (کلاں) سے چھوٹا تھا۔ یہاں لوگ اب تک ہوائی جہاز کو چیل گاڑی کے نام سے یاد کرتے تھے۔لیکن آغا اپنے لعابِ دہن سے اس کے گرداگرد یادوں کا ریشمی جالا بنتے رہے۔ یہاں تک کہ اس نے ایک تہ دار کوئے کی شکل اختیار کر لی جسے چیر کر (آغا کا تو کیا ذکر) جمیع باشندگانِ چاکسو باہر نہیں نکل سکتے تھے۔ادھر چند دنوں سے وہ ان تنگ و تاریک گلیوں کو یاد کر کے زار و قطار رُو رہے تھے، جہاں بقول ان کے جوانی کھوئی تھی۔حالاں کہ ہم سب کو ان کی سوانح عمری میں سوانح کم اور عمر زیادہ نظر آتی تھی لیکن جب ان کے ''یادش بخیریا'' نے شدّت اختیار کی تو دوستوں میں یہ صلاح ٹھیری کہ اُن کو دو تین مہینے کے لیے اُسی گاؤں میں بھیج دیا جائے جس کی زمین ان کو حافظے کی خرابی کے سبب چہارم آسمان دکھائی دیتی ہے۔

چناں چہ گزشتہ مارچ میں آغا ایک مدّتِ مدید (تیس سال) کے بعد اپنے گاؤں گئے لیکن وہاں سے لوٹے تو کافی آزردہ تھے۔ انہیں اس بات سے رنج پہنچا کہ جہاں پہلے ایک جوہڑ تھا جس میں دن بھر بھینسیں اور اُن کے مالکوں کے بچّے پڑے رہتے تھے، وہاں اب ایک پرائمری اسکول کھڑا تھا۔اس میں انہیں صریحاً چاکسو کلاں والوں کی شرارت معلوم ہوتی تھی۔ جوں توں ایک دن وہاں گزارا اور پہلی ٹرین سے اپنی پُرانی یونیورسٹی پہنچے مگر وہاں سے بھی شاموں شام واپس آئے۔ بے حد مغموم و گرفتہ دل۔انہیں یہ دیکھ کر بڑی مایوسی ہوئی کہ یونیورسٹی اب تک چل رہی ہے ان جیسے حساس آدمی کے لیے یہ بڑے دُکھ اور اچنبھے کی بات تھی کہ وہاں مارچ میں اب بھی پھول کھلتے ہیں اور گلاب سُرخ اور سبزہ ہرا ہوتا ہے۔دراصل ایک مثالی ''اولڈ بوائے'' کی طرح وہ اس وقت تک اس صحت مند غلط فہمی میں مبتلا تھے کہ ساری چونچال اور تمام خوش دلی اور خوش باشی ان کی نسل پر ختم ہوگئی۔

آغا کی عمر کا بھید نہیں کھُلا،لیکن جن دنوں میرا تعارف ہُوا وہ عمر کی اس کٹھن گھاٹی سے گزر رہے تھے جب جوان ان کو بوڑھا جان کر کتراتے اور بوڑھے کل کا لونڈا سمجھ کر مُنہ نہیں لگاتے تھے۔جن حضرات کو آغا اپنا ہم عمر بتاتے رہے، اُن میں سے اکثر اُن کو مُنہ در مُنہ چچا کہتے تھے۔خیر، اُن کی عمر کچھ بھی ہو، مگر میرا خیال ہے کہ وہ اُن لوگوں میں سے تھے جو کبھی جوان نہیں ہوتے۔

اُن کی شادی کے بارے میں اتنی ہی روایتیں تھیں جتنے اُن کے دوست! بعضوں کا کہنا تھا کہ بی.اے کے نتیجے سے اس قدر بددل ہوئے کہ خودکشی کی ٹھان لی۔ بوڑھے والدین نے سمجھایا کہ بیٹا خودکشی نہ کرو، شادی کرلو۔چنانچہ شادی ہوگئی مگر ابھی سہرے کے پھول بھی پوری طرح نہ مُرجھائے ہوں گے کہ یہ فکر لاحق ہوگئی کہ بچپن انہیں ''اسیرِ پنجۂ عہدِ شباب'' کر کے کہاں چلا گیا اور اپنی آزادی کے ایّام کو بے طرح یاد کرنے لگے۔حتیٰ کہ اس نیک بخت کو بھی رحم آ گیا اور وہ ہمیشہ کے لیے میکے چلی گئی۔

اس سے مہر بخشوانے کے ٹھیک پندرہ سال بعد ایک مسن خاتون کو محض اس بنا پر حبالۂ نکاح میں لائے کہ پینتیس سال اور تین شوہر قبل موصوفہ نے چاکسو میں اُن کے ساتھ اَماوس کی رات میں آنکھ مچولی کھیلتے وقت چٹکی لی تھی جس کا نیل اُن کے حافظے میں جوں کا توں محفوظ تھا

لیکن آغا اپنی عادت سے مجبور تھے۔اس کے سامنے پہلی بیوی کی اُٹھتے بیٹھتے اس قدر تعریف کی کہ اُس نے بہت جلد طلاق لے لی۔اتنی جلد کہ ایک دن اُنگلیوں پر حساب لگایا تو بچاری کی ازدواجی زندگی، عدّت کی معیاد سے بھی مختصر نکلی! آغا ہر سال نہایت پابندی اور دھوم دھام سے دونوں طلاقوں کی سال گرہ منایا کرتے تھے۔پہلی طلاق کی سلور جوبلی میں راقم الحروف کو بھی شرکت کا اتفاق ہوا۔

دوسری خانہ بربادی کے بعد شادی نہیں کی۔اگرچہ نظر میں آخری دَم تک سہرے کے پھول کھلتے اور مہکتے رہے۔

گو آغا تمام عمر ''رہینِ ستم ہائے روزگار'' رہے،لیکن چاکسو کی یاد سے ایک لحظہ غافل نہیں رہے۔ چناں چہ اُن کی میّت آخری وصیت کے مطابق سات سو میل دور چاکسو (خورد) لے جائی گئی اور چاکسو کلاں کی جانب پاؤں کر کے اُسے قبر میں اُتارا گیا۔

لاریب وہ جنّتی تھے،کیوں کہ وہ کسی کے بُرے میں نہیں تھے۔انہوں نے اپنی ذات کے علاوہ کبھی کسی کو گزند نہیں پہنچایا۔اُن کے جنّتی ہونے میں یوں بھی شبہ نہیں کہ جنت واحد ایسی جگہ ہے جس کا حال اور مستقبل اُس کے ماضی سے بہتر نہیں ہوسکتا۔

لیکن نہ جانے کیوں میرا دل گواہی دیتا ہے کہ وہ جنت میں بھی خوش نہیں ہوں گے اور یادش بخیر کہہ کر جنّتیوں کو اسی جہان گزراں کی داستان پاستان سُنا سُنا کر للچاتے ہوں گے جسے جیتے جی وہ دوزخ سمجھتے رہے۔

12.09 یادش بخیریا (اقتباس) کا تجزیہ

''یادش بخیریا'' مشتاق احمد یوسفی کا ایک اہم انشائیہ ہے۔اس انشائیہ کو اُردو کے طنزیہ ومزاحیہ انشائیوں میں بھی نمایاں مقام حاصل ہے۔دراصل یہ انشائیہ طنز ومزاح سے زیادہ نفسیاتی نوعیت کا ہے۔اس انشائیہ کا اہم کردار آغا تلمیذ الرحمٰن چاکسوی اُن افراد کی نمائندگی کررہا ہے جو ناسٹلجیا (Nostalgia) یعنی ماضی تمنّائی کی یادوں میں مبتلا رہتے ہیں۔وہ دَورِ جدید کی ترقّی کو روایتوں اور اقدار کے لئے مہلک اور نقصان دہ تصوّر کرتے ہیں۔یہاں تک کہ مفید اور سودمند ایجادات کو بھی حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔پیش ہیں اس انشائیہ کی یہ سطور:

> ''وہ خلوصِ نیت سے اس دَور کو کلجگ کہتے اور سمجھتے تھے۔جہاں کوئی نئی چیز،کوئی نئی صورت نظر پڑی اور انہوں نے کچکچا کے آنکھیں بند کیں اور یادرفتگاں کے اُتھاہ سمندر میں غڑاپ سے غوطہ لگایا اور کبھی ایسا نہیں ہُوا کہ کندھے پر ایک آدھ لاش لادے برآمد نہ ہوئے ہوں۔''

درج بالا جملوں سے واضح ہے کہ مشتاق احمد یوسفی نے اس انشائیہ کے ذریعے اُن ماضی پرستوں کی نفسیات کی عکّاسی کی ہے جو ماضی کی یادوں سے اس قدر روابستہ ہوجاتے ہیں کہ ماضی پرستی اُن کی زندگی کا جزو لاینفک بن کررہ جاتی ہے۔اسی لئے وہ ماضی کی سنہری یادوں میں اس قدر گُم ہوجاتے ہیں کہ اُس سے باہر نکلنے کے لئے کبھی سوچتے بھی نہیں۔اس انشائیہ کا یہ درج ذیل جملہ انشائیہ نگار کے فکری رجحان کا بھرپور غماز ہے:

> ''دراصل ایک مثالی ''اولڈ بوائے'' کی طرح وہ اس وقت تک اس صحت مند غلط فہمی میں مبتلا تھے کہ ساری چونچال اور تمام خوش دلی اور خوش باشی ان کی نسل پر ختم ہوگئی۔''

انشائیہ نگار کے نزدیک یادش بخیریا یعنی ناسٹلجیا (Nostalgia) کے تنگ حصار میں محصور افراد صحت مند معاشرہ اور شخصیت کی بہتر نشوونما میں نہ صرف حارج ہوتے ہیں بلکہ ترقّی پذیر معاشرے پر منفی اثرات بھی ڈالتے ہیں۔درج ذیل اقتباسات مشتاق احمد یوسفی کے انہیں نظریات وخیالات کے آئینہ دار ہیں:

''بچپن انہیں ''اسیرِ پنجۂ عہدِ شباب'' کر کے کہاں چلا گیا اور اپنی آزادی کے ایام کو بے طرح یاد کرنے لگے۔''

''گو آغا تمام عمر ''رہینِ ستم ہائے روزگار'' رہے، لیکن چاکسو کی یاد سے ایک لحظہ غافل نہیں رہے۔''

''آغا جدید شاعری سے اس حد تک بیزار ہیں کہ نئے شاعروں کو ریڈیو سیٹ پر بھی ہوٹ کرنے سے باز نہیں آتے''

''ماضی سے لگاؤ ضعف پیدا کرتا ہے۔''

''بیتی ہوئی گھڑیوں کی آرزو کرنا ایسا ہی ہے جیسے ٹوتھ پیسٹ کو واپس ٹیوب میں لگانا۔''

''جتنا وقت اور روپیہ بچوں کو مسلمانوں کے سائنس پر احسانات رٹانے میں صرف کیا جاتا ہے اُس کا دسواں حصّہ بھی بچّوں کو سائنس پڑھانے میں صرف کیا جائے تو مسلمانوں پر بڑا احسان ہوگا۔ غور کیجیے تو امریکہ کی ترقّی کا سبب یہی ہے کہ اُس کا کوئی ماضی نہیں ہے۔ قدیم داستانوں میں بار بار ایسے آسیبی صحرا کا ذکر آتا ہے جہاں آدمی پیچھے مُڑ کر دیکھ لے تو پتھّر کا ہو جائے۔ یہ صحرا ہمارے اپنے پن کے اندر باہر ہیں۔''

آغا تلمیذ الرحمٰن چاکسوی کی پرانی اور بے کار کار اُن کی اس ذہنیت کی علامت ہے کہ وہ حد درجہ ماضی پرست ہیں۔ اُنہیں جب خوش قسمتی سے اس کار سے نجات حاصل ہونے کا بہترین موقع ملا تو بھی اُنہوں نے اُسے ٹھکرا دیا۔ اسی طرح بے مصرف گراموفون، موروثی مسہری، ربع صدی یعنی پچّیس سال پرانی اپنی تصویر، دادا جان کے زمانہ کی کاواک گھڑی، لنگڑا یعنی ٹوٹا ہوا اسٹول اور اسی طرح کی پرانی بھاری بھرکم چیزیں اُن کی ماضی پرستی کی نفسیات کو واضح کرنے کے لئے کافی ہیں۔

مشتاق احمد یوسفی نے ترقی کی راہ پر گام زَن ہونے کے بجائے ماضی کی یادوں اور بے مصرف اشیا سے چمٹ کر پس ماندہ زندگی کو ترجیح دینے والوں کا نہ صرف مذاق اُڑایا ہے بلکہ اپنے مخصوص لہجے میں بھرپور طنز بھی کیا ہے۔ آغا تلمیذ الرحمٰن چاکسوی کے درج ذیل یہ محسوسات کہ:

''ان کے لڑکپن میں گنّے زیادہ میٹھے اور ملائم ہُوا کرتے تھے۔''

''اُن کے بچپنے میں چنے ہرگز اتنے سخت نہیں ہوتے تھے۔''

''گزشتہ پندرہ بیس سال میں قطب مینار کی سیڑھیاں گھسنے کے بجائے اور زیادہ اونچی ہو گئی ہیں۔''

''ہمارے بچپن میں کتابیں اتنی آسان ہوتی تھیں کہ بچّے تو بچّے، ان کے والدین بھی سمجھ سکتے تھے۔''

آغا تلمیذ الرحمٰن چاکسوی ہی کی طرح معاشرے کا ماضی پرست طبقہ صرف ماضی ہی کی یادوں میں گُم ہے۔ وہ حال اور مستقبل سے نہ صرف بے نیاز ہے بلکہ جدید ایجادات کو معاشرے اور اعلیٰ اقدار کے لئے مہلک تصوّر کرتا ہے۔

طنزیہ اور ظریفانہ رنگ کے باوجود اس انشائیہ کے بیش تر جملے یا واقعات حقائق اور نفسیاتی کیفیات کی بھرپور وضاحت کرتے ہیں جیسے یہ اقتباس:

''اس کے سامنے پہلی بیوی کی اُٹھتے بیٹھتے اس قدر تعریف کی کہ اُس نے بہت جلد طلاق لے لی۔ اتنی جلد کہ ایک دن اُنگلیوں پر حساب لگایا تو بچاری کی از دواجی زندگی، عدّت کی معیاد سے بھی مختصر نکلی!''

ناسٹلجیا (Nostalgia) یعنی ماضی تمنائی مشتاق احمد یوسفی کا پسندیدہ موضوع ہے۔ انہوں نے اس موضوع سے متعلّق اپنے اس پہلے انشائیہ ''یادش بخیریا'' میں اپنے اس نظریہ کو واضح کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے کہ معاشرہ اور افراد کی صحت مند نشوونما کے لئے ماضی تمنائی نہایت مضر اور مہلک ہے۔

12.10 خلاصہ

مشتاق احمد یوسفی ایک منفرد طنز و مزاح نگار اور انشائیہ نگار ہیں۔ اُنہوں نے طنز و مزاح کو نئے لب و لہجے سے آشنا کیا ہے اور نئی معنویت بھی عطا کی ہے۔ اُن کی تصانیف کے نام چراغ تلے، خاکم بدہن، زرگزشت اور آبِ گُم ہیں۔ پہلی دو تصانیف چراغ تلے اور خاکم بدہن انشائیوں کے مجموعے ہیں۔ تیسری کتاب زرگزشت اُن کی سوانح عمری یا بینکنگ کیریر کی پُر لطف کہانی ہے۔ چوتھی تصنیف آبِ گُم ناول کی ہیئت میں کہانی نما خاکوں کا مجموعہ ہے۔ بہ اعتبارِ موضوع اُن کی تصانیف میں تنوّع ہے مگر ناسٹلجیا یعنی ماضی تمنّائی اُن کا پسندیدہ موضوع ہے۔ یادش بخیریہ کا کردار آغا تلمیذ الرحمٰن چاکسوی، آبِ گُم کے بیش تر کردار اور متعدد انشائیوں کے مختلف کردار بھی ناسٹلجیا کے مرض میں مبتلا نظر آتے ہیں۔ یہ کردار اپنی انا اور ماضی تمنائی کے اس قدر دل دَادہ ہیں کہ دَورِ جدید کی مفید ایجادات کو بھی حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ اُن کے بیش تر انشائیے اور فن پارے ماضی پرستوں کی نفسیات کے آئینہ دار ہیں۔

مشتاق احمد یوسفی نے اپنے ہم عصر ادیبوں کی لغزشوں کی طرف بھی اشارے کیے ہیں اور سیاسی موضوعات پر بھی خامہ فرسائی کی ہے۔ اُنہوں نے بڑی چابک دستی سے سیاسی رہنماؤں کی بددیانتی کو بے نقاب کیا ہے۔ جنسیات سے متعلّق اُن کی تحریریں فحاشی، سوقیانہ پن اور ابتذال سے پاک ضرور ہیں مگر ان میں کسی قدر عریانیت اور تلذّذ کو بھی محسوس کیا جا سکتا ہے۔ مذہب سے متعلّق اُن کی نگارشات میں دل آزاری کے بجائے مضحکہ خیزی کے پہلو نظر آتے ہیں۔ اُنہیں اپنے تہذیبی اور ثقافتی ورثے سے بھی لگاؤ ہے۔ اسی لئے انہوں نے اس کی خوبیوں اور خامیوں کو بڑی خوبی سے پیش کیا ہے۔ وہ زندگی کو کسی خاص نظریے سے دیکھنے کے قائل نہیں ہیں۔ شاید اسی لئے انہوں نے زندگی کی مثبت قدروں، منفی اثرات اور تضادات کی بھرپور عکّاسی کی ہے۔ دراصل مشتاق احمد یوسفی نے موضوعات کے تنوّع اور اپنے منفرد اُسلوب کے ذریعہ اپنی نگارشات کو مختلف الجہات بنا دیا ہے۔

12.11 فرہنگ

آبدیدہ ہونا	: آنکھوں میں آنسو بھر لانا، غمگین ہونا	طلاق لے لینا	: عورت کا خاوند سے آزادی حاصل کر لینا، اپنے خاوند کے نکاح میں نہ رہنا
آتش دان	: انگیٹھی۔ وہ برتن جس میں آگ جلائی جاتی ہے		
آڑے ہاتھوں لینا	: لتاڑنا، بُرا بھلا کہنا، قائل و معقول کرنا	عدّت کی میعاد	: وہ مدّتِ شرعی جس میں عورت دوسرا نکاح نہ کر سکے
آویزاں ہونا	: ٹنگا ہونا، لٹکا ہونا		

ابوالفضل : مغل شہنشاہ محمد جلال الدین اکبر کے ایک وزیر کا نام۔
اُٹھتے بیٹھتے : ہر وقت، جب جی چاہے۔
اُڑا رکھنا : افواہ پھیلا دینا، مشہور کر دینا۔
الوداعی : رُخصتی۔
اولڈ بوائے : سابق طالبِ علم
بارِ خاطر ہونا : ناگوار ہونا، بُرا لگنا
بالانشینی : اونچائی، بلندی
بیٹھے بٹھائے : خواہ مخواہ، بے وجہ، اچانک
پارک کرنا : کھڑا کرنا، استادہ کرنا
پہلونٹی : پہلا، ابتدائی، شروع کا
توجیہہ کرنا : دلیل دینا، وجہ بیان کرنا
جوہڑ : تالاب، بارانی تالاب، وہ نشیب جس میں بارش کا پانی جمع ہو جائے
جیتے جی : عمر بھر، تاحیات، تمام عمر، جب تک جئے
چُگّی داڑھی : ایسی داڑھی جس میں چند بال ہی ٹھوڑی کے نیچے ہوتے ہیں
چونچال : ہوشیاری، چالاکی، مستعدی
چیڑ : ایک قِسم کا اونچا جنگلی درخت جو دیودار کے درخت سے مشابہ ہوتا ہے
حنوط کرنا : ایک قِسم کی خوشبودار چیزوں کے مرکّب کو جسم پر لگانا
خاطر میں نہ لانا : پرواہ نہ کرنا، توجّہ نہ دینا
خانہ بربادی : گھر کی تباہی
خبر لینا : لتاڑنا، ملامت کرنا، پریشان کرنا
خودکشی : اپنے آپ کو ہلاک کرنا
خوش دلی : شادمانی، شادکامی، خوش حالی

فارمولا : (Formula) مقرّرہ قاعدہ
کترانا : بیگانگی اختیار کرنا، کنارا کرنا
کسرِ شان : خلافِ شان، وہ بات جس سے کسی کی عزّت یا آبرو میں فرق آ جائے
کم آمیزی : تخفیف، کمی، کسر، گھٹاؤ
گاؤن : (Gown) مغربی وضع کا لمبا چغہ جسے جلسۂ تقسیم اسناد میں سند یافتہ کو پہنایا جاتا ہے۔ اسے پادری بھی پہنتے ہیں
گراموفون : (Gramophone) ایک قِسم کا آلہ جس کے ریکارڈ سے آواز نکلتی ہے۔
گرفتہ دل : ناخوش، رنجیدہ، دل برداشتہ۔
گروپ فوٹو : (Group Photo) ایسا فوٹو جس میں کئی لوگ ایک ساتھ ہوں۔
گمبھیر : سنجیدہ
گمراہ کُن : گمراہ کرنے والا، بھٹکانے والا
گئی گزری : گذشتہ، پُرانی، گزری ہوئی، بھولی ہوئی
لاریب : بے شبہ، یقیناً، بیشک
لونڈے ٹھلوے : لونڈے لپاڑیئے، ٹھلوے باز لڑکے، چھچھورے اور شرارتی لڑکے
ماڈرن : (Modern) جدید
مرنے مارنے پر : مرنے یا مارنے کے لیے آمادہ ہو جانا،
تُل جانا : برسرِ پیکار ہونا
مفقود الخبر : وہ شخص جس کی کچھ خبر نہ ہو، لاپتہ
ممتحِن : امتحان لینے والا
مَمی خانہ : وہ جگہ جہاں مسالہ لگی ہوئی لاش کو رکھا جاتا ہے (مسالا لگانے سے لاش بہت دنوں تک محفوظ رہتی ہے)

داستانِ پاستان	: قدیم قصہ، پُرانی کہانی، گزرا ہُوا پُرانا واقعہ	منہ در منہ	: روبرو، آمنے سامنے
دم توڑ دینا	: مرجانا، فوت ہوجانا	منہ لگانا	: عزّت دینا، توجّہ دینا، مہربانی سے پیش آنا
دیرپا ہونا	: مضبوط ہونا، پائیدار رہنا، جو بہت دن تک قائم رہے	منہ نہ لگانا	: خاطر میں نہ لانا، عزّت نہ کرنا، بے توجہی برتنا
		مہابلی اکبر	: اکبرِ اعظم، مغل بادشاہ محمد جلال الدین کا لقب
ڈرا رکھنا	: خوف زدہ کردینا، ڈر میں مبتلا کردینا	مہر بخشوانا	: مہر معاف کرانا، حقِ زوجیت معاف کرانا
روپوش ہونا	: پوشیدہ ہونا، چھپ جانا، غائب رہنا	نتیجہ پر پہنچنا	: انجام تک پہنچنا
ریکارڈ	: (Record)، گراموفون کی پلیٹ جو توے کی طرح گول ہوتی ہے	نکاح میں لانا	: عقد میں لانا، کسی کے ساتھ شادی یا بیاہ کرنا، بیاہ کرنا
سپاس نامہ	: اظہارِ شکر کی تحریر	نوک جھونک	: تکرار، بحث
سِلور جُبلی	: پچیّس سالہ جشن، وہ تقریب جس کا انعقاد پچیسویں سال میں کیا جائے	ہچکی بندھنا	: ہچکیاں لگ جانا، زیادہ رونے سے سانس رُکنے کی کیفیت طاری ہونا
شیخو	: مغل بادشاہ اکبر کے بیٹے سلیم کو ''شیخو'' کہا جاتا تھا	ہوٹ کرنا	: مضحکہ اُڑانا، مذاق اُڑانا
طاقچہ	: چھوٹا طاق، چھوٹا آلا	یادش بخیر	: دُعائیہ کلمہ، اس کی یاد خیر کے ساتھ، اس کی خیر ہو

12.12 نمونہ امتحانی سوالات

الف: درجِ ذیل سوالوں کے جوابات ۱۰/۱۰ سطروں میں دیجیے:

سوال نمبر۱ طنزومزاح کے فرق کی وضاحت کیجیے۔

سوال نمبر۲ ''یادش بخیریا'' کا مرکزی خیال کیا ہے؟ مختصراً بیان کیجیے۔

سوال نمبر۳ مشتاق احمد یوسفی منفرد طنزومزاح نگار ہیں۔اظہارِ خیال کیجیے۔

سوال نمبر۴ ''خاکم بدہن'' کے اہم کرداروں کے افعال وکردار پر روشنی ڈالیے۔

سوال نمبر۵ ناسٹلجیا یعنی ماضی تمنّائی کسے کہتے ہیں؟ مختصراً بیان کیجیے۔

سوال نمبر۶ ''چراغ تلے'' میں شامل انشائیوں کے نام اور اُس کے مقدّمہ کا عنوان تحریر کیجیے۔

سوال نمبر۷ مشتاق احمد یوسفی کے اسلوب کی کسی خصوصیت پر روشنی ڈالیے۔

سوال نمبر۸ مشتاق احمد یوسفی کے انشائیوں میں تنوع ہے۔مختصراً بیان کیجیے۔

سوال نمبر۹ ''زرگزشت'' کے عنوانات کی نشان دہی کیجیے۔

سوال نمبر۱۰ ''آبِ گُم'' کا مختصر تعارف اپنے الفاظ میں پیش کیجیے۔

ب: درج ذیل سوالوں کے جوابات ۳۰/۳۰ سطروں میں دیجیے:

سوال نمبر ۱ مشتاق احمد یوسفی کے انشائیہ ''یادش بخیریا'' کا تجزیہ کیجیے۔

سوال نمبر ۲ مشتاق احمد یوسفی کی تصانیف کا تعارف اپنے الفاظ میں پیش کیجیے۔

سوال نمبر ۳ ''زرگزشت'' موضوع اور مواد کے اعتبار سے خودنوشت سوانح سے قریب ہے۔ اظہارِ خیال کیجیے۔

سوال نمبر ۴ مشتاق احمد یوسفی کی نگارشات کی فنّی خصوصیات کا جائزہ لیجیے۔

سوال نمبر ۵ ''چراغ تلے'' میں شامل انشائیوں کا اپنے الفاظ میں تجزیہ کیجیے۔

سوال نمبر ۶ مشتاق احمد یوسفی کی نگارشات کے موضوعات پر روشنی ڈالیے۔

سوال نمبر ۷ ''خاکم بدہن'' کی خصوصیات کا جائزہ لیجیے۔

سوال نمبر ۸ آغا تلمیذ الرحمٰن چاکسوی کے کردار کی نمایاں خصوصیات کی وضاحت کیجیے۔

سوال نمبر ۹ ابواب کے اعتبار سے ''آبِ گم'' کا تجزیہ کیجیے۔

سوال نمبر ۱۰ ''یادش بخیریا'' کے مرکزی خیال ناسٹلجیا یعنی ماضی تمنّائی کے مرض کو اپنے الفاظ میں بیان کیجیے۔

معروضی سوالات

سوال نمبر ۱ : ''یادش بخیریا'' کا مرکزی خیال کیا ہے؟

(الف) انقلاب (ب) معاشرے کی زبوں حالی (ج) آزادیِ نسواں (د) ناسٹلجیا یعنی ماضی تمنّائی

سوال نمبر ۲ : آغا تلمیذ الرحمٰن چاکسوی کس انشائیہ کا کردار ہے؟

(الف) صنف لاغر (ب) یادش بخیریا (ج) چرپائی اور کلچر (د) کاغذی ہے پیرہن

سوال نمبر ۳ : مشتاق احمد یوسفی کی کس تصنیف کے مقدّمہ کا عنوان ''پہلا پتھّر'' ہے؟

(الف) چراغ تلے (ب) خاکم بدہن (ج) زرگزشت (د) آبِ گم

سوال نمبر ۴ : درج ذیل میں سے بشارت علی فاروقی کے آبائی وطن کا نام کیا ہے؟

(الف) لکھنؤ (ب) کراچی (ج) کان پور (د) رام پور

سوال نمبر ۵ : آپ کی اکائی کے مطابق مشتاق احمد یوسفی کی کتنی کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔

(الف) دو (ب) چار (ج) چھ (د) آٹھ

سوال نمبر ۶ : مشتاق احمد یوسفی کی پہلی تصنیف کا نام کیا ہے؟

(الف) آبِ گم (ب) خاکم بدہن (ج) چراغ تلے (د) زرگزشت

سوال نمبر ۷ : کس نقّاد نے ''آبِ گم'' کی صنف کے ابہام کو اُس کی صفت قرار دیا ہے؟

(الف) آلِ احمد سرور (ب) پروفیسر محمد حسن (ج) پروفیسر قمر رئیس (د) مجنوں گورکھ پوری

سوال نمبر ۸ : ''ناسٹلجیا'' سے کیا مُراد ہے؟

(الف) مستقبل (ب) ماضی تمنّائی (ج) دَورِ جدید (د) حال

سوال نمبر ۹ : مزاح کو انگریزی میں کیا کہتے ہیں؟

(الف) Satire (ب) Light Essay (ج) Nostalgia (د) Humour

سوال نمبر ۱۰ : مشتاق احمد یوسفی نے اپنی تصنیف زرِ گزشت کو کیا کہا ہے؟

(الف) سوانحِ نَوعمری (ب) سرگزشت (ج) خودنوشت (د) سوانح عمری

معروضی سوالات کے جوابات

جواب نمبر ۱ : (د) ناسٹلجیا یعنی ماضی تمنّائی	جواب نمبر ۶ : (ج) چراغ تلے
جواب نمبر ۲ : (ب) یادش بخیریا	جواب نمبر ۷ : (الف) آلِ احمد سرور
جواب نمبر ۳ : (الف) چراغ تلے	جواب نمبر ۸ : (ب) ماضی تمنّائی
جواب نمبر ۴ : (ج) کان پور	جواب نمبر ۹ : (د) Humour
جواب نمبر ۵ : (ب) چار	جواب نمبر ۱۰ : (الف) سوانحِ نَوعمری

12.13 حوالہ جاتی کتب

۱۔ مشتاق احمد یوسفی کی ادبی خدمات از ڈاکٹر محمد طاہر

۲۔ مشتاق احمد یوسفی ایک مطالعہ از ڈاکٹر مظہر احمد

۳۔ اُردو ادب میں طنز و مزاح از ڈاکٹر وزیر آغا

۴۔ اُردو ادب میں طنز و مزاح از غلام احمد کاکوروی

✵

اُتراکھنڈاوپن یونی ورسٹی، ہلدوانی (نینی تال)

SCHOOL OF HUMANITIES

UTTARAKHAND OPEN UNIVERSITY

Teenpani Bypass Road, Behind Transport Nagar
Haldwani - 263 139, Nainital (Uttrakhand)

Phone: 05946-261122, 261123 Fax No.: 05946-264232
www.uou.ac.in email: info@uou.ac.in
Toll Free No: 1800 180 4025

https://www.youtube.com/@91.2fmhellohaldwani7

اُتراکھنڈاوپن یونی ورسٹی کاعوامی ریڈیو جس کے ذریعہ طلبا کے لئے مفید پروگرام نشر کیے جاتے ہیں۔

https://www.youtube.com/@uoulive

BAUL(N)-221-1(004239)

Hello Haldwani हैलो हल्द्वानी 91.2 FM